www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میڈیا منڈی

میڈیا منڈی

اکمل شہزاد گھمن

urdukutabkhanapk.blogspot

اکمل شہزاد گھمن

نگارشات

urdukutabkhanapk.blogspot

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میڈیا منڈی

(پرنٹ میڈیا کے چند گوشے)

اکمل شہزاد گھمن

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

All rights reserved. No part of this book may be reproduced in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopying, recording or by any information storage retrieval system, without prior permission of the publisher.

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب: میڈیا منڈی
تحقیق وتصنیف: اکمل شہزاد گھمن
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ، لاہور
PH:0092-42-37322892 FAX:37354205
مطبع: حاجی منیر پرنٹر، لاہور
ایڈیٹنگ: ابدال احمد جعفری
ٹائٹل: ظفر اقبال(N.C.A)
پروف ریڈنگ: پروفیسر خالد ہمایوں، اصغر زیدی
کمپوزنگ: ندیم احمد
سال اشاعت: 2015ء
قیمت: 700 روپے

{یہ تحقیق وتصنیف مصنف کی ذاتی رائے/تحقیق پر مبنی ہے۔پبلشر کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں}

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روشن ضمیر اور با کردار

صحافیوں کے نام

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فہرست

- میڈیا منڈی ایک جائزہ — ڈاکٹر حسن عسکری 8
- میرا تاثر — وسعت اللہ خان 10
- پیش لفظ — ڈاکٹر مبارک علی 11
- ابتدائیہ — اکمل شہزاد گھمن 13

- پہلا پڑاؤ (نوائے وقت) 19
  - عارف نظامی 31
  - مجید نظامی 52

- پاکستان میں پاکستان 86
  - سردار خاں نیازی 91
  - مجیب الرحمن شامی 109
  - دوسری نشست 132

- ایکسپریس کی بات 156
  - عباس اطہر 160

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ خبریں کی خبر 190

ضیا شاہد 192

○ کالم نگار اور کالم نگاری 221

نذیر ناجی 261

حسن نثار 272

○ اردو اور انگریزی صحافت کے امتیازی پہلو 297

ڈان (Dawn) 301

قصہ 'پاکستان ٹائمز' کا 308

دی نیوز انٹرنیشنل (The News International) 318

دی نیشن (The Nation) 319

ڈیلی ٹائمز (Daily Times) 320

پاکستان ٹوڈے (Pakistan Today) 320

دی ایکسپریس ٹریبیون (The Express Tribune) 321

بزنس ریکارڈر (Business Recorder) 322

پاکستان آبزرور (Pakistan Observer) 322

نیوز ویک پاکستان (News Week Pakistan) 324

فرائیڈے ٹائمز (Friday Times) 325

جنگ نامہ 326

روزنامہ آواز 331

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روزنامہ وقت 332
روزنامہ دنیا 333
روزنامہ نئی بات 334
جہان پاکستان 335
روزنامہ دن 336
روزنامہ اوصاف 337
روزنامہ اُمّت، کراچی 337
روزنامہ جناح 338
روزنامہ اساس 338
روزنامہ اِنصاف 339
روزنامہ آج، پشاور 340
ڈیلی سٹی 42، لاہور 340

○ پاکستانی زبانیں، صوبے اور پرنٹ میڈیا 342
سندھی اخبارات 347
بلوچستان میں صحافت 349
پشتو صحافت 353
پنجابی پریس 355
سرائیکی پریس 360
گلگت بلتستان میں صحافت 361
○ کتابیات 369

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میڈیا منڈی، ایک جائزہ

پاکستان میں گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں میڈیا کے شعبے میں بہت وسعت آئی ہے۔ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے علاوہ انٹرنیٹ کے مختلف انداز نے خبروں، تبصروں اور معلومات کو ریاستی سرحدوں کی قیود سے آزاد کر دیا ہے۔ ان تبدیلیوں کے باوجود پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات، جرائد اور رسائل نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔

اس شعبہ کی تاریخ طویل اور ورثہ عظیم ہے۔ پاکستان میں اخبارات، جرائد اور رسائل مختلف مشکل اور سہل ادوار سے گزر کر موجودہ حیثیت تک پہنچے۔ اس طویل سفر کو کچھ مضامین اور کتب میں بیان کیا گیا ہے لیکن ایسی تحریریں جو تجزیاتی اور تحقیقی تقاضوں کو پورا کریں بہت کم ہیں۔

اکمل شہزاد گھمن کی کتاب صحافتی دنیا میں قابل قدر اضافہ ہے جس کو جہاں رواں اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے وہاں تحقیقی تقاضوں کا خاطر خواہ خیال رکھا گیا ہے۔ اردو اور انگریزی میں چھپنے والے بڑے اخبارات کے علاوہ دیگر اخبارات کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔

بڑے اخباری گروپوں کے ارتقاء اور ان میں افراد اور ادارتی سوچ میں تبدیلیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اخباری خاندانوں اور شخصیات کی سیاست اور مقدمہ بازی پر اچھی معلومات ہیں۔

اس کتاب کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اخبارات کے کچھ مالکان اور مدیر حضرات کے علاوہ کچھ مشہور کالم نگاروں کے انٹرویو شامل کیے گئے ہیں جو معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ہیں۔ ان انٹرویوز سے ان شخصیات کی سوچ اور ترجیحات کا اندازہ ہوتا ہے جن کا اثر ان کے اخبارات اور کالموں پر ہوتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کالم نگاروں کے حوالے سے 1980ء کے بعد سے ہونے والے رجحانات کا زیادہ تفصیلی جائزہ ہے اور یہ کہ حکومتی حلقوں کا کچھ اخباری حلقوں پر کیا اثر تھا۔ وقت کے ساتھ اس ''اثر'' میں کیا تبدیلی آئی۔ کالم نگاروں کی نظریاتی ترجیحات پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ کالم نگاروں کو یہ باتیں گراں گزریں لیکن یہ باتیں دلچسپ ہیں۔

ایک دور تھا کہ اخبارات اور لکھنے والوں پر صرف حکومتی حلقوں کا دباؤ ہوتا تھا اب بھی حکومتی حلقے پرنٹ میڈیا کے کچھ لوگوں سے خصوصی تعلقات استوار کرتے ہیں لیکن اب زیادہ دباؤ غیر سرکاری، متشدد مذہبی، نسلی یا علاقائی تنظیموں کی طرف سے آتا ہے جس کی وجہ سے صحافت کے لئے ہمت، استقامت اور مقصدیت کی اب زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف صحافت سے تعلق رکھنے والے افراد بلکہ طلبا و طالبات اور عام پڑھنے والے کے لیے معلومات افزا ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر حسن عسکری

29/12/2014

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میرا تاثر

اکمل شہزاد گھمن سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں مگر میں ذاتی طور پر تو ننانوے فیصد لکھنے والوں سے واقف نہیں، کیا فرق پڑتا ہے؟ عظیم لاطینی امریکی شاعر پابلو نرودا کے بقول جو جہاں بھی رہتا ہے پر میری طرح سوچتا ہے تو وہ میرا ہی پرتو ہے۔ اکمل نے جب کہا کہ میں میڈیا پر اس کے کتابی سلسلے کی اوّلین کاوش 'میڈیا منڈی' پر کچھ لکھ دوں تو ظاہر ہے کہ میں خوش ہوا۔ لیکن جب میڈیا منڈی کا مسوّدہ پڑھنے بیٹھا تو پریشان ہوتا چلا گیا۔ سب کچھ تو گھمن نے خود لکھ دیا تھا، اب میں کیا لکھوں؟ یہ تعلّی نہیں حقیقت ہے کہ اس مسوّدے میں سے بہت سی باتیں میرے لیے نئی ہیں۔ اور انھیں جان کے کہیں کہیں تو یہ بھی محسوس ہوا کہ گھمن شاید اس کتاب کا نام لاشعوری طور پر ہیرا منڈی یا بکرا منڈی رکھنا چاہتا تھا، مگر سیلف سینسر کی دل و دماغ میں گھبی قینچی نے گھمن سے کتاب کا نام میڈیا منڈی رکھوالیا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے؟

گھمن نے بلاشبہ کافی محنت کی ہے۔ مجھے پاکستانی صحافت کے منصور صفت مؤرّخ ضمیر نیازی کی جوتیاں سیدھی کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ لگ یوں رہا ہے کہ نیازی صاحب عالمِ بالا میں بیٹھے اکمل شہزاد گھمن کو دیکھ کے ضرور مسکرا رہے ہونگے۔ انتظار رہے گا اس سلسلے کی اگلی کتاب کا۔ دیکھیں یہ سپیرا اگلی پٹاری سے کیا کیا نکالتا ہے؟ اس تحریر کا مقصد ہرگز نہیں کہ میں آپ کو اکمل کی کتاب پڑھنے کی جانب مائل کروں۔ میں تو بس اپنی پسند ناپسند کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے تو اکمل کی تجزیاتی طاقت اپنی کمی بیشی سمیت پسند آئی۔

مزید نکھار، محنت اور حوصلے کی دعا کے ساتھ۔

وُسعت اللہ خان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیش لفظ

جب کسی بھی سوسائٹی میں اخلاقی اقدار زوال پذیر ہو جائیں اور دولت عزت و احترام کا ذریعہ بن جائے تو ایسی صورت میں افراد کے لیے حالات سے سمجھوتا کرنا آسان ہو جاتا ہے کیونکہ ایمانداری اور دیانت کا راستہ کٹھن ہوتا ہے جو زندگی میں مشکلات کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سمجھوتے کے ذریعے مراعات حاصل کر کے زندگی کو آرام دہ اور پُرتکلف بنایا جا سکتا ہے۔

پاکستان میں صحافتی طبقے کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک میں سمجھوتے کے ذریعے حکمران طبقوں ریاستی اداروں، جرائم مافیا، بڑے صنعت کار اور بڑے بزنس ہاؤسز کے شریکِ کار ہو کر ان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے لیے آسائشیں حاصل کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان طبقوں کا احتساب کرتے ہوئے ان کی بدعنوانیوں اور جرائم کا انکشاف کریں۔ اس صورت میں قید و بند، تنہائی اور مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ مزید یہ کہ سوسائٹی میں بھی ان کے لیے عزت و احترام کے وہ جذبات نہ ہوں گے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس صورتِ حال میں صحافیوں کی اکثریت نے اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہوئے اپنے مفادات کی خاطر پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو دولت اور شہرت کے حصول کے لیے اختیار کر لیا۔

صحافت کے شعبے میں خرابیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ پرنٹ میڈیا اور ٹی وی چینل سیٹھوں کی ملکیت ہیں جنھوں نے میڈیا میں اپنے اثر و رسوخ کو اس لیے بڑھایا ہے کہ وہ اپنے تجارتی مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ ان کا قطعی یہ مقصد نہیں کہ سوسائٹی میں شعور اور احساس پیدا کریں۔

جب صحافت میں بدعنوانیاں آ جائیں اور قومی مفادات کی جگہ ذاتی مفادات لے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لیں، جب حکمراں طبقے احتسابی عمل کو روکنے میں کامیاب ہو جائیں اور استحصالی ادارے اپنے جرائم کو پوشیدہ رکھیں تو اس صورت میں معاشرے کی فلاح و بہبود اور اصلاح کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

پاکستان میں اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب سوسائٹی کو صحافیوں کی موقع پرستی کا علم ہوتا ہے اور وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ لوگ وقت کے ساتھ کیسے اپنے خیالات اور نظریات بدلتے رہے ہیں اور اس موقع پرستی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مال و دولت کا حصول کرتے رہے ہیں تو آخر سوسائٹی خود ان کا احتساب کیوں نہیں کرتی۔ کیا معاشرے کے افراد نے موقع پرستی اور بدعنوانی کو جائز تسلیم کرتے ہوئے ان لوگوں کی عزت کی ہے اور ان کی ذہانت اور صلاحیت سے متاثر ہوئے ہیں کہ اُنھوں نے خود کو حالات کے ساتھ کس تیزی سے بدلا اور کامیاب رہے۔ اب خود سوسائٹی میں بدعنوانی اور جرائم کرنے والوں کے لیے کسی بھی ذِلت اور شرم کا مقام نہیں۔ ایک ایسی سوسائٹی زوال پذیری کی حالت میں بے حسی کا شکار ہے، اور وہ معدودِ چند افراد جو اس کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روز بہ روز ان کی آواز دھیمی اور مدھم ہوتی جا رہی ہے۔

اکمل شہزاد گھمن نے اس کتاب میں ان صحافیوں کی تحریروں کے حوالے سے جو کہ سوسائٹی میں عزت و احترام رکھتے ہیں تجزیہ کیا ہے کہ ان لوگوں نے حالات سے سمجھوتا کر کے کس بے حسی سے اپنی دانش اور پیشہ ورانہ دیانت کو بیچا ہے۔ یہ تجزیہ اس لیے ضروری ہے تا کہ عوام جو وقتاً فوقتاً ان کے کالموں، تجزیوں، انٹرویوز اور تقریروں سے متاثر ہوتے ہیں، انھیں اندازہ ہو جائے کہ ان کی اصلیت کیا ہے اور یہ کس طرح واقعات اور خیالات کو مسخ کر کے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ کتاب ان صحافیوں کا احتساب بھی ہے اور آئندہ آنے والوں کے لیے تنبیہہ بھی۔ اس لیے توقع ہے کہ یہ کتاب صحافتی پیشے میں تبدیلی کا باعث ہو سکے اور جس جرأت سے یہ صحافی غلط بیانی کرتے ہیں اور موقع پرستی کا شکار ہوتے ہیں ایسا کرتے ہوئے شاید وہ خود اپنا تجزیہ کر کے اپنے اعمال کو درست کریں اور صحافتی پیشے کو بحال کریں۔

ڈاکٹر مبارک علی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ابتدائیہ

چند سال قبل ایک قدیمی روزنامے اور ایک مذہبی، سیاسی جماعت کے حوالے سے جب یہ کہنا شروع کیا کہ ان کے جذباتی اور غیر حقیقت پسندانہ رویوں نے پاکستان کو بہت نقصان پہنچایا ہے تو بعض دوست مذہبی جماعت کی حد تک تو اتفاق کر لیتے لیکن اخبار والی بات اُنھیں ہضم نہ ہوتی بہر حال آہستہ آہستہ ذہن بنتا گیا کہ میڈیا پر تنقیدی اور تجزیاتی کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ صحافی اور صحافتی ادارے ہر وقت احتساب کرنے اور سوال اٹھانے پر کمر بستہ رہتے ہیں اور یقیناً وہی ان کی بنیادی ذمہ داری بھی ہے۔ یہ ذمہ داری نبھانے والے صحافیوں کو عوام عموماً اپنا نمائندہ بھی تصور کرتے ہیں لہٰذا صحافی اور صحافتی اداروں کے بارے میں جاننے کا بھی اُن میں بہت تجسس اور اشتیاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ سوال اٹھانے والوں پر بھی سوال اٹھائے جائیں؟ اور پھر تجزیاتی انداز میں دستیاب مواد کا متوازن جائزہ لیا جائے۔

بڑے یا نامور صحافیوں اور میڈیا مالکان کے حوالے سے جو معلومات عام طور پر زیرِ بحث لائی جاتی ہیں ان میں سے بعض جھوٹی، ادھوری یا مبالغہ آمیزی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات سچ تو سامنے ہی نہیں آتا اور اگر آ بھی جائے تو ریکارڈ کا حصہ نہیں بنتا، چنانچہ خیال یہی تھا کہ تمام پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس حوالے سے کام کیا جائے۔ اس وقت تک بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اس قدر محنت اور تحقیق طلب ہوگا بلکہ خیال یہی تھا کہ جو بیان کیا جاتا ہے وہی احاطۂ تحریر میں لانا کافی ہوگا۔ کتاب کا خیال شاید محض ارادہ ہی رہ جاتا، اگر تنویر شہزاد جیسے دوست ہمت نہ بندھاتے اور اس آئیڈیا پر کام کو منفرد قرار نہ دیتے۔

تنویر شہزاد سے تبادلۂ خیال کے بعد حقیقتاً کتاب کے آئیڈیا پر عملی کام بھی شروع کر دیا۔ گو کہ قبل ازیں 2009ء کے وسط سے ہی الیکٹرانک میڈیا کی بدحواسیوں کو نوٹ کرنا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شروع کر دیا تھا۔ کتاب کے لیے انٹرویوز کرنے کا بھی کوئی خیال نہیں تھا۔ مگر اس کام کا کریڈٹ جناب عارف نظامی کو جاتا ہے۔

جنوری 2010ء میں اُن سے گفتگو کے دوران مخصوص اخبار اور مذہبی سیاسی جماعت کی جذباتیت والی بات دہرائی تو کہنے لگے: ''میرا انٹرویو کریں تاکہ میں بتاؤں کہ کیسے مذکورہ اخبار کی پالیسی بدلی گئی''۔ کتاب ہذا کے حوالے سے اُن کے انٹرویو کی کیا افادیت ہے؟ اس سوال پر سوچ وبچار کیا، چنانچہ گاہے بگاہے رابطے کے کئی مہینوں بعد طے شدہ وقت پر اُن کے دفتر پہنچا۔ باقاعدہ گفتگو کے آغاز میں ہی اُنھوں نے پوچھا: ''آپ نے مجید نظامی کا انٹرویو کیا ہے؟''۔ جواب دیا: ''نہیں اور نہ ہی ضرورت ہے'' کہنے لگے ''ان کا بھی موقف لیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔''

چنداں غور کرنے پر اُن کی بات بڑی حد تک درست لگی۔ کہ موقف لینے میں کیا حرج ہے۔ مناسب نہ لگا تو کتاب میں شامل کرنے کی کونسی پابندی ہے۔ لہٰذا انٹرویوز کرنے کا سلسلہ چل نکلا۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ شخصیات یا اداروں کے حوالے سے سینہ گزٹ وہ باتیں جو عموماً آف دی ریکارڈ کی جاتی ہیں، متعلقہ شخصیات کے روبرو رکھ دیں۔ گویا کہ اللہ نے مستند حوالہ جات کا بندوبست کر دیا۔ ایک اصول یہ بھی طے کر لیا کہ جن شخصیات کے انٹرویوز کیے ہیں ان کے متعلق تنقیدی تبصرے سے گریز کرنا ہے کیونکہ جب سخت سے سخت سوال بھی کر لیا تو مزید تبصرہ کرنا زیادتی ہوگی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن حضرات کا کیا قصور ہے جن کی گفتگو ریکارڈ نہ کی گئی جب کہ اُن کو اس کتاب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اولاً تو کسی بھی شخصیت کی ذاتی زندگی کو معلومات کے باوجود موضوع نہیں بنایا گیا کیونکہ کسی بھی فرد کا بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی زندگی جیسے چاہے گزارے اسی طرح کچھ بڑے میڈیا گروپس کے اثاثہ جات، آمدنی اور ٹیکس کی مصدقہ دستاویزات تک رسائی کے باوجود ان کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ دانشورانہ بددیانتی کسی بھی دوسری برائی سے کہیں بڑھ کر جرم ہے لہٰذا یہی کتاب ہذا کا موضوع ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نقاد کے فرائض میں ہرگز یہ بات شامل نہیں کہ وہ جا کر ہر صاحبِ تخلیق سے پوچھتا پھرے کہ جناب! تخلیقی مواد کے پس منظر میں آپ کا مدعا و مقصود کیا ہے؟ دوسرے الفاظ میں منظرِ عام پر آ جانے والے مواد کی توصیف و تنقید ہر فرد کا حق ہے۔ البتہ بعض

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

معاملات پر جہاں ضروری سمجھا گیا ممکنہ حد تک صحافتی اصولوں کے مطابق متعلقہ فریق کا موقف لیا گیا یا اس کے لیے کوشش ضرور کی۔

صحافت بہت مقدس پیشہ ہے۔ بے شمار لوگ اسے بطور مشن اپناتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے قلم، اَلفاظ اور اپنی آواز کے ذریعے برائیوں کو بے نقاب اور اچھائیوں کو نمایاں کر کے معاشرے کی ترقی و بہبود میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں اور قوم کی بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی راہ میں آنے والی تکالیف کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں، بھوک سے لے کر قید تک ہر صعوبت کاٹتے ہیں، کوڑے بھی کھاتے ہیں اور اپنے مشن کی خاطر جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ دوسری طرف اِسی میدان میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اوّل الذِکر کی قربانیوں اور محنت کا پھل سمیٹتے ہیں۔ اپنے کالے کرتوتوں کو چھپانے کے لئے میڈیا کو بطور ڈھال اور پناہ گاہ استعمال کرتے ہیں۔ آسودہ زندگی گزارتے ہیں۔ سرکار، دربار سے انعام و اِکرام سے نوازے جاتے ہیں اور مرنے کے بعد ولی اللہ کا درجہ بھی پا لیتے ہیں۔ ان کی نام نہاد صحافتی خدمات پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ یونیورسٹیاں ان ہستیوں پر توصیفی تھیسز کرواتی ہیں۔ مجال ہے صحافت کے ان ٹھیکیداروں پر کوئی چار تنقیدی حرف لکھ دے اور اگر کوئی لکھ بھی دے تو چھاپے گا کون؟ بہر حال یہ بھاری پتھر کسی کو تو اُٹھانا تھا۔ سو اَلحمدُ اللہ اس سلسلے میں ''میڈیا منڈی'' کا پہلا حصہ پیشِ خدمت ہے۔

اعتراض ہو سکتا ہے کہ صحافت تو مشن ہے تو پھر یہ منڈی والا معاملہ کیا ہے؟ اِس بابت گزارش یہ ہے کہ پاکستان میں کتنے اِدارے ہیں جو صحافت کو بطور کاروبار نہیں چلا رہے؟ کوئی کاغذ کا کوٹہ اور کوئی سیاہی بیچ کر منہ کالا کرتا رہا ہے۔ کوئی سیاستدانوں سے دام وصول کرتا رہا تو کوئی ایجنسیوں سے اپنی قیمت۔ پاکستان کا کوئی ایک اخبار بتا دیں جس نے اپنی درست تعدادِ اشاعت 'ABC' میں درج کروا رکھی ہو۔ یقیناً سو فیصد تعداد بتانا مشکل ہوتا ہے کہ فروخت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے مگر سو فیصد جھوٹ بولنا صحافت کی کونسی خدمت ہے؟ کارکن صحافیوں کا خون پی کر اپنے چہروں پر لالی سجانے والے کیا ان کو کرپٹ بنانے کے ذمہ دار نہیں؟

میڈیا ہاؤسز کے اخبارات یا ٹی وی چینلز سے لوگوں میں آگہی اور شعور کا آنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی گلی میں اپنے گھر کے سامنے بلب لگائے اور اس کی روشنی سے آنے جانے والے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بھی مستفید ہوں۔ ''میڈیا منڈی'' بھی ایک بازار ہے جہاں گاہک بھی ہیں اور دکاندار بھی۔ ایماندار بھی ہیں اور بے ایمان بھی، کھرا مال ہے تو کھوٹا بھی۔ عبادت گاہ بھی ہے اور عبادت گزار بھی۔ قصہ مختصر، یہ وہ منڈی ہے جہاں اُونچی دُکانوں والے آڑھتی بھی ہیں تو آوازیں لگا کر سودا بیچنے والے دیہاڑی دار بھی۔

کتاب ہذا کی اِس جلد میں پرنٹ جرنلزم کے کچھ پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں الیکٹرانک میڈیا جبکہ تیسرے حصے میں میڈیا سے متعلقہ دیگر موضوعات زیر بحث لائے جائیں گے۔

کتاب کے نام کے حوالے سے ذہن میں مختلف نام تھے جیسے ''پاکستانی میڈیا پر ایک نظر''، ''چوتھے ستون کے پیچھے'' یا ''کہانی چوتھے ستون کی''۔ بی بی سی سے منسلک معروف صحافی وُسعت اللہ خاں صاحب سے سال بھر پہلے اس حوالے سے بات ہوئی تو انھوں نے دس کے قریب نام تجویز کیے، جیسے ''چوتھے ستون پر بیٹھے گدھ'' یا ''خبر کی قبر''۔ یہ نام کچھ سخت لگے۔ ایک گفتگو کے دوران چھوٹے بھائیوں جیسے دوست ثاقب عمران (ایڈووکیٹ) کی طرف سے 'میڈیا منڈی' کی تجویز آئی جسے کئی دوستوں نے سراہا۔ نعیم ملک جیسے دوست کا کہنا تھا کہ کام کی نوعیت سنجیدہ ہے اس اعتبار سے لفظ ''منڈی'' نہیں جچتا جبکہ کرامت بھٹی نے کہا کہ اگر میں ایسی کتاب لکھتا تو یہی نام رکھتا، عزیر رانا بھی کرامت کے ہم خیال تھے۔ بہرحال ''میڈیا منڈی'' ہی کتاب کا نام طے پا گیا۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آج سے بیس تیس سال پہلے یونیورسٹیاں تجزیاتی اور تنقیدی کام کرواتیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اُمید ہے کہ آئندہ کچھ محققین اور تجزیہ کار اس کتاب کے بعد میڈیا کے متعلق زیادہ بہتر، اچھا اور معیاری کام عوام الناس کے سامنے لائیں گے۔ پرنٹ میڈیا کے حوالے سے تقریباً سال بھر پہلے کام اٹھی، نوے فیصد مکمل تھا۔ خیال تھا کہ سارا کام تکمیل کے مراحل میں داخل ہو جائے تو پھر پبلشر فیصلے کرلے گا کہ ایک ہی جلد میں سارا مواد شامل کرلیا جائے یا حصے بنا لیے جائیں۔

کتاب کی اشاعت کے حوالے سے متعدد پبلشر حضرات سے بات ہوئی تو جواب عمومی طور پر حوصلہ افزا نہیں تھا۔ بہرحال پبلشنگ کے امور سے واقف ایک دوست نے اشاعت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی حامی بھری تو اطمینان ہوا۔ بعد از اشاعت کتاب کی ترسیل و تقسیم بہر حال ایک مسئلہ تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے جنوری 2015ء کی ایک شام ''نگارشات'' کے مدار المہام اور مرنجاں مرنج شخصیت آصف جاوید صاحب سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوگئی۔ تھوڑی بہت شناسائی پہلے بھی تھی۔ ''میڈیا منڈی'' کے حوالے سے گفتگو ہوئی اور وہ بخوشی کتاب چھاپنے پر آمادہ ہو گئے لہٰذا یوں یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔

''میڈیا منڈی'' پر کام کے دوران دلبرداشتگی کے لمحات بھی آئے۔ اخبار، لائبریریاں، اور انٹرنیٹ بھی چھاننا پڑا۔ پھر سارے مواد کو سمیٹنے کا مشکل مرحلہ بھی آیا کیونکہ ذہن اور قلم یوں رواں تھے کہ ایک ایک موضوع پر پوری پوری کتاب لکھی جا سکتی تھی۔

بے شمار دوستوں نے حوصلہ افزائی بھی کی اور کچھ نے نتائج سے ڈرایا بھی۔ بوجوہ ان سارے مہربانوں کے نام درج نہیں کیے جا سکتے جنھوں نے اس کتاب کے حوالے سے رہنمائی کی کیوں کہ نام لکھنے سے ان کے لیے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

ان زعماء اور صحافیوں کا بہت شکریہ جنھوں نے انٹرویوز اور رہنمائی کے لئے وقت دیا۔ ڈاکٹر مہدی حسن سے ایک طویل نشست بہت کارآمد رہی۔ خواہش تھی کہ کتاب جناب مجید نظامی کی زندگی میں ہی سامنے آئے مگر خدا کو ایسا منظور نہیں تھا۔ مجید نظامی صاحب اور عباس اطہر مرحوم کے انٹرویوز اس حوالے سے بھی یادگار ہیں کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔

کتاب میں درج ایک ایک لفظ مکمل ذمہ داری اور احتیاط سے لکھا گیا ہے۔ تمام انٹرویوز کا مکمل آڈیو ریکارڈ موجود ہے۔ کالم نگاروں کے حوالے سے تحریر کردہ باب ہو سکتا ہے بہت سے حضرات کو ناگوار اور تلخ محسوس ہو۔ اس حوالے سے گزارش ہے کہ یہ باب دل پر پتھر رکھ کر تحریر کیا گیا ہے۔ اشفاق احمد مرحوم، ناچیز کے لئے دعا گو تھے، ان کا استاد اور بزرگ کا درجہ مسلمہ ہے اور اس پر کوئی سوال نہیں۔ اختلاف محض ان کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل پر ہے۔ دعا ہے خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ امجد اسلام امجد صاحب نے ہمیشہ بہت عزت دی ان کا مرتبہ بھی استاد جیسا ہے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب سے بھی برسوں کی شناسائی اور نیاز مندی ہے۔ جاوید چودھری صاحب سے بھی خوشگوار اور یادگار ملاقاتیں رہی ہیں۔ اسی طرح عطاالحق قاسمی صاحب بھی محترم ہیں۔ غرض یہ کہ مذکورہ تمام کالم نگار اور دانشور قابلِ عزت ہیں۔ اور کسی سے بھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کوئی ذاتی رنجش یا مخاصمت نہیں۔ جو صحیح سمجھا اور جانا، وہ میرٹ پر لکھ دیا۔ آخر کسی کو تو یہ بھاری ذمہ داری نبھانی تھی۔

ریڈیو پاکستان کے سابقہ کنٹرولر اور صاحبِ طرز افسانہ نگار جناب علی تنہا اور سابقہ ڈی جی جناب مرتضیٰ سولنگی شکریے کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے کتاب ہذا کی اشاعت کے حوالے سے محکمانہ اجازت دی۔

ازہر منیر، علی اصغر عباس اور خصوصی طور پر پروفیسر خالد ہمایوں صاحب کا تہہ دل سے شکریہ کہ اُنھوں نے حوالہ جاتی مواد فراہم کیا اور پروف ریڈنگ کے لیے وقت نکالا۔ ندیم احمد بھٹی کی کاوش لائقِ تحسین ہے جنھوں نے اُسی جذبے سے کمپوزنگ کی جس جذبے کے تحت یہ کتاب لکھی گئی۔ آخر میں پیارے دوست ابدال احمد جعفری کا ذکر بھی ضروری ہے، جنھوں نے کتاب کو حتمی شکل دی۔ اُستادِ محترم ظفر اقبال (این سی اے، لاہور) کا بھی نیاز مند ہوں جنھوں نے کتاب کو ایک دلکش سرورق سے مزّین کیا۔

آخر میں اپنی بیگم، بچوں، بہن، بھائی اور والدین کی مہربانیوں، دعاؤں، درگزر اور مذاق اڑانے کے لیے (کہ یہ کتاب کبھی مکمل نہیں ہوگی) بہت نوازش۔

نتائج سے بے پروا "میڈیا منڈی" اپنے تئیں ایک مثبت کوشش ہے۔ غلطیاں اور جملہ خامیاں انسانی فطرت ہے لہٰذا ان کی نشاندہی اور کتاب کے مندرجات سے تعمیری اختلاف قارئین کا حق ہے۔ جسے کھلے دل سے خوش آمدید کہا جائے گا۔

اکمل شہزاد گھمن

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پہلا پڑاؤ (نوائے وقت)

ادارہ نوائے وقت پاکستان کے بڑے میڈیا گروپس میں سے ایک ہے۔اس کے زیر اہتمام روزنامہ ''نوائے وقت''، ڈیلی ''دی نیشن''، ہفت روزہ ''ندائے ملت''، ''فیملی میگزین'' اور بچوں کا رسالہ ماہنامہ ''پھول'' شائع ہوتے ہیں۔ ''وقت'' ٹی وی بھی اسی اِدارے کی ملکیت ہے۔ نوائے وقت کو دائیں بازو کا اخبار سمجھا جاتا ہے جس کے مخصوص قارئین عادی ہو چکے ہیں اور وہ کسی بھی دوسرے اخبار کی نسبت اس کو ترجیح دیتے ہیں۔

مذکورہ میڈیا گروپ کی ایک خاص ادارتی سوچ ہے جس کے مطابق یہود و ہنود اور نصاریٰ، مسلم اُمہ اور پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں اور چونکہ پاکستان اسلام کا قلعہ اور مسلم اُمہ کا لیڈر ہے، لہٰذا ہمیں ان سازشوں کا ڈٹ کر نہ صرف مقابلہ کرنا چاہئے بلکہ ان کا منہ توڑ جواب بھی دینا چاہئے۔ انڈیا ہمارا دشمن نمبر ایک ہے لہٰذا اس سے ہمیں کسی قسم کے سیاسی، سماجی، تجارتی اور ثقافتی روابط نہیں رکھنے چاہئیں تاوقتیکہ وہ کشمیر کو آزاد نہیں کرتا اور ہمارے دریاؤں کا پانی نہیں چھوڑتا۔ مزید برآں ہمیں اپنا یہ حق لینے کیلئے انڈیا پر نہ صرف حملہ کرنا چاہئے بلکہ ایٹم بم بھی مار دینا چاہئے۔

علاوہ ازیں اردو ہماری قومی زبان ہے اور اس کا سرکاری سطح پر نفاذ ہونا چاہئے کیونکہ اردو قومی سطح پر نہ صرف یکجہتی اور اتحاد کا باعث ہے بلکہ اس میں مزید مضبوطی اور اضافے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ صوبوں اور ان کی زبانوں کے حقوق کی آواز بلند کرنے کو نوائے وقت صوبائی عصبیت لکھتا رہا ہے۔ ماضی میں ایسا کرنے والوں کو یہ اخبار غدار اور دشمن کا ایجنٹ بھی کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ یہ ادارہ مذہبی سوچ، اندازِ فکر اور سرگرمیوں کو خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ اس زاویہ فکر کو نظریاتی کمٹمنٹ کا نام دیا جاتا ہے، جس کے ذریعے وہ پاکستان کو ایک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی، جمہوری اور فلاحی مملکت دیکھنا چاہتا ہے۔ ادارے سے فکری طور پر متاثر اور وابستہ افراد بھی اس نظریاتی کمٹمنٹ پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ گروپ کی تمام پبلیکیشنز اور وقت ٹی وی اِسی مخصوص طرزِ فکر کے داعی ہیں۔

اخبار کے ادارتی صفحے پر اداریہ اور کالم نارمل سائز کے ہوتے ہیں جبکہ دوسرے صفحے پر بقول شخصے کلاسیفائیڈ اشتہارات کی طرز پر کالم ہوتے ہیں جن کی تعداد تقریباً گیارہ سے تیرہ تک ہوتی ہے۔ آج کل اتفاقاً کوئی بڑا نام بطور کالم نگار اخبار سے وابستہ نہیں۔ ایک زمانے میں وارث میر، عبدالقادر حسن، نذیر ناجی، مجیب الرحمان شامی، عطاالحق قاسمی، عبداللہ ملک اور عباس اطہر جیسے نامور لوگ اس روزنامے میں لکھتے رہے ہیں۔

عبدالقادر حسن اور عباس اطہر تو اس بات کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ انھیں مجید نظامی نے کالم نگار بنایا ہے بلکہ عباس اطہر تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ ''آج میں صحافت میں جو کچھ بھی ہوں شوکت صدیقی اور مجید نظامی کی وجہ سے ہوں''(1) وہ مجید نظامی کو بڑا آدمی قرار دیتے ہیں۔ نامور کمپیئر اور لکھاری مستنصر حسین تارڑ کو بھی لندن میں قیام کے دوران لکھنے کی مہمیز مجید نظامی ہی نے دی۔(2)

نوائے وقت لاہور، کراچی، اسلام آباد اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ ایک بڑا اور قدیم اشاعتی ادارہ ہونے کے سبب یہاں بہت سے صحافیوں نے عملی تربیت حاصل کی۔ گزشتہ کچھ سالوں سے اخبار کی پرنٹنگ اور کاغذ معیاری نہیں۔ پروف کی بھی خاصی غلطیاں ہوتی ہیں۔ ادارے کی تمام پبلیکیشنز انٹرنیٹ پر بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔ ادارہ ہذا نے انڈین فلمی اور شوبز کی خبروں کا مکمل بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ فیملی میگزین اور نوائے وقت کے سنڈے میگزین کے پہلے اور درمیانی صفحات پر پاکستانی اداکاروں یا ماڈلز کے شوٹ چھپے ہوتے ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے ہالی وڈ کی خبروں اور تصاویر کے لیے فیملی میگزین کا ایک صفحہ بھی مختص کر دیا گیا ہے۔

جنگ گروپ کی 'اخبار جہاں' کے بعد مقبول ترین اردو ہفت روزہ 'فیملی میگزین' کے تقریباً 20 صفحات اشتہارات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس رسالے میں فیشن، سیاست، انٹرویوز، شوبز، مختلف شہروں میں ہونے والی تقریبات کی رپورٹس، مذہبی و روحانی تحریروں کے علاوہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سماجی و تاریخی موضوعات پر قسط وار ناول بھی شامل ہوتے ہیں۔ 'ندائے ملت' بھی ہفتہ وار میگزین ہے اس کے تقریباً سات صفحات اشتہارات پر مبنی ہوتے ہیں۔ مذکورہ میگزین میں ملکی و بین الاقوامی سیاست، طب، سماج اور ادب جیسے موضوعات پر تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں عموماً 9 سے 12 صفحات پر اشتہارات ہی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں تاریخ، ورثہ، ادب، سپورٹس، طب، کرائمز، فیچر، تحقیق، معاشرت، خصوصی رپورٹس، قسمت کا حال اور روحانیت وغیرہ پر تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ مگر کسی ایسے سلگتے ہوئے موضوع کو کم ہی چھیڑا جاتا ہے، جس سے کسی عام قاری کے ذہن میں نئے سولات جنم لیں یا اس کی سوچ کو نیا رخ ملے۔ نامور افسانہ نگار اے حمید آخری عمر تک ''بارش، خوشبو اور سماوار'' کے عنوان سے بہت کم معاوضے پر نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں لکھتے رہے۔ یہ معاوضہ ہفتہ وار 600 روپے سے ہوتا ہوا انکی زندگی کے آخری ایام میں 1500 روپے کے قریب پہنچ گیا۔

اخبار، سیاست، شوبز، مذہب، ادب وغیرہ پر بھی رنگین ایڈیشنز شائع کرتا ہے۔ نوائے وقت گروپ کی تمام پبلیکیشنز میں کتابوں پر تبصرے کے صفحے پر زیادہ تر مذہبی کتابوں ہی پر تبصرے ہوتے ہیں۔ اخبار کا سنڈے میگزین انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے لیکن اسے پڑھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اخبار کے نمائندگان کا پورے ملک میں مضبوط نیٹ ورک موجود ہے۔ غالباً یہ اردو کا پہلا روزنامہ تھا جس نے ملک کے اہم شہروں اور بیرون ملک باقاعدہ نامہ نگار مقرر کئے اور مختلف علاقوں کے نامہ نگاروں کو خبریں فیکس کرنے کا معاوضہ بھی اپلائی کرنے پر دیتا رہا۔

23 مارچ 1940ء کو نوائے وقت کا پہلا شمارہ شائع ہوا، جبکہ ایک اور روایت کے مطابق اسکی اشاعت 29 مارچ 1940ء کو ہوئی۔ یہ جریدہ اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ، لاہور) سے تعلیم یافتہ کچھ نوجوانوں کی اجتماعی کاوش تھا لیکن اس میں زیادہ تر کام حمید نظامی ہی کرتے ((3 حمید نظامی، عبدالستار نیازی، شبر حسن، اور سی آر اسلم، یہ سب لوگ زمانہِ طالب علمی کے گہرے دوست تھے اور علامہ اقبال کی مجلسوں میں باقاعدہ حاضر ہوتے تھے۔ سی آر اسلم (جو بعد میں معروف سوشلسٹ رہنما بنے) نے کلام اقبال سے ''نوائے وقت'' کی ترکیب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مستعار لے کر ایک پندرہ روزہ اخبار کا ڈیکلریشن لیا۔ لہٰذا نوائے وقت کے پہلے ناشر اور مدیر سی آر اسلم تھے۔ ((4 ڈاکٹر مہدی حسن کے مطابق یہ اخبار دوستوں نے پیسے ڈال کر شروع کیا تھا اور پہلے ایڈیٹر شبر حسن تھے۔ 1944ء میں یہ اخبار روزنامہ بنا اور ڈاکٹر شبر حسن میڈیکل کی تعلیم کیلئے لندن چلے گئے تو حمید نظامی اخبار کے ایڈیٹر بن گئے۔ حامد محمود ان کے ساتھ تھے جن کے نام پریس تھا۔ ((5

ڈاکٹر فوزیہ اسحاق نے حمید نظامی پر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں تحریر کیا ہے کہ 11 فروری 1941ء تک اخبار کی پیشانی پر سرپرست کی حیثیت سے میاں بشیر احمد جبکہ 22 جولائی 1944 تک چودھری رحمت اللہ اسلم (سی آر اسلم) بی۔اے، ایل۔ایل۔بی۔ کا نام اخبار کے مینجنگ ڈائریکٹر اور پبلشر کے طور پر چھپتا رہا۔ پہلے پرچے میں قائداعظم محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور سر عبدالقادر کے پیغامات شائع ہوئے اور اِدارے کی جانب سے حمید نظامی نے ''کچھ اپنے متعلق'' کے عنوان سے لکھا:

''ہم آپ کو یہ یقین ضرور دلانا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے سامنے صرف اچھی خبریں پیش کریں گے۔ ہمارے دو سب سے بڑے مقاصد اردو زبان کی ترقی اور علامہ اقبال کے پیغام کی اشاعت ہیں۔ ہم اس اخبار کی مدد سے کسی ادبی اور معاشرتی انقلاب برپا کرنے کے مدعی نہیں لیکن ہمیں یہ دعویٰ ضرور ہے کہ ہم آپ کے سامنے اچھا ادب ضرور پیش کریں گے۔ نوجوان ہونے کے باوجود ہم فضول جوش کے قائل نہیں۔''

اسی طرح پہلے پرچے میں اداریہ ''نوائے قوم'' کے زیرعنوان میاں بشیر احمد نے لکھا۔ ابتدائی طور پر یہ اخبار چونکہ سیاسی نہیں تھا لہٰذا اس میں حفیظ ہوشیار پوری کا کلام اور کرشن چندر کے افسانے بھی چھپا کرتے تھے۔ ((6

''حمید نظامی کے مطابق، ان کا اخبار 23 مارچ 1940ء کے تاریخی دن، جب آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی تھی، ایک ہفتہ وار رسالے کے طور پر نکالا گیا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس کے پہلے شمارے میں ظہور عالم شہید اور حکیم عنایت اللہ سوہدروی کے مطابق، خبروں اور اداریتی کالموں میں لیگ کے اجلاس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا تھا'' (صحافت پابندِ سلاسل، از ضمیر نیازی، صفحہ 86-85)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ابتدا میں اخبار پندرہ روزہ تھا۔ یکم جون 1942ء کو ہفت روزہ جب کہ 22 جولائی 1944ء سے یہ روزنامہ بن گیا۔ 1944ء سے 1960ء تک نوائے وقت سے مختلف حیثیتوں میں منسلک رہنے والے زاہد چودھری اس سفر کی رُوداد یوں بیان کرتے ہیں:

''قائداعظم محمد علی جناح نے اپریل 1944ء کے اواخر میں ایڈیٹر ہفت روزہ نوائے وقت کو طلب کیا اور خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے جریدے کو روزنامہ بنا کر پنجاب میں اس کے ذریعے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی ترجمانی کرے۔ جب حمید نظامی نے اس سلسلے میں مطلوبہ سرمایہ کے فقدان کا ذکر کیا تو قائداعظم نے کہا ''تم نواب ممدوٹ سے بات کرو وہ انتظام کر دے گا۔'' نواب اس وقت ملحقہ کمرے میں ہی بیٹھا ہوا تھا چنانچہ حمید نظامی اس کے پاس گیا تو اس نے بتایا کہ قائداعظم کی خواہش ہے کہ مجوزہ روزنامہ ایک کمپنی کے زیر اہتمام شائع ہو جس کے پانچ حصہ دار ہوں: نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ، میاں بشیر احمد، حمید نظامی اور اس کا کوئی اور نامزد شخص۔ حمید نظامی نے یہ تجویز فوراً منظور کر لی اور دوسرے دن اپنے ایک دوست حامد محمود کا نام پانچویں حصہ دار کے طور پر پیش کیا۔ حامد محمود ایک ایگزیکٹو انجینئر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے آسودہ حال درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ نواب ممدوٹ نے اس نام پر کوئی اعتراض نہ کیا اور مجوزہ کمپنی کی حصہ داری کا معاہدہ لکھنے کا کام ایک مقامی وکیل محمود علی قصوری کے سپرد کیا گیا۔ جب اس نے یہ کام تین چار دن میں مکمل کیا تو معلوم ہوا کہ دریں اثنا ممتاز دولتانہ نے اپنی رائے بدل دی تھی۔ اب اس کی خواہش تھی کہ اس کمپنی کے صرف تین جاگیردار حصہ دار ہوں۔ حمید نظامی ہفت روزہ میں اپنے مفاد کا معاوضہ قبول کر لے اور پھر روزنامہ نوائے وقت میں ایک تنخواہ دار ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرے۔ حمید نظامی نے یہ تجویز رد کر دی چنانچہ دو اڑھائی ماہ بعد اُنھوں نے اپنے دوست حامد محمود کی شراکت سے ہفت روزہ کو روزنامہ بنا دیا اور اس طرح پنجاب میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی مؤثر ترجمانی شروع ہو گئی''۔

''اس وقت حمید نظامی کی عمر 29 سال تھی لیکن اس کی صحافت منجھی ہوئی اور پختہ تھی اور اسکے اداریے زوردار تھے۔ چنانچہ یہ اخبار تھوڑے ہی عرصے میں مقبول ہو گیا۔''(7)

نظامی دولتانہ اختلاف بعد میں بھی کسی نہ کسی شکل میں نمایاں ہوتا رہا۔ 12 نومبر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

1949ء کو ''نوائے وقت'' کی ملکیت حمید نظامی اور حامد محمود سے ایک مشترکہ سٹاک کمپنی ''نوائے وقت پبلیکیشنز لمیٹڈ'' کے نام منتقل ہوگئی۔ لیکن چند برس بعد حمید نظامی اور شیخ حامد محمود کے مابین اختلافات پیدا ہوگئے اور اُنھوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ''نوائے وقت پرنٹرز'' حامد محمود کے حصے میں آیا اور ''نوائے وقت پبلیکیشنز'' حمید نظامی کے پاس رہا۔ ((8

حمید نظامی زمانہ طالب علمی میں کالج کے مجلوں ''کریسنٹ'' اور ''فروغِ مشرق'' سے مختلف حیثیتوں میں وابستہ رہے۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے صحافتی تجربے کی خاطر سیاسی و معلوماتی ماہنامہ ''ساربان'' میں بطور اعزازی اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی کام کیا۔ جن دنوں ایم اے کررہے تھے تو پنجاب کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر ستیہ پال کے روزنامہ ''نیشنل کانگریس'' میں ترجمہ اور اداریہ نویسی کا کام کرنے لگے۔ چراغ حسن حسرت اور باری علیگ بھی اسی روزنامے کے ادارتی عملے میں شامل تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے مطابق ان کا کانگریس کے نظریات سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر مالی ضرورتوں کے تحت اُنھوں نے اس اخبار میں ملازمت اختیار کی۔ بعد ازاں وہ برصغیر میں مسلمانوں کے پہلے خبر رساں ادارے ''اورینٹ پریس آف انڈیا'' کی لاہور برانچ میں بطور منیجر کام کرتے رہے۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے حکومت پنجاب کی ایک سکیم کے تحت کچھ عرصہ کے لیے صحافت کی ٹریننگ لی تھی اور صوبائی سیکرٹریٹ کی پریس برانچ میں ملازمت بھی کی۔ ((9

فیروز سنز کے ساتھ بھی ایک زمانے میں وہ مترجم کے طور پر منسلک رہے۔ بنیادی طور پر وہ ادب کے طالب علم تھے۔ ایف سی کالج سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ قیام پاکستان سے قبل وہ باقاعدہ افسانے اور مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہے۔ نوائے وقت میں سیاسی و سماجی موضوعات پر طنز و مزاح کا سلسلہ ''سرراہے'' بھی حمید نظامی نے تحریر کرنا شروع کیا۔ اُنھوں نے چیخوف اور ٹالسٹائی کے بعض افسانوں کے علاوہ عربی، چینی اور جاپانی شعراء کے کلام کا اردو ترجمہ بھی کیا جو ماہنامہ ''ہمایوں'' میں چھپتا رہا۔ ((10 حمید نظامی اعلیٰ پائے کے مقرر تھے اور ان کی سیاست میں بہت دلچسپی تھی، ان کی خط کتابت قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ بھی رہی۔ 1937ء میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور ان کے ساتھ ہی عبدالسلام خورشید سیکرٹری منتخب ہوئے جن کے والد عبدالمجید سالک اس وقت یونینسٹ پارٹی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے ترجمان اخبار ''انقلاب'' کے ایڈیٹر تھے۔

1939ئ میں اس تنظیم کے عہدیداروں میں اختلافات اور حمید نظامی کے غم ہائے روزگار کی وجہ سے فیڈریشن کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں تو اس سال ایک اور طالب علم مرزا عبدالحمید صدر اور چوہدری نصراللہ سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ 15 نومبر 1942ء کو جس دن قائداعظم کی زیر صدارت جالندھر میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا اجلاس ہوا، نوائے وقت کی اشاعت ہفتہ وار کر دی گئی لیکن اس کے تقریباً دو ہفتے بعد طلبا کی باہمی دھڑے بندی کے باعث حمید نظامی کو فیڈریشن کی صدارت سے الگ کر دیا گیا۔ 4 دسمبر کو فیڈریشن کی مجلس عاملہ نے حمید نظامی کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کی اور اسکی جگہ ظہور عالم شہید قائم مقام صدر بن گیا۔ ((11)

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ 1939ء کے بعد کسی وقت حمید نظامی دوبارہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بن گئے تھے۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان تھے لہٰذا پاکستان بننے کے بعد تک بھی وہ اپنا مکان نہ بنا سکے اور ٹیمپل روڈ پر مترو کہ وقف املاک کے ایک مکان میں رہائش پذیر رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اشتراکی خیالات کا حامل فرد نوائے وقت میں داخل نہیں ہو سکتا تھا جب کہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حمید نظامی جامد خیالات کے حامل نہیں تھے۔ عارف نظامی کے بقول ''وہ جمہوری اقدار کا حامل مسلم پاکستان چاہتے تھے نہ کہ جماعت اسلامی یا دقیانوسیت کا پاکستان۔ حمید نظامی نے بہت واضح کہا کہ پاکستان پاپائیت یا تھیوکریٹک سٹیٹ نہیں بن سکتا۔''(12)

حمید نظامی نے احمد شاہ پطرس بخاری کی مرتبہ کتاب ''درسِ زندگی'' کے لیے ''ایمان اور رواداری'' کے عنوان سے ایک مضمون میں لکھا:

''وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے۔'' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان روادار نہ ہو، رواداری میری رائے میں انسانیت کا ایک ضروری جوہر ہے۔ اپنے عقیدے پر پختہ ایمان ضروری ہے مگر دوسروں کے خیالات سننے اور ان پر غور کرنے کیلئے انسان کو ہمیشہ آمادہ رہنا چاہئے۔ خواہ یہ خیالات اس کے اپنے عقائد و خیالات کی نفی ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔ حقیقت اور سچائی تک پہنچنے کا آسان بلکہ واحد راستہ یہی ہے کہ انسان دل و دماغ کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رکھے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور نئے خیالات کی تازہ ہوا کو روکنے کی کوشش نہ کرے۔ اخلاص اور ایمان کے معاملے میں کسی فرد یا گروہ کی اجارہ داری نہیں مانی جاسکتی۔ میرے مخالف نظریے کا حامی میری رائے میں غلطی پر ہے۔ میں اسے گمراہ بھی کہہ سکتا ہوں مگر میں اس امکان سے کیسے انکار کرسکتا ہوں کہ شاید وہ بھی اپنے نظریے میں مخلص اور ایماندار ہو۔ دوسرے کے خیالات کو سننے سے انکار دراصل اپنی اس کمزوری کا بالواسطہ اعتراف ہے کہ ہمیں خود اپنے خیالات پر پختہ ایمان نہیں۔ معاملہ کسی فرد کا ہو یا کسی قوم یا ملک کا جو بھی دوسروں کے خیالات اور نظریات سے انکار کرتا ہے وہ دراصل اس بات سے ڈرتا ہے کہ مخالف نظریات اس کے اپنے نظریات سے زیادہ قوی اور جاندار ہیں اور اس پر غالب آجائیں گے۔

رواداری کا فقدان افراد میں پھوٹ ڈالتا، ہمسائے کو ہمسائے سے دور کرتا اور دوستوں کو ایک دوسرے سے لڑاتا ہے۔ اس طرح قوموں اور ملکوں میں عناد اور لڑائی کا بیج وہ نظریات بوتے ہیں جو اپنے حامیوں اور پیروؤں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے نظریئے کو ماننے والوں یا خود اس نظریئے کو قبول کرنے سے انکار کرنے والوں کو بے ایمان یا ظالم سمجھیں اور انہیں اپنے نظریے پر قائم رہنے کا حق دینے سے انکار کریں۔ ایمان اور رواداری دوش بدوش چلنے چاہئیں ورنہ ہر قدم پر یہ ڈر ہے کہ رواداری کے بغیر ایمان جنون کی شکل اختیار نہ کر جائے۔"(13)

حمید نظامی کے ہمدمِ دیرینہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے کہ "حمید نظامی ان صحافیوں میں شامل تھے جو محض عوام کی ترجمانی کے نہیں بلکہ رہنمائی کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ بعض اوقات وہ رائے عامہ سے بھی بھڑ گئے چنانچہ 1953ء کے اینٹی احمدیہ ایجی ٹیشن میں اُنھوں نے غیر جانبداری کی روش اختیار کی۔ کیونکہ وہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کی حمایت نہیں کرتے تھے۔ جب تحریک نے بہت سنگین روپ لے لیا تو اس وقت "نوائے وقت" نے صرف اتنا مطالبہ کیا کہ چودھری ظفر اللہ وزارت سے از خود مستعفی ہو جائیں کیونکہ انھیں عوام کا اعتماد حاصل نہیں رہا۔ اس دوران نوائے وقت کی اشاعت میں کافی کمی ہوگئی لیکن حمید نظامی نے اصول کا سودا نہ کیا اور اپنی روش پر قائم رہے۔"(14)

حمید نظامی نے مسلمانوں کیلئے ہندوؤں سے علیحدہ ملک حاصل کرنے کی عملاً کوشش

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ضرور کی اور ہوسکتا ہے تحریک پاکستان کے دوران یا بعد میں حالات کے مطابق سخت الفاظ یا تلخ لہجہ بھی اپنایا ہو مگر وہ متعصب نہ تھے۔ جنوری 1952ء میں اُنھوں نے اپنے ایک پنجابی مضمون میں مہینہ وار رسالے ''پنجابی'' میں لکھا (ترجمہ) ''ڈیڑھ سال ہوا ہے مجھے دِلی جانے کا اتفاق ہوا تو میں اپنے پرانے دوست نریندر جی (مالک اور ایڈیٹر ''پرتاپ'') کو ملنے ان کے گھر بھی گیا۔''(15)

مذکورہ تحریر سے حمید نظامی کے اندازِ فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ہندو کو اپنا دوست بھی کہہ رہے ہیں اور اس کے گھر بھی جاتے ہیں اور وہ بھی دِلی میں۔ حمید نظامی نے لیاقت علی خاں، ایوب خان یہاں تک کہ جب قائداعظم نے گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کیا تو ان سے بھی اختلافِ رائے کیا اور نوائے وقت میں اداریہ لکھا ''ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ قائداعظم مسلم لیگ کے محبوب راہنما کی حیثیت سے پاکستان کے گورنر جنرل کی نسبت بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں''۔

اختلاف رائے کے ساتھ ساتھ ان کا خیال تھا کہ حکومت پر تنقید ضرور ہونی چاہئے لیکن وہ دیانت پر مبنی ہونی چاہئے اور یہ چیز ہمیشہ مدنظر ہونی چاہئے کہ تنقید سے قوم میں بددلی اور منفی رجحان پیدا نہ ہو۔ لوگ تنقید پڑھ کر مایوس نہ ہو جائیں کہ اس ملک کا تو کچھ بن ہی نہیں سکتا۔ دوسرا یہ کہ تنقید برائے تنقید نہ ہونی چاہئے اور نہ صرف یہ دکھانے کے لیے کہ ہم نکتہ چینی کر رہے ہیں۔''(16)

حمید نظامی کی تحریروں اور خیالات میں فطری ارتقاء جھلکتا ہے۔ وہ زندہ رہتے تو شاید یہ فکری سفر مزید جاری رہتا۔ 2 مئی 1948ء کو اُنھوں نے نوائے وقت میں اِداریہ تحریر کیا کہ ''اہل پاکستان کا رجحان مِلّیت کی طرف نہیں صوبائیت کی طرف ہو رہا ہے۔ عوام اور خواص مسائل پر غور و فکر کرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ وہ ایک قوم ہیں بلکہ صرف اپنے اپنے صوبے اور اپنے علاقے کا مفاد اُن کے پیش نظر ہوتا ہے۔ پٹھانستان کا فتنہ، آزاد خلافت کی تحریک، مشرقی بنگال میں بنگالی اور اُردو کا جھگڑا، سندھ میں پنجابیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اور پنجاب میں مہاجر و انصار کی روایت اسلامی اور قابل تقلید نہیں بلکہ مضر و مصنوعی تفرقہ ہے اور یہ سب فتنے دراصل ایک ہی بیمار ذہنیت کے مختلف مظہر ہیں۔ ہماری رائے میں صوبائی عصبیت پاکستان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ اس زہر کا تریاق یہ ہے کہ کم از کم مغربی پاکستان میں صوبائی امتیازات اُڑا دیئے جائیں۔ یہ صرف اِسی صورت میں ممکن ہے جب پاکستان کے نئے آئین میں مغربی پاکستان کے صوبوں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کا وجود ختم کر دیا جائے"۔

"وقتی طور پر یہ تجویز اکثر لوگوں کو بری معلوم ہوگی اور بعض صورتوں میں اہل غرض یہ نعرہ بلند کریں گے کہ پنجابی ہم پر حکومت کرنا چاہتے ہیں مگر اس تجویز میں ہر صوبے کے عوام کا بلا امتیاز صوبہ بھلا ہے اور اگر کسی کا نقصان ہے تو محض ایک مختصر سے گروہ کا جس کا اقتدار چھن جائے گا۔ یہ گروہ خود پنجاب سے اس تجویز کے خلاف آواز بلند کرے گا۔ لیکن اس مضر احساس کو کہ فلاں صوبے سے تعلق رکھتے ہیں اور فلاں صوبے والے ہمیں کھا جائیں گے ختم کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ صوبے ہی ختم کر دیئے جائیں۔ پاکستان میں صرف دو حصے رہ جائیں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان اور ہم سندھی، پنجابی، بلوچی، سرحدی کی بجائے صرف پاکستانی رہ جائیں"(17)

27 مارچ 1948ء کو حمید نظامی نے لکھا "کل قائداعظم نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "بنگالیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی صوبائی زبان کے متعلق جو فیصلہ چاہے کریں، مگر جہاں تک پاکستان کی قومی و سرکاری زبان کا تعلق ہے، یہ درجہ اردو کو ہی حاصل ہوگا۔" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "جہاں تک پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کا تعلق ہے، اردو کی سرکاری اور قومی حیثیت پر ان صوبوں کے عوام کو کوئی اعتراض نہیں۔" وقت کے ساتھ حمید نظامی کی سوچ بھی آگے بڑھی۔

مہینہ وار "پنجابی" میں چھپنے والے اپنے ایک مضمون (نومبر 1951ئ) "پنجابی دی ابتدائی تعلیم" میں وہ لکھتے ہیں (ترجمہ):

"اپنی مادری زبان کو بھلا کر یا چھوڑ کر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ خدانخواستہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پنجابی اور اردو سوکنیں ہیں یا ان دونوں میں کوئی بیر ہے۔ اگر اُردو اور انگریزی کا ساتھ ہو سکتا ہے اور دونوں زبانیں ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں تو اردو اور پنجابی اس صوبے میں کیوں اکٹھی نہیں چل سکتیں۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کے گھرانوں میں سو میں سے نوے لوگ آج کل بھی گھروں میں پنجابی ہی بولتے ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ اس کے بغیر گزارہ ہی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نہیں ہوسکتا۔ خاص طور پر بچوں کی ابتدائی تعلیم تو ضرور مادری زبان میں ہونی چاہئے، اس لیے کہ دوسری زبان بچے کے ذہن پر بہت بوجھ ڈالتی ہے۔ اور اگر تعلیم کا ذریعہ کوئی دوسری زبان ہو تو بچے کا ذہن اک جگہ پر آ کے رک جاتا ہے۔ جب میرے دوست ڈاکٹر باقر نے پہلے پہل یہ تجویز پیش کی بچوں کی تعلیم کا ذریعہ پنجابی ہونا چاہئے تو ان کی یہ بات میرے دل کو نہیں لگی تھی۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ پھر میں ذرا سوچ میں پڑ گیا اور میں نے کہا کہ پہلے میں اپنے بچوں پر تو تجربہ کروں۔

میرے گھر میں چوبیس گھنٹے اردو بولی جاتی ہے۔ میری بیوی دس بارہ سال علی گڑھ میں پڑھی ہے اور پنجابی ہونے کے باوجود اردو ہی بولتی ہے۔ میرا اپنا کام بھی اردو ہی میں ہے۔ ہم گھر میں اردو ہی بولتے ہیں اور میرے دوست عزیز بھی بچوں سے اور بچے ان سے اردو ہی بولتے ہیں۔ پر جب میں نے تجربہ شروع کیا تو یہ عجیب بات نوٹ کی کہ بچہ بہت روانی سے بات چیت کرتے کرتے، کبھی کبھی اٹک جاتا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ کوئی خاص لفظ ہوتا ہے جس کی اسے اردو نہیں آتی اور وہ بات کرتے کرتے سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ پر جب میں نے اس کے ساتھ پنجابی میں گل بات کی تو وہ کبھی نہیں اٹکا اور فر فر بولے جاتا ہے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ گھر میں تو کبھی اس کے ساتھ پنجابی بولی ہی نہیں جاتی، چوبیس گھنٹے اردو ہی کا رواج ہے۔ اس نے پنجابی کہاں سے سیکھی ہے کہ اردو سے زیادہ اسے پنجابی پر عبور ہے۔ اس چھوٹے سے تجربے کے بعد میں نے اور بھی تجربے کیے اور میری رائے بدل گئی۔ اب میں ڈاکٹر باقر صاحب کا ہم خیال ہوں کہ چھوٹے بچوں کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان ہی میں ہونی چاہئے"۔ 18))

جنوری 1952 میں "پنجابی" رسالے میں اپنے پنجابی میں ہی چھپنے والے مضمون میں حمید نظامی اپنے زمانے کو فیض احمد فیض کا زمانہ کہتے ہیں۔

(ترجمہ): "آج اس بات پر اصرار کیوں کیا جاتا ہے کہ حفیظ جالندھری اور فیض احمد فیض کے زمانے میں ہم لاہور اور کراچی میں وہ اردو بولیں جو غالب یا انیس کے زمانے میں بولی جاتی تھی۔" (19)

واضح رہے کہ 9 مارچ 1951ء کو پنڈی سازش کیس رونما ہو چکا تھا۔ مگر مجید نظامی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صاحب نے جو اُن کے چھوٹے بھائی تھے اور حمید نظامی کی وفات کے بعد 1962ء میں نوائے وقت کے ایڈیٹر بنے، وہ اور طرح سوچتے تھے۔ اگست 1985ء میں جنرل ضیاء الحق کی زیر صدارت اے پی این ایس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر مجید نظامی نے بطور اے پی این ایس صدر سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے فیض کے حوالے سے کہا:

''ہمارے قومی پریس کی روایات بڑی تابندہ ہیں۔ جمہوریہ اسلامی میں ہمارا پریس کبھی بڑا فعال اور مضبوط تھا اس میں پہلی دراڑ اس وقت پڑی جب ہمارے قومی پریس کے ایک گروپ کے اس وقت کے ایڈیٹر انچیف نے ایک سابق فوجی ہوتے ہوئے حکومت وقت کا تختہ الٹنے کے لئے خود کو ایک فوجی سازش میں ملوّث کیا اور اپنے فوجی اور غیر فوجی ساتھیوں کے ساتھ سزا پائی۔''(20)

حمید نظامی کے فرزند عارف نظامی اپنے چچا کی سوچ سے اختلاف رکھتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ''ایوب خان کے زمانے تک مجید نظامی نے حمید نظامی مرحوم کی مارشل لاء اور آمریت کے خلاف پالیسیوں کو جاری رکھا مگر یحییٰ خاں کے دور میں نوائے وقت کو پٹڑی سے اتار کے یحییٰ خاں کا حامی بنا دیا''۔

''نوائے وقت مشرقی پاکستان میں ''الشمس'' اور ''البدر'' کی حمایت کرتا تھا۔ اور مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کی بھی نہ صرف حمایت کی بلکہ بہت بڑھ کر اسے سراہا۔ اس کی وجہ کچھ تو بھٹو سے نفرت تھی اور کچھ جہالت بھی۔''

''بھٹو کے بعد ضیاء الحق کے دور میں نوائے وقت نے ''پرو ضیاء الحق'' کردار اپنا لیا۔''

اخبار کی ادارتی سوچ کے حوالے سے عارف نظامی کہتے ہیں کہ ''میرا نوائے وقت کی پالیسی پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ لیکن میں ذاتی طور پر محترم مجید نظامی سے اختلاف رائے کا اظہار کر دیتا تھا۔ چنانچہ مجھ پر لیبل لگا دیا گیا کہ یہ نوائے وقت کے اندر ایک ''پیپلیا'' ہے حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ بھٹو کے دورِ حکومت میں مجید نظامی صاحب خود مجھے بھٹو صاحب کے ساتھ بیرون ملک دوروں پر بھیجتے رہے''۔((21

مجید نظامی صاحب اپنے موقف کے حوالے سے بہت واضح ہیں اور اس معاملے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں ان کا رویہ بالکل بھی معذرت خواہانہ نہیں۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کسی ڈھکے چھپے انداز میں نہیں بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ صحافتی دنیا میں انہیں ایسا کامیاب ایڈیٹر سمجھا جاتا ہے جس نے نوائے وقت کا ایک وسیع حلقہ اثر قائم کیا اور اپنے ادارے کو ملکی صحافت کا ایک اہم حصہ بنایا۔ ملکی سیاست میں بھی ان کا کردار بہت نمایاں اور اہم رہا ہے۔

معروف صحافی اور سیفما (Safma) کے سربراہ امتیاز عالم کا کہنا ہے کہ ''نوائے وقت کی سوچ رجعت پسند اور زوال پذیر ہے۔''(22)

جبکہ مجید نظامی صاحب اور نوائے وقت سے وابستہ افراد سمجھتے ہیں کہ یہ سوچ پاکستان کی پہچان اور بقاء کی ضامن ہے۔

''نوائے وقت'' کا ذکر کیے بغیر پاکستان کی صحافتی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی گو کہ یہ شاید ملک کا واحد بڑا اخبار ہے جس کی پالیسی بہت واضح ہے اور کسی ابہام کا شکار نہیں۔ پھر بھی نوائے وقت گروپ کے معاملات اور افکار کو سمجھنے کی کوشش کے سلسلے میں حمید نظامی مرحوم کے فرزند جناب عارف نظامی اور بھائی جناب مجید نظامی کے انٹرویوز کیے گئے۔

پہلا انٹرویو عارف نظامی صاحب کا ہے وہ ''دی نیشن'' کے طویل عرصہ ایڈیٹر رہے۔ اُنھوں نے نوائے وقت گروپ سے علیحدگی کے بعد انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹوڈے'' نکالا۔ ان کے والد حمید نظامی نے دوستوں کے سرمائے سے نوائے وقت کا اِجرا کیا اور ان کے چچا مجید نظامی صاحب کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے 1969ء میں نوائے وقت سے علیحدگی کے بعد اپنا اخبار ''ندائے ملت'' دوستوں سے پیسے لے کر نکالا اور اتفاق سے عارف نظامی صاحب کا ''پاکستان ٹو ڈے'' بھی دوستوں کے پیسے سے ہی شروع کیا گیا۔

عارف نظامی ایک لبرل، روشن خیال اور پڑھے لکھے صحافی سمجھے جاتے ہیں اور ملکی صحافت میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ انٹرویو کے دوران اُنھوں نے تمام سوالات کا جواب اپنے روایتی دھیمے لہجے میں دیا اور چائے سے تواضع بھی کی۔ ان کا یہ انٹرویو 4 جنوری 2011ء کی سرد دوپہر ''پاکستان ٹوڈے'' کے لاہور آفس میں ریکارڈ کیا گیا۔

عارف نظامی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

س: کہا جاتا ہے کہ تحریک پاکستان میں 'نوائے وقت' کا بہت بڑا رول ہے۔ یہ مبالغہ آمیزی نہیں؟

عارف نظامی: قطعاً نہیں۔ نوائے وقت اخبار کا اجراء قائداعظم کی ہدایت پر حمید نظامی صاحب نے کیا۔ میرے پاس دستاویزی ثبوت بھی موجود ہے۔ حمید نظامی مرحوم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانی صدر بھی تھے۔ اُسے آج کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں گڈمڈ نہ کریں۔ وہ تحریک پاکستان میں ایک طرح سے نوجوانوں کے روح رواں بھی تھے۔ اگر آپ اِن دونوں باتوں کو مدنظر رکھیں پھر اُس زمانے کے اُردو پریس کو دیکھیں۔ اُس میں پرتاپ، ملاپ اخبار تھے جو ہندوؤں کے قبضے میں تھے یا زمیندار جیسے اخبار تھے جو پاکستان کی موومنٹ کی رپورٹنگ کرتے تھے۔ حمید نظامی مرحوم کے کلیدی کردار کا موجودہ تناظر میں ادراک مشکل ہے کیوں کہ جب اُنھیں اخبار نکالنے کا کہا گیا تو اُس وقت کے کچھ جاگیرداروں مثلاً دولتانہ وغیرہ نے اُنھیں سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن اُنھوں نے اپنے بعض دوستوں جن میں ڈاکٹر مبشر حسن کے بڑے بھائی شبّر حسن اور ڈاکٹر باقر کے ساتھ مل کر یہ اخبار بے سروسامانی میں نکالا۔ غالباً سی آر اسلم بھی شروع کے زمانے میں اِن کے ساتھ تھے۔

یہ پہلے چودہ روزہ تھا۔ پھر غالباً ہفت روزہ اور پھر ڈیلی ہوا۔ لہٰذا نوائے وقت کا کردار صحافت کے لحاظ سے کلیدی رہا تھا اور حمید نظامی کا اپنا ایک رول تھا۔ لیکن اِس کے باوصف میں یہ بات کرتا چلوں کہ حمید نظامی مرحوم اُن لوگوں میں سے تھے جو آزادیٔ صحافت پر یقین رکھتے تھے۔ نوائے وقت کوئی مسلم لیگ کا پارٹی آرگن تو تھا نہیں۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ مسلم لیگ کے لوگ قائداعظم کی رحلت کے بعد پٹڑی سے اُتر گئے اور ایسے کام کیے جو قائداعظم کے افکار، علامہ اقبال کی تعلیمات یا قیامِ پاکستان کے بنیادی مقاصد کے مطابق نہیں تھے، چنانچہ ایسے لوگوں کے خلاف حمید نظامی ڈٹ گئے۔ اُنھوں نے لیاقت علی خاں مرحوم سے بھی اختلاف کیا اور بعد میں دولتانہ کی سرکار جو پنجاب میں تھی اُس سے بھی سخت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اِختلاف کیا نتیجتاً حکومت نے 'نوائے وقت' کو بند کر دیا۔ اِس حوالے سے آپ دیکھیں تو پاکستان کے بنیادی مقاصد میں یقین رکھنے والے ایک آزاد صحافی کے طور پر حمید نظامی مرحوم کا کردار کلیدی تھا۔

☆ نوائے وقت کے پہلے مدیر اور ناشر سی آر اسلم نہیں تھے؟

o اگر یہ تاریخ کا حصہ ہے تو ایسا ہی ہوگا۔ مدیر تو حمید نظامی تھے۔ ناشر کا مجھے علم نہیں۔

☆ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پہلے ایڈیٹر بھی سی آر اسلم تھے؟

o یہ میرے علم میں نہیں ہے۔ یہ تو تاریخ سے چیک کرنا پڑے گا کیوں کہ میں تو اُس وقت موجود نہیں تھا۔

☆ ایک زمانے میں اخبارات کی پالیسی تھی کہ کسی اخبار کے ایڈیٹر کی تصویر یا اُس کے بیانات اس کے اپنے اخبار میں نہیں چھپتے تھے لیکن اب تو اتر سے نوائے وقت میں مردِ مجید، مجاہدِ ملت، مجاہدِ صحافت، نشانِ جمہوریت، محافظِ نظریۂ پاکستان جیسے خطابات کے ساتھ کالم چھپ رہے ہیں۔ وقت ٹی وی پر بھی ایسے پروگرام ہوتے رہتے ہیں، ذاتی تشہیر کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ صحافی کے طور پر آپ اِسے کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

o آپ کے سوال ہی میں اس کا جواب مضمر ہے۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے یہ خاص طور پر ایک ایسے اخبار میں ہو رہا ہے جس کے بانی کا نام ایکسپلائٹ کیا جا رہا ہے۔ حمید نظامی کی اولاد کے لیے نوائے وقت کا دفتر شجرِ ممنوعہ ہے۔ اُدھر باقاعدہ آفس آڈر کے ذریعے ہمارا داخلہ بند کیا ہوا ہے۔ جو میرے وہاں جائز حقوق ہیں، وہ بھی سلب کیے گئے ہیں۔ میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عارف نظامی وہاں محض ایک ملازم تھا۔ اُس ایمپلائی کے بقایاجات سے ایک آنہ بھی آج تک نہیں دیا گیا۔ یہ تو اُن کا حمید نظامی کے خلاف ایک خبثِ باطن ہے۔ حمید نظامی جو اُسی اخبار کے بانی تھے اُن کے اخبار میں یہ سب چھپنا واقعی ایک ستم ظریفی ہے۔ حمید نظامی مرحوم ایک بالکل دوسری انتہا پر تھے۔ مثلاً اُن کی والدہ کا انتقال ہوا تو وہ یہ خبر بھی چھاپنے کو تیار نہ تھے۔ جب خود بیمار ہوئے تو کہتے تھے اخبار میں خبر نہ لگانا۔ انہوں نے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تحریک پاکستان میں جعلی حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ تو اپنے زمانے کے شعلہ نوا رہنما تھے۔ اور اُنھوں نے مسلم لیگ جالندھر سیکشن کے اجلاس میں جاگیرداروں کے خلاف تقریر بھی کی تھی۔ قائداعظم کے ساتھ اُن کا ایک ذاتی تعلق تھا اور اُن کے ساتھ خط کتابت بھی تھی۔ اس کے باوجود اُن کا نظریہ تھا کہ ایڈیٹر کو اپنی تحریروں کے ذریعے نظر آنا چاہیے۔ لیکن یہاں تو آپ نے کہہ ہی دیا اُس میں صرف ایک اضافہ کرلیں۔ نعوذ باللہ، فرقہ مجیدیہ، ایک Cult بنا دیا گیا ہے۔ لگتا ہے موصوف کو اپنے بارے میں اِتنا اِحساسِ کمتری ہے کہ اُنھیں بار بار اپنے آپ کو ''چونڈ ہیاں وڈنیاں پینڈیاں نیں'' کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں۔ جس وقت تک وہ اخبار میں اپنی تصویر نہ دیکھ لیں، خوشامد نہ کروالیں۔ اُنھیں یقین نہیں آتا کہ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ اور اُسکا بیّن ثبوت یہ ہے کہ میں آپ کے پاس ایسے کالموں کا ڈھیر لگا سکتا ہوں جو نوائے وقت میں چھپتے ہیں اور شروع ہی اِس بات سے ہوتے ہیں کہ جناب اِس ملک میں اگر کوئی پاکستان کا نام لیوا ہے یا نظریۂ پاکستان، جو اُن کے نزدیک نظریۂ پاکستان ہے، اُس کا محافظ ہے تو صرف مجید نظامی۔ ایٹم بم ہے تو مجید نظامی صاحب کی وجہ سے ہے۔ ہم بھارت کے سامنے اگر آج تک کھڑے ہیں تو مجید نظامی صاحب کی وجہ سے، مسئلہِ کشمیر زندہ ہے تو اُن کی وجہ سے۔

میں ایک دفعہ بھٹو صاحب کے ساتھ شمالی کوریا گیا۔ اُس زمانے میں کِم اِل سنگ (Kim il Sung) زندہ تھے۔ وہ وہاں کہتے تھے کہ بارش بھی اُن کی وجہ سے ہوتی ہے اور اگر فصل اچھی ہوتی ہے وہ بھی اُن کی وجہ سے۔ تو ابھی تک اُنھوں نے اس کا دعویٰ تو نہیں کیا باقی سب کچھ موصوف ہی ہیں۔

یہ اِس لحاظ سے قابلِ مذمت ہے کہ ایڈیٹر کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ایسی چیزوں میں آئے۔

☆ مجید نظامی صاحب کہتے ہیں کہ پاکستان بننے سے پہلے اِس خطے کی یہ حالت تھی کہ لاہور میں صرف ایک ماڈل ٹاؤن تھا اور پورے شہر میں پانچ، چھ گاڑیاں تھیں اور پاکستان بننے کے بعد دیکھیں کہ لوگوں کے پاس اتنی گاڑیاں آگئی ہیں اور اتنے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ٹاؤن بن گئے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمیں پاکستان کی وجہ سے ملا ہے۔ کیا اِس سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ جس آدمی کو کُچھ نہیں ملا وہ پاکستان کے خلاف ہو جائے؟

○ دیکھیں اِس کے دو پہلو ہیں۔ جزوی طور پر میں مجید نظامی صاحب کی اِس بات سے اتفاق بھی کرتا ہوں کہ پاکستان میں لوگوں کو بہت کُچھ ملا ہے، مثلاً شروع شروع میں ادارہ نوائے وقت کے ایڈیٹر اور شاید جنرل منیجر کے پاس موٹر ہوتی تھی اَب ماشاء اللہ عام صحافیوں کے پاس بھی کئی کئی گاڑیاں ہیں۔ اِس لحاظ سے پاکستان نے ترقی تو کی ہے لیکن بعض اوقات یہ ترقی معکوس اِس لحاظ سے لگتی ہے کہ غریب آدمی تو اُسی طرح غربت میں رہ رہا ہے جیسے پہلے تھا۔ مگر اسے اپنا مُلک ملا ہے ایک شناخت ملی ہے، مسلمانوں کے لیے علیحدہ مُلک کی تمنا تھی وہ پُوری ہوئی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ حُبّ الوطنی کی صحیح سپرٹ تبھی آتی ہے جب وسائل کی منصفانہ تقسیم ہو اور اصولی طور پر تو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ لیکن مزیدار بات یہ ہے کہ پاکستان کو زیادہ برا وہی لوگ کہتے ہیں جو زیادہ امیر ہیں اور جنھوں نے کینیڈا وغیرہ کے پاسپورٹ لیے ہوئے ہیں۔ یہ تو غریب آدمی ہے جو پاکستان سے زیادہ محبت رکھتا ہے حالانکہ اس کو آزادی کے کوئی زیادہ ثمرات نہیں ملے۔

☆ نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن کی بلڈنگ میں چند سو لوگ اکٹھے کر کے اور نعرے لگوا کے یہ سمجھ لینا کہ ہم نظریہ پاکستان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ اُس ادارے سے تحقیق، ریسرچ کا کام لے سکتے ہیں مثلاً یہ کہ بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک کیوں ہے اور اِسکی وجوہات کیا ہیں یا ایسے کونسے عناصر ہیں جو مُلک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کیا اُس جگہ کو صرف تقریر کا اکھاڑہ نہیں بنا دیا گیا؟ اور نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن سے مُلحقہ مجلسِ ترقی ادب، لاہور پر بھی قبضے کی کوششیں ہوئیں۔ اخباروں میں بھی بہت آیا، آپ نہیں سمجھتے کہ یہ سارا کچھ دورخی ہے؟

○ یہ دورخی نہیں، مافیا ہے۔ اسکا پس منظر یہ ہے کہ غلام حیدر وائیں صاحب نے یہ زمین دی تھی۔ میں بھی اسکا ممبر رہا ہوں پھر اُنھوں نے مجھے اور فرزندِ اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال کو بلانا چھوڑ دیا۔ مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئی کہ میں تو ایک ٹرسٹی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوں، مجھے کیسے اُنھوں نے بلانا چھوڑ دیا ہے۔ وزیراعلیٰ پنجاب شہباز شریف بھی اِن کے بہت بڑے دستِ راست ہیں۔ وہ ایک طرح سے بظاہر میرے اور مجید نظامی صاحب کے درمیان صُلح کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''بظاہر'' میں اِس لیے کہہ رہا ہوں کہ اُن کا روئے سُخن مجید نظامی صاحب کی طرف زیادہ، اور میری طرف کم تھا۔ شہباز شریف نے مجھے کہا ''بھئی آپ آئے نہیں وہاں؟'' تب میں اِدارہ نوائے وقت میں تھا۔ شہباز شریف صاحب نے مجید نظامی سے پوچھا تو اُنہوں نے کہا" میں اوہنوں کڈھ دِتا اے"

میں آپ کو صرف اس لئے بتا رہا ہوں کہ اُس جگہ پر معدودِ چند کے سوا کسی آدمی کی گنجائش نہیں ہے جو پڑھا لکھا ہو، ریسرچ یا ایسی چیزوں سے اُس کا تعلق ہو۔ وہ ایک طرح سے مجید نظامی کی ذات کی خودنمائی کا مرکز بن گیا ہے۔ اُس دفتر میں جو لوگ ہیں وہ ان کی خوشامد کرتے ہیں۔ اُس ادارے کا جو مدارالمہام ہے اس کا نام شاہد رشید ہے۔ وہ آبکاری ایکٹ میں اندر رہ چکا ہے۔ وہ وہاں شراب نوشی اور بدفعلی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ وہاں کے جو ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ڈاکٹر منیر کیا نام ہے ان کا۔۔۔ ڈاکٹر رفیق احمد نے اُنھیں رنگے ہاتھوں پکڑا، ایف آئی آر درج ہوئی۔ اخبارات میں آیا اور شاہد رشید کو وہاں سے نکال دیا گیا لیکن مجید نظامی صاحب اُس نظریۂ پاکستان میں یقین رکھتے ہیں جو اُن کی ذات کی رونمائی کرے۔ چونکہ وہ مجید نظامی صاحب کا سب سے بڑا خوشامدی ہے اِس لیے اِن سب چیزوں کو پس پُشت ڈال کر اُسے پھر وہیں رکھ لیا گیا۔ آپ مجھے بتائیں جس اِدارے کا مدارالمہام ایسا شخص ہو اُس کے ہوتے ہوئے کوئی ادارہ ریسرچ ورک کر سکتا ہے؟ وہاں بسیں خریدی گئی ہیں جن میں بچے بھر کر لائے جاتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر ایک میڈیا ایونٹ Create کیا جاتا ہے۔ ملاّ کی دوڑ مسجد تک، شہباز شریف کو بلا لیا جاتا ہے۔ پہلے پرویز الٰہی کو بلا لیا جاتا تھا۔ اُن سے پیسے بھی لیے جاتے ہیں اور غیر قانونی کام بھی کروائے جاتے ہیں۔

وہ ایک قبضہ گروپ بن چکا ہے۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ لوگ ایک بلڈنگ یا پلاٹ پر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قبضہ کرنے کے لیے مسجد بنا لیتے ہیں۔ اُنھوں نے وہاں مجلس ترقیِ ادب کی جگہ پر مسجد بنا کے قبضہ کیا ہے۔ پہلے انہوں نے شریف فیملی کے بچوں کو رکھا۔ حمزہ شریف اور پتا نہیں کون کون۔ وہ جلاوطنی میں گئے تو پرویز الٰہی اور شجاعت کے بچوں کو لے آئے۔ جب شریف فیملی واپس آئی تو چودھری فیملی کے لوگوں کو پھر نکال دیا۔ یہ ایک قسم کا قبضہ گروپ بن چکا ہے۔ وہ جو اُنہوں نے زمین لی ہوئی ہے بابِ پاکستان کیلئے یا پتا نہیں کیا بنانے کیلئے۔ یوسف رضا گیلانی صاحب کو بھی بلایا۔ پیسے بھی مانگے اُن سے دس کروڑ روپیہ لیا۔

چار پانچ دفعہ وہ منصوبہ ایکسپائر ہو چکا ہے کچھ بنا نہیں پائے۔ بنائیں کس طرح؟ وہاں تو سوائے اُن چیزوں کے کچھ ہے ہی نہیں۔ پتا نہیں وہاں کیا کام ہو رہا ہے۔ یہاں مال روڈ پر پرائم لینڈ ہے اُس کو نوائے وقت اور مجید نظامی صاحب کی پروٹیکشن حاصل ہے۔ جو حکومت آتی ہے اُن کی کاسہ لیسی شروع کر دیتی ہے اور نام لیتے ہیں اسلام اور نظریۂ پاکستان کا۔ چلیں مان لیا کہ وہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن کم از کم وہاں جو افکار ہوں وہ ایسے تو ہونے چاہئیں جن سے پتا چلے کہ واقعی نظریۂ پاکستان، اگر اِس نام کی کوئی چیز ہے تو اُس کی خدمت ہو رہی ہے اب وہاں درکشاپیں ہوتی ہیں، موصوف جا کے لیکچر دیتے ہیں کہ ہندو سے نفرت کرنا سیکھو۔ بھئی آپ کا جو نظریۂ پاکستان ہے، اس کی بنیاد مثبت ہے یا کہ منفی چیزوں پر ہی قائم ہے؟ ہندو سے نفرت کرنا سیکھو، اُن کے اوپر بم پھینک دو، بم کیساتھ خود بندھ کر گر پڑو۔ اِس قسم کی رجعت پسندانہ سوچ کو ترویج دینا۔۔۔ کیا یہ مثبت عمل ہے؟ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سب کچھ سرکاری خرچ پر ہو رہا ہے۔ کبھی ٹرسٹ، کبھی فاؤنڈیشن بنا دیتے، چونکہ پیچھے ایک بلیک میلنگ ویلیو ہے۔ وہ سب کچھ چلتا رہتا ہے۔ اِس ادارے کا انڈیپنڈنٹ آڈٹ ہونا چاہئے۔ آزاد باڈی ہونی چاہئے۔ کوئی ریسرچ ہونی چاہئے، یہ اِدارہ ایک آدمی کی Extention of ego بن چکا ہے اور کچھ نہیں۔

☆ پاکستان، بالخصوص سندھ میں لاکھوں ہندو آباد ہیں۔ جب ہم ''ہندو ذہنیت''،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''گھٹیا ہندو'' جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں تو کیا پاکستان میں رہنے والی اقلیتیں Let down نہیں ہوتیں؟

o میں واضح کرتا چلوں بھارت اور اسکی پالیسیوں سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ یہ نہ سمجھیں میں پروانڈیا ہوں۔ کشمیر کا مسئلہ حل طلب ہے۔ بھارت بڑا ہونے کے باوجود چھوٹی سوچ رکھتا ہے۔ لیکن اِس بحث کو اُنھوں نے بہت سطحی بنا دیا ہے انڈیا میں کتنے کروڑ ہندو ہیں، وہ سب کے سب بنیئے ہیں، عیار ہیں، جھوٹے ہیں مکار ہیں؟ آیا پاکستان میں جو اقلیتیں رہتی ہیں وہ بھی ایسی ہی ہیں؟ پاکستان میں رجعت پسندانہ سوچ کی ترویج کو اُنھوں نے اپنا مشن بنالیا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ پاکستان میں روشن خیالی کو گالی بنا دینا اِن لوگوں کا مطمعِ نظر ہے۔ میں تو حیران ہوتا ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کسی ایشو پر ڈبیٹ ہونی چاہئے۔ ہر چیز کو اُس کے سیاق وسباق میں دیکھنا چاہئے۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ہو رہا۔

☆ آپ نے رجعت پسندانہ رویے کی بات کی تو نوائے وقت میں تواتر سے چھپنے والے جذباتی نعرے، ''افغان باقی کہسار باقی'' سے مُلک کو موجودہ دہشت گردی کے تناظر میں نقصان نہیں پہنچا؟

o دیکھیں حمید نظامی مرحوم کا جو نوائے وقت تھا اور یہ جو نوائے وقت ہے، "چہ نسبت خاک را اَست۔ اِس پر میں اتنا ہی کہوں گا حمید نظامی مرحوم ایک سچے پاکستانی تھے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اپنے اخبار میں فسطایت، تھیوکریسی، ملا کریسی کے خلاف لکھتے تھے۔ آج بھی جماعت اِسلامی کے بارے میں جو میٹریل quote ہوتا ہے، وہ حمید نظامی کے اِداریوں پر ہی مبنی ہے۔ آپ اس سے اندازہ کرلیں کہ ایک مسلم پاکستان اور اسلامی نظام میں جو فرق تھا وہ نوائے وقت نے ملحوظ رکھا۔ اب اُنھوں نے نوائے وقت کو کٹھ مُلا کا اخبار بنا دیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ جو ایک مخصوص قسم کا دایاں بازو تھا وہ بھی اب نوائے وقت جیسی سوچ نہیں رکھتا۔ میں نام لے سکتا ہوں۔ مثلاً مجیب الرحمان شامی جیسے لوگ ہیں جو دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں یا جماعت کا بیک گراؤنڈ بھی ہے لیکن وہ نوائے وقت کی سوچ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے مطابقت نہیں رکھتے۔

ہمارے ایک دوست ہیں زاہد ملک صاحب۔ اُنھوں نے اسلام آباد میں کوئی نظریۂ پاکستان بنانے کی کوشش کی۔ اُس پر اِس سارے مافیا نے چڑھائی کر دی ایک تو نام نہاد نظریۂ پاکستان ہے جو ہے یا نہیں وہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن جو ہے اُس پر ہماری منا پلی ہے اور کسی کا نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن بنانا یا گورنمنٹ سے پیسے لینا جُرم ہے۔ تو زاہد ملک بیچارے سے بہت بُری کی گئی۔ اصل میں اب یہ کٹھ ملا، صافوں والے، عجیب قسم کے لوگ ہیں جو کہسار باقی کی بات کرتے ہیں۔ یہ ہر حساس معاملے کو بھی Lowiest Level پر لے آتے ہیں۔

☆ تحریک پاکستان میں حصے کے دعویدار ایک بڑے اخبار کا معروضیت سے ہٹ کر جذباتیت کو فروغ دینا ٹھیک ہے؟

o آپ یہ نہ کہیں کہ دعویٰ ہے بلکہ یہ حقیقت ہے۔ لیکن وہ حمید نظامی مرحوم کے انتقال تک ایک دور تھا۔ میں آپ سے یہ بھی عرض کروں کہ جو بات صحیح ہے وہ کرنی چاہئے کہ مجید نظامی نے ایوب خان کے دور تک مارشل لاء اور آمریت کے خلاف حمید نظامی کی پالیسز کو جاری رکھا۔ پھر یحییٰ خاں کے دور میں نوائے وقت کو پٹڑی سے اُتار کر یحییٰ خاں کا حامی بنا دیا۔ اُس وقت اُن سے علیحدہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُنھوں نے نوائے وقت کی پالیسی بالکل بدل دی۔ میری والدہ اِس پر معترض تھیں۔ پھر بھٹو اقتدار میں آئے تو ان کے اعصاب پر بھٹو طاری ہو گیا۔ یحییٰ خاں کے بعد بھٹو کے خلاف شوکتِ اسلام وغیرہ میں بھی یہ شریک تھے۔ اور بھٹو کی پھانسی میں بالکل فریق ہی بن گئے۔ اب کہتے ہیں ہم نے ہمیشہ حق گوئی اور بے باکی کو شیوہ بنایا۔ مردِ مجاہد اور پتا نہیں کیا کیا۔ حالانکہ اُنھوں نے ضیاء الحق اور اسکی رجعت پسند پالیسیوں کی حمایت کی اور تب تک کرتے رہے جب تک بھٹو پھانسی نہیں چڑھ گیا۔ بعد میں ایم آر ڈی کے دور میں نوائے وقت نے پینترا بدلا، اور اُس میں میرا بھی بڑا رول تھا، میں کہتا رہتا تھا کہ یہ غلط ہے۔ ایک دو دفعہ میں نے ان کو لکھ کر بھی دیا کہ آپ کی کمٹمنٹ بھٹو کی پھانسی تک تھی، اب تو خدارا پالیسی کو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بدلیں، اِس پر مجھ سے بڑا ناراض ہوئے اور میں آپ کو کیا بتاؤں کہ ایم آر ڈی کی تحریک میں انھوں نے اِس لیے ضیاء کی مخالفت نہیں کی کہ ان کو کوئی اصولی مسئلہ تھا۔ اصل میں یہ ضیاالحق پر بھی اپنے آپ کو مسلط کرتے تھے، بعد میں اُس نے بھی اِنھیں گھاس ڈالنی چھوڑ دی، میں یہ کہتا رہتا تھا کہ آپ یہ غلط کر رہے ہیں لیکن اب یہ اپنے آپ کو جمہوریت کا چمپئن بھی بناتے ہیں۔ نواز شریف کے بہت بڑے حامی بنتے ہیں۔ لیکن جب وہ جلاوطن ہوئے تو یہ مشرف کے نمائندے بن کر اُن کے پاس گئے کہ آپ خود لندن جا کر برگر کھائیں۔ اپنے بھائی کو واپس بھیج دیں اور مشرف کو تسلیم کر لیں۔ نواز شریف نے کہا یہ سب کچھ بہت توہین آمیز ہے اور اس معاملے کو رد کر دیا۔ میں آپ کو جو بتا رہا ہوں وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ کبھی میں کتاب لکھوں گا، آپ کو پہلی دفعہ بتا رہا ہوں جب یہ واپس آئے تو مشرف صاحب کو کسی نے کہا:

He is not independent honest broker. تو مشرف صاحب نے انھیں ملنے سے انکار کر دیا۔ رات کو پھر اُن کے سیکرٹری حامد جاوید کا دفتر کھلوایا گیا۔ میں بھی ساتھ تھا۔ وہاں مجید نظامی صاحب نے بتایا کہ جناب آپکا پیغام میں وہاں دے آیا ہوں۔ لہٰذا اُوپر سے تو یہ کچھ اور بنتے ہیں۔ مشرف پہلا حکمران تھا جس نے ان کو جو یہ چاہتے تھے، وہ اہمیت نہیں دی۔ وہ کہتا تھا، "He is just one of the editors" یہ مشرف کے الفاظ ہیں۔ وہ زندہ ہے اُس سے پوچھیں۔ میں اِن کو ڈیفنڈ کرتا تھا، وہ ان کے بارے میں یہ بھی کہتا تھا:

"He is very arrogant man" دیکھیں یہ ستم ظریفی کی باتیں ہیں۔ نواز شریف کو اِن باتوں کا بڑا گلہ ہے۔ انھوں نے پھر مجید نظامی صاحب کو خط بھی لکھا۔ چونکہ مجید نظامی نے نواز شریف کو کہا تھا کہ آپ سترھویں ترمیم کو تسلیم کر لیں، نواز شریف نے ایسا نہ کیا۔ آپ کو یاد ہوگا اس میں ایم ایم اے کا بھی رول تھا۔ نواز شریف اِستقامت سے مشرف کے معاملے میں ڈٹا رہا۔ اُسے ڈیلز آفر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوئیں جو اُس نے قبول نہیں کیں۔

☆ مجید نظامی صاحب کہتے بھی ہیں اور نوائے وقت میں کوئی نہ کوئی کالم اِس حوالے سے چھپا ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ میں نے ہر جابر سُلطان کے سامنے کلمہِ حق بُلند کیا؟

○ "جابر سُلطان کے سامنے کلمہِ حق کہنا عین جہاد ہے" یہ نوائے وقت کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے اور جہاں تک تعلق ہے حمید نظامی مرحوم کا انھوں نے اِس کو سچ کر دکھایا اور ایک طرح سے اُس گھٹن میں انھوں نے ایوب خاں کے مارشل لاء کے دوران اپنی جان بھی دے دی۔ بعد میں الف لیلہ کے ان سب قصوں میں کہیں مبالغہ آمیزی اور کہیں سفید جھوٹ ہے، جس طرح میں نے آپ کو مشرف والی بات بتائی ہے۔ البتہ میں یہ کہوں گا بہرحال اِس معاملے میں نوائے وقت کا کردار دوسرے اخباروں سے مختلف رہا ہے کہ مُلک میں جمہوریت ہونی چاہئے یہ کہتے رہے ہیں اور اب بھی کہہ رہے ہیں لیکن کیا فائدہ؟ آپ کہتے ہیں کہ جمہوریت ہونی چاہئے جبکہ عملاً ایسا نہیں ہے۔ تیسرا، آپ جہادیوں کو سپورٹ کر رہے ہیں۔ جمہوریت کا بنیادی اصول pluralism ہے اور آپ اِسی کے خلاف لگے ہوئے ہیں۔ آج کا نوائے وقت جہالت کو پروموٹ کر رہا ہے۔ میرے جانے کے بعد سال ڈیڑھ سال میں، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میرا اس معاملے سے براہِ راست تعلق ہے لیکن ادارہ روبہ انحطاط ہے۔ وقت ٹی وی، نوائے وقت اور نیشن کے سرمائے سے بنایا گیا۔ سارا انفراسٹرکچر میں نے کھڑا کیا۔ جب تیار ہو گیا تو وہ موصوفہ جو اِن کی لے پالک بیٹی ہیں، اس کو لا کے وہاں بیٹھا دیا۔ اِن کو شوق تو بہت ہے اقتدار اور پاور کا، دوسروں کو بھی جمہوریت کا درس دیتے ہیں لیکن خود حال یہ ہے کہ مینجمنٹ کی شُدبُد سے بھی واقفیت نہیں کہ ٹیلی وژن ہوتا کیا ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ اُس میں ان کو بہت زیادہ خسارہ ہو رہا ہے۔ سب کو پتا ہے کہ اُس کی ریٹنگ رائل ٹی وی سے بھی بدتر ہے۔ نوائے وقت کی سرکولیشن بھی نیچے جا رہی ہے۔ نیشن تو بالکل ٹھس ہو گیا ہے۔ نوائے وقت ایک منافع بخش اخبار ہے اگرچہ اُسکا منافع کم ہو رہا ہے۔ آپ اخبار کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

منافع، ٹی وی کا خسارہ پورا کرنے کے لیے لگا رہے ہیں۔ اور نزلہ گر رہا ہے نوائے وقت کے کارکنوں پر، میرے خیال میں وہاں سے سینکڑوں لوگوں کو تو فارغ کیا جا چکا ہے۔ بس کچھ ناکارہ ٹائپ لوگ رہ گئے ہیں۔ وہاں کوئی ایڈیٹوریل کنٹرول ہی نہیں ہے۔

☆ ''چودھریوں اور ڈاکٹروں نے بڑا جنسی ہیر پھیر مچا رکھا ہے، اِن کو پکڑ کر درختوں سے لٹکا کر پھانسی دی جائے، جیسا ایران میں ہوتا ہے۔ تب جا کر اِن کا ''بیج'' مرے گا۔ اگر اِن زن باز چودھریوں اور ڈاکٹروں میں ہمت ہے تو کسی چودھری یا ڈاکٹر کی بیٹی کو اغواء کر کے اِس سے اجتماعی زیادتی کر کے دکھا دیں۔ حکومت کرنے والوں کی بیٹیوں کی عصمت دری نہیں ہوتی۔ اگر اللہ کا عذاب آ گیا تو وہ دن دُور نہیں کہ حکمرانوں، چودھریوں اور ڈاکٹروں کی بیٹیاں سرِ عام عصمت دری کا نشانہ ضرور بنیں گی۔ اب وہ زمانہ گیا کہ انصاف حکومت سے مانگا جائے، بلکہ آج کا تقاضا ہے کہ غریب لوگ ایکا کر کے زانی سے براہ راست ٹکر لیں، اِسکی عزت کو یرغمال بنائیں''۔ یہ اقتباس 'سرِ راہے' 26 دسمبر 2010 سے ہے۔ کیا یہ زبان کسی قومی اخبار کو زیب دیتی ہے؟

o میرا نہیں خیال کہ یہ مجید نظامی صاحب کی نظروں سے گزرا ہو۔ جیسے میں نے پہلے عرض کیا وہاں پروفیشنل سٹینڈرڈز بالکل ہی زیرو ہو چکے ہیں۔ ایک زمانے میں ہم جنگ" کو طعنہ دیتے تھے کہ وہ فری فار آل ہوتا ہے۔ لیکن جنگ میں انھوں نے کمیٹیاں بنائی ہوئی ہیں کسی کے پاس ایڈیٹوریل کنٹرول ہے تو کسی کے پاس کچھ اور، وہاں ایک طریق کار ہے حالانکہ وہاں ہر قسم کا کالم نگار چھپتا ہے۔ نوائے وقت میں سسٹم مفقود ہو چکا ہے۔ ارشاد عارف وہاں ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ پڑھے لکھے سلجھے ہوئے آدمی ہیں، یقین کریں اُس بیچارے سے میرا کوئی تعلق یا لینا دینا نہیں تھا، لیکن چونکہ موصوف کے ذہن پر میں سوار ہوں لہٰذا اُسکو اِس اِلزام میں کہ وہ میرا آدمی ہے، وہاں سے فارغ کر دیا گیا۔ اسکے بعد وہاں کوئی والی وارث ہی نہیں ہے۔ عباس اطہر جیسے آدمی وہاں سے پہلے ہی چلے گئے۔ مصیبت یہ ہے کہ اس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ادارے میں ایک آدمی جسکا کوئی تشخص ہوسکتا ہے، وہ موصوف خود ہیں۔ باقی وہاں کوئی آدمی پیدا ہوجائے جس کا نوائے وقت کے باہر کوئی اپنا نام یا تشخص ہو تو اُسکو برداشت نہیں کیا جاتا، چاہے وہ ارشاد عارف ہو، عباس اطہر ہو، عبداللہ ملک ہو، یا کوئی زید بکر۔ نتیجہ یہ ہے کہ نان پروفیشنل اُس اخبار کو چلا رہے ہیں۔

☆ مجید نظامی صاحب کہتے ہیں کہ مسلم لیگیں اکٹھی ہوں گی تو پاکستان بچے گا" ایک ایڈیٹر کا کیا کام ہے کہ وہ جماعتیں اکٹھی کرتا پھرے؟

o اخبار کا ایڈیٹر جب خود خبر بن جائے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ خوشامدی اُن سے کہتے ہیں اور وہ خود سمجھتے بھی ہیں کہ وہ حمید نظامی سے بڑے ایڈیٹر ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اِن کے دور میں نوائے وقت کو زیادہ منافع ہوا ہو مگر جو صحافتی اُصول اور Norms کو تو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک مسلم لیگیں اکٹھی کرنے کی بات ہے، وہ کِس طرح اکٹھی ہوں؟ چودھری برادران تو اِن کی شکل دیکھنے کو تیار نہیں۔ شجاعت صاحب اِن کے گھر گئے تو یہ کہنے لگے میں نواز شریف کو بُلا لیتا ہوں شجاعت صاحب مجھ سے کہنے لگے،" بھئی میں سوچتا رہ گیا کہ کیا جواب دوں میرے دل میں آیا کہ اِنھیں کہوں پہلے آپ اپنا گھر اکٹھا کر لیں پھر مسلم لیگیں اکٹھی کر لیجئے گا۔

☆ نوائے وقت میں نوابزادہ نصر اللہ خاں جیسے اصولی سیاستدان کا مذاق اُڑایا جاتا رہا۔ سیاست اور سیاست دانوں کی تضحیک کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟

o کوئی مقصد نہیں۔ جب بندہ سترہ بترہ ہوجائے تو ایسے ہی ہوتا ہے۔

☆ دوسرے صوبوں میں جب بھی کسی بندے نے اپنی زبان یا حقوق کے لئے آواز اٹھائی نوائے وقت نے اسے ہمیشہ غدار، ایجنٹ قرار دیا اور کہا کہ ایسا کرنے سے ملکی وحدت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اپنی زبان یا حقوق کے لئے آواز اٹھانا کیا جرم ہے؟

o نہیں یہ پہلے تھا، اب تو میرے خیال میں نہیں ہے۔ تبدیلی آچکی ہے۔

☆ اگر پہلے ہوتا تھا تو اُس کا impact تو آج بھی ہے؟

o خیر اب تو سفر کافی آگے آچکا ہے۔ یہ باتیں فرسودہ ہوچکی ہیں۔ پنجاب میں بیٹھ کر پنجابی زبان کی بات کرنا بھی غداری قرار دیا جاتا تھا۔ میں نے حنیف رامے مرحوم

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے خلاف اسی حوالے سے کئی اداریے دیکھے ہیں۔ ظاہر ہے یہ رویہ غلط ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں کچھ تبدیلی آچکی ہے۔

☆ ایک عام سندھی سے لیکر صحافی، دانشور اور سندھی سیاستدان تک سب کالا باغ ڈیم کے خلاف ہیں۔ اور جب نوائے وقت اس کی تعمیر پر زور دیتا ہے اور ایڈیٹر صاحب کہتے ہیں کہ کالا باغ ڈیم بنے گا تو پاکستان بچے گا۔ تو دوسرے صوبوں کے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچتی؟

o یقیناً ٹھیس پہنچتی ہے۔ یہ ذرا بحث طلب مسئلہ ہے۔

☆ اخبار اپنی رائے دے، دلائل سے قائل کرے، ماہرین کے بیان چھاپے۔ جو کالا باغ ڈیم کی مخالفت کرے اُس کو غدار تو قرار نہ دے؟

o آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ mis-informed ہیں یا اُن کی اطلاعات ناقص ہیں۔ اُن کو سمجھانا چاہیے لیکن یہ سوچ کہ پنجاب ہر چیز دوسرے صوبوں پر ٹھونسے اور اگر وہ نہ مانیں تو اُسکا مطلب ہے کہ وہ غدار ہیں، یہ تو بہت ہی غلط ہے۔

☆ آپ کا یقیناً دوسرے صوبوں کے صحافیوں سے واسطہ بھی رہتا ہوگا وہ کہتے ہیں کہ یہ پنجابی پریس ہے۔ اور یہاں صورتحال یہ ہے کہ پنجابی زبان اور کلچر کے حوالے سے کم از کم نوائے وقت جیسا ادارہ تو کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں؟

o یہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سندھی پریس والے میرے کافی دوست ہیں۔ جن میں قاضی اسلم صاحب بھی ہیں۔ وہ ہم پنجابیوں سے مذاق بھی کرتے ہیں۔ یہ ایک صحت مند سوچ ہے کہ صوبوں میں اُن کی زبان میں اخبار ہونا چاہئے۔ بدقسمتی سے یہاں پنجاب میں ہم نے ماں بولی کو فروغ ہی نہیں دیا۔ پنجابی پریس ہے ہی نہیں۔

☆ حمید نظامی نے تو پنجاب میں پنجابی کے فروغ اور اسے بطور ذریعہ تعلیم رائج کرنے کی حمایت کی تھی۔

o میں بھی اس بات کا حامی ہوں۔ مگر حمید نظامی اور مجید نظامی میں بہت فرق ہے۔

☆ مجید نظامی صاحب اور آپ کے درمیان جو تنازع ہے اُس حوالے سے آئے دن نوائے وقت میں کوئی نہ کوئی کالم چھپا ہوتا ہے۔ جبکہ عوامی سطح پہ آپ کا کوئی موقف

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سامنے نہیں آیا۔ اِن کالموں میں سے ایک کالم 10 اکتوبر 2010ء کو نوائے وقت میں افضل پرویز صاحب کا چھپا جو نوائے وقت کے پرانے ملازم ہیں۔ اُنھوں نے اُس میں لکھا جناب حمید نظامی کے بعد اِس کی ادارت جناب مجید نظامی کو سنبھالنا پڑی مگر تھوڑے ہی عرصے بعد جناب مجید نظامی نے نوائے وقت سے علیحدگی اختیار کر لی اور بیگم حمید نظامی نے نوائے وقت کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا حالانکہ نظامی صاحب نے مارشل لاء دور میں جس طرح اخبار کو زندہ رکھا اور کٹھن حالات کا مقابلہ کیا یہ ایک علیحدہ تاریخ ہے لہٰذا مجید نظامی صاحب نے باعزت طریقے سے علیحدگی اختیار کر کے جولائی 1969ء میں روزنامہ 'ندائے ملت' کا آغاز کیا۔

اِس دوران جناب مجید نظامی صاحب کو معلوم ہوا کہ نوائے وقت آخری سسکیاں لے رہا ہے۔ یہ سب کچھ ان کیلئے ناقابلِ برداشت تھا۔ ان کے بھائی کا لگایا ہوا پودا خشک ہو رہا تھا۔ جناب مجید نظامی نے فوری طور پر نوائے وقت کو لمیٹڈ ادارہ بنایا اور اپنی عقل و دانش سے تمام معاملات کو احسن طریقے سے حل کرتے ہوئے شعیب نظامی اور عارف نظامی صاحبان کی تحریری فرمائش پر جو کمپنی کے ایک ریزولیشن کی صورت میں تھی نوائے وقت کی صرف پیشانی اور پرنٹ لائن کو دو لاکھ پینتیس ہزار کی منہ مانگی قیمت پر خرید لیا اور نوائے وقت کی ندائے ملت لمیٹڈ کے تحت اشاعت کا آغاز کیا۔ بیگم حمید نظامی کے تمام اخراجات ادارے نے اپنے ذمے لے لئے اور عارف نظامی کو کندن بنانے کیلئے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور پھر یہ ادارہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ اِس ادارے کا یہ خاصہ رہا ہے کہ اِس نے اپنے کسی بھی ورکر کو ادارے سے نہیں نکالا اور اگر کسی نے استعفٰی دے دیا تو وہ لازماً منظور ہو جاتا تھا۔ اِس لئے بڑی سوچ بچار کے بعد استعفٰی پیش کیا جاتا تھا۔

اِس حوالے سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

o پچھلے تین مہینوں میں سینکڑوں لوگوں کو نوائے وقت سے نکال دیا گیا۔ اور کیوں نہ نکالا جاتا۔ میرے ہوتے ہوئے بھی کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں کھانا کھا کے آیا تو پتا چلا آج 20، آج 15، آج 25 آدمی ریٹائرڈ کر رہے ہیں۔ تو یہ کہنا کہ کسی کو نکالا نہیں جاتا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہ تو واقعاتی طور پر غلط بات ہے۔ سب سے بڑا ثبوت تو میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ مجھے نکالنے کی کوششیں ڈیڑھ دو سال پہلے شروع ہو گئی تھیں بالآخر اُنہوں نے شہباز شریف کو میرے پاس بھیجا کہ ''میں ایک سال کی تنخواہ لے لوں اور فارغ ہو جاؤں'' میں نے کہا! جی کس گناہ میں؟ تو اُنھوں نے مجھے بتایا کہ وہ کہتے ہیں۔ ''وہ صرف ایک ملازم ہے اور وہ اپنا ٹی وی چینل نکال رہا ہے''۔ میں نے کہا کہ جی میں ایسا کوئی کام نہیں کر رہا، آپ مجھے موقع دیں تا کہ میں اپنی وضاحت پیش کر سکوں۔ تو میں پھر مجید نظامی صاحب کے پاس گیا اور بڑے باادب انداز سے اُن سے عرض کیا۔ میں تو ایسا کوئی کام نہیں کر رہا۔ آپ کو مجھ سے کیا گلہ ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ جی نہیں آپ فارغ ہو جائیں اور پھر غصے میں آئے اور کہا۔ ''تم میرے بغیر کچھ بھی نہیں ہو، جو کچھ ہو میری وجہ سے ہو، تمہاری سوشل حیثیت بھی میری وجہ سے ہے گویا کہ اُن کی نظر میں میری صحافتی حیثیت بھی کوئی نہیں تھی''۔

مسئلہ یہ تھا کہ اُن کی لے پالک بیٹی اور جو عزیز ہیں، میسن روڈ مافیا، وہ سب وہیں پر رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ نوائے وقت پر قبضے میں عارف نظامی صاحب مزاحم ہوں گے کیوں کہ حمید نظامی کی اولاد ہیں لہٰذا اُن کو نکالے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ اگر میں کوئی ناکام آدمی ہوتا جس طرح کہ اِن کے ایک اور بھتیجے احمد کمال نظامی صاحب ہیں، جو چار لائنیں بھی نہیں لکھ سکتے۔ دو چار اِس قسم کے اورٹ پونچے ٹائپ وہاں ہوں گے۔ وہ قابلِ قبول ہیں۔ لیکن ایک ایسا آدمی جو لائق ہو وہ قابلِ قبول نہیں۔ ایک طرح سے میری کامیابی ہی میری سب سے بڑی نااہلی بن گئی۔ ایک دن کہنے لگے۔ آپ جنرل کیانی سے کیوں ملتے ہیں۔ میں نے کہا بھئی جنرل کیانی ایک صحافی کو بلاتا ہے، تو میں جاتا ہوں۔ میں خود بخود نہیں جاتا۔ یہ بھی اعتراض کرتے کہ آپ نواز شریف سے ملتے ہیں شہباز شریف سے ملتے ہیں۔ بھئی ملتا تھا تو ادارے کے لیے ملتا تھا اور اللہ کے فضل سے اُس ادارے سے باہر آنے کے بعد بھی ملتا ہوں۔ تو یہ بالکل غلط بات ہے کہ میں استعفیٰ دے کے آیا ہوں۔ مجھے باقاعدہ اُنھوں نے فارغ کیا۔ میں اِس پر زیادہ تبصرہ اِس لیے نہیں کروں گا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ یہ کیس عدالت میں ہے۔ باقی آپ نے تذکرہ کیا کہ میری والدہ نے کیا کیا؟ مجید نظامی صاحب انتہائی نالائق صحافی ہیں۔ اُنھوں نے اپنا اخبار 'ندائے ملت' شروع کیا۔ وہ اُن سے چل نہیں رہا تھا اور اُن کی حالت پتلی تھی۔ کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر کہا کہ اِکٹھے ہو جائیں، مجید نظامی صاحب نے کہا کہ میں عارف نظامی کو اپنے بیٹوں کی طرح آگے چلاؤں گا۔ اس بنیاد پر میں واپس آیا اور ہم اِکٹھے ہوئے، تحریری معاملات طے ہوئے۔ ان کو میں نہیں چھیڑوں گا کیوں کہ معاملہ کورٹ میں ہے۔

لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ انہوں نے مجھے تیس پینتیس سال خوب استعمال کیا۔ ایک میں نے اخبار نکال کے دیا، نوائے وقت کو میں نے کامیاب بنایا، وقت ٹی وی میں نے ان کو لگا کے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اِن کی بیٹی باہر سے پڑھ کر آ گئی ہے۔ مجھے کہنے لگے کہ اُسے تم سے بہتر انگریزی آتی ہے۔ میں نے کہا آپ کر لیں بھئی! یہ کہنا کہ میں اپنا اخبار نکالنے کیلئے الگ ہوا تھا، بالکل جھوٹ ہے۔ میں جب وہاں سے نکلا تو یقین جانیے کہ میرے پاس کچن چلانے کے پیسے بھی نہیں تھے اور اُنھوں نے میرے بقایا جات سے ایک پائی بھی نہیں دی۔ لیکن میرے اوپر خدا کا خاص فضل رہا۔ کہتے ہیں کہ جب اندھیرا ہو تو آپ کا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے لیکن میرا بہت لوگوں نے ساتھ دیا۔ اُس کا ثبوت یہ ہے کہ 25، 30 لوگ تو میرے ساتھ چھوڑ کر آ گئے۔ باقی لوگوں سے بھی میں ادارے کو خالی کر دوں، اگر کوئی وہاں اہل آدمی رہ گیا ہو تو۔ اللہ مجھ سے بڑا بول نہ بلوائے آج میں اردو اخبار نکالوں تو اِن کا بوریا بستر گول ہو جائے۔ یہاں میں کچھ لوگوں کا ذکر ضرور کروں گا جنھوں نے مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔ شکیل الرحمان صاحب نے مجھے اپنا اخبار آفر کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ سمجھیں 'جنگ' آپکا اپنا اخبار ہے، جو حکم کریں گے میں حاضر ہوں۔ اُنھوں نے مجھے موقع دیا اور میں وہاں کالم لکھ کر پروفیشنلی زندہ رہا۔ اپنے چینل پر بھی وہ مجھے بلاتے رہے، دیگر چینل بھی مجھے بلاتے رہے۔ جنرل کیانی کی کوئی ایسی بریفنگ نہیں جس میں آج تک مجھے نہ بلایا گیا ہوں۔ وزیر اعظم، صدر،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہاں تک کہ نواز شریف بھی مہربانی فرماتے ہیں۔ ماسوائے شہباز شریف صاحب کے کیونکہ وہ مجید نظامی صاحب سے بہت ڈرتے ہیں، باقی سب لوگوں نے میرے ساتھ مہربانی برتی۔

یہ باتیں تو تاریخ کا حصہ ہیں۔ آپ نے مجھے اقتباس پڑھ کر سنایا کہ وہ اپنا اخبار نکالنا چاہتا تھا اِس لیے علیحدہ ہوا۔ ایک تو معاف کیجئے گا، اِن لوگوں کو شرم نہیں آتی اپنے آپ کو پانچ وقت کا نمازی کہتے ہیں لیکن اتنا جھوٹ بولتے ہیں۔ میں آپ کو تحریری ثبوت دکھا سکتا ہوں جس میں میرا وہاں داخلہ بند کر دیا گیا۔ مجھے تو ایسے نکالا گیا جیسے دُودھ سے مکھی کو نکالتے ہیں۔ یہ نہیں کہ مجھے وہاں جانے کا بہت شوق ہے۔ آج بھی وہ میرا اِدارہ ہے۔ میرے باپ کا نام چھپتا ہے۔ میں ادارے کا شیئر ہولڈر ہوں، ڈائریکٹر ہوں۔ وہ ایک لیگل مسئلہ ہے۔ اُنکی بیٹی کہاں کی نظامی ہے۔ وہ تو جعلی نظامی ہے۔ ایک اور بات میں آپ کو بتاتا چلوں۔ مجھے ایک ہی کام آتا ہے۔ صحافت! صحافت میرے خون میں شامل ہے۔ میں حمید نظامی کا بیٹا ہوں اور یہ اخبار (Pakistan Today) میں نے پہلے سے پلان نہیں کیا ہوا تھا جس نے اللہ کے فضل سے ایک مہینے میں نیشن کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔ یہ باقاعدہ محنت کر کے کچھ سرمایہ ذاتی دوستوں سے حاصل کر کے شروع کیا گیا۔ کسی سیاسی آدمی کا اس میں ایک پیسہ بھی نہیں لگا ہوا۔

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو اخبار نکالنے کیلئے ایجنسیوں نے پیسے دیے ہیں۔ اِس میں کہاں تک سچائی ہے؟

○ آپ کو علم ہوگا اور کئی چینلز پر آپ نے دیکھا ہوگا مجھ سے زیادہ ایجنسیوں پر کوئی اٹیک نہیں کرتا۔ ایجنسیوں نے مجھے اِس لیے پیسے دیے کہ اخبار نکالوں اور اُن کو گالیاں دوں؟ مجھ پر دُوسرا الزام یہ بھی ہے کہ زرداری نے مجھے پیسے دیے ہیں۔ میرے لیے زرداری کا ایک آنہ بھی حرام ہے۔ چونکہ بینظیر سے میرا ایک ذاتی تعلق اور دوستی تھی جو اُن کے والد سے بھی تھی۔ تمام تر قباحتوں کے باوجود آصف علی زرداری نے وہ تعلق نبھایا اور اخلاقی طور پر میرا پورا ساتھ دیا۔ ایک اور بات سُن

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لیں میں اُن کے پاس نہیں گیا اپنا ڈکھڑا لے کے مجید نظامی صاحب گئے۔ کہ جی میں ملنا چاہتا ہوں اور جس کا آپ نے ذکر کیا ہے وہی کچا چٹھا بیان کیا۔ لیکن میں نہیں گیا کہ میرے اوپر الزام لگے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک دن شہباز شریف صاحب نے مُجھ سے پوچھا کہ ''جی سُنیا اے تسی زرداری کولوں اپنے کروڑ منگیا اے؟'' میں نے جواب دیا کہ میں نے نہیں مانگا لیکن موصوف گئے تھے۔ میں یہ بات نہ بتاتا لیکن چونکہ آپ نے ذکر کیا ہے تو آپ کو بتا دیتا ہوں، میں نے پہلے یہ بات صرف شہباز شریف سے کی ہے۔ زرداری صاحب نے مجھے لنچ پہ بلایا، میں نے اُن سے دن آن دن ملاقات سے گریز کیا تاکہ کوئی اِس قسم کی بات نہ نکلے، جس طرح آپ نے ایجنسیوں کا تذکرہ کیا۔ بہرحال جب زرداری صاحب مُجھ سے کہنے لگے ''بھئی آپ کے چچا آئے تھے میرے پاس''۔ میں نے کہا کہ اچھا جی! کیا کرنے آئے تھے؟ کہنے لگے ''ٹائم لے کر آئے تھے اور کہا کہ اُن کی والدہ نے مجھے اخبار بیچ دیا تھا اور یوں ہوا تھا، فلاں ہوا تھا وغیرہ وغیرہ''۔ ''اور میں نے اُن کو چائے بھی نہیں پوچھی'' یہ زرداری صاحب کہہ رہے ہیں۔ مجید نظامی کہنے لگے ''جناب صدر ایوانِ صدر میں چائے بھی نہیں ملتی''؟

تو اُن کی وہاں یہ عزت افزائی ہوئی، جس کا ذکر میں نے شہباز صاحب سے کیا اور وہ موٹر لے کر بھاگے بھاگے مجید نظامی صاحب کے پاس گئے۔ ظاہر ہے مجید نظامی صاحب کو یہ بات بری لگی ہوگی۔ لیکن بھائی میں تو اپنے والد صاحب کے نقشِ قدم پہ چلا ہوں۔ سیاسی لوگوں کا ایک آنہ بھی مجھ پر حرام ہے۔ اللہ کے فضل سے میرے ذاتی دوست اتنے ہیں کہ آج اگر میں چینل بھی کھولنا چاہوں تو وہ میرے ساتھ ہوں گے۔ ایک بات تو ہے، آپ کے سامنے یہ 'پاکستان ٹوڈے' پڑا ہوا ہے یہ کوئی نئی چیز مارکیٹ میں آئی ہے؟۔ جب میں نیشن میں تھا تو میں نے کہا چلو میں خوش اسلوبی سے الگ ہو جاتا ہوں، یہ میرا ہی لگایا ہوا پودا ہے، مجھے دے دیں۔ یہ تو عام سی بات ہے کہ لوگ کاروبار میں صلح صفائی سے الگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن 'کُچھ دو اور کُچھ لو' کی بنیاد پر، اگر آپ یہ کہیں کہ چالیس سال تک مجھے نچوڑ کر آپ سب کچھ پہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

'گھا' مار لیں اس لیے کہ آپ بہت چھوٹی ذہنیت کے مالک ہیں۔

میں بات کر رہا تھا نیشن کی، کہنے لگے چلو، میں نیشن دے دیتا ہوں پھر کہنے لگے ''نہیں، وہ اُس سے چلے گا نہیں۔ وہ اہل نہیں ہے'' ایک تو اُنھیں میری اہلیت پہ بہت زیادہ شک ہے۔ اصل میں وہ سمجھتے ہیں کہ ایک ادارے میں ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے اور وہ آدمی وہ خود ہیں۔

☆ شہباز شریف صاحب اِن کی اتنی پشت پناہی کیوں کرتے ہیں؟

o شہباز شریف پشت پناہی کیوں نہ کریں؟ ایک پورا اخبار اُنھیں ملا ہوا ہے جس طرح پیپلز پارٹی نے مساوات نکالا ہوا ہے۔ اِن کو ضرورت ہی نہیں ہے۔ شہباز شریف کی جس طریقے سے وہاں پبلسٹی ہوتی ہے، اُن کو اور کیا چاہیے؟

☆ 12 اکتوبر 2010ء کے نوائے وقت میں افضل پرویز صاحب کے کالم میں آگے چل کر مجید نظامی صاحب کا مؤقف یہ ہے کہ ''عارف نظامی صاحب کو ادارے نے فارغ نہیں کیا وہ خود ادارے سے علیحدہ ہوئے ہیں تاکہ وہ اپنا اخبار نکال سکیں۔ اُلحمدللہ اب انہوں نے اپنا اخبار نکال لیا ہے اور صحافت میں ایک نئے سفر کا آغاز کیا ہے۔ میری دعائیں ہمیشہ عارف نظامی کے ساتھ ہیں۔ میں نے پیش کش کی تھی کہ میں اب ذرا کچھ آرام اور سکون چاہتا ہوں آپ کو جس طرح چالیس بیالیس سال ٹرینڈ کیا ہے، اِس طرح اب آپ رمیزہ بہن کے ساتھ مل کر کام کریں اور اُنھیں ٹرینڈ کریں۔ جس کا جواب اُنھوں نے بڑی رعونت کے ساتھ دیا اور ایک خط لکھ کر واک آؤٹ کر گئے جو نہ کوئی اپنے چچا کو لکھ سکتا ہے نہ ہی اپنے ایمپلائر کو۔ وہ خط قابلِ اشاعت نہیں۔ بہت سے سینئر صحافیوں کی نظر سے گزر چکا ہے۔ جو استعفیٰ کے برابر تھا۔ لیکن ایسا استعفیٰ نہ کسی نے دیکھا ہوگا نہ کسی نے سنا ہوگا''۔

ایک اور کالم جو نوائے وقت میں 7 نومبر 2010ء کو پروفیسر نعیم قاسم نے لکھا:

''صحافت کی دُنیا کی وہ دیو قامت ہستیاں جنھیں مجید نظامی اور نوائے وقت نے اپنے سینے سے لگا کر سینچا۔ آج وہ سیم وزر کے پہاڑوں پر کھڑے خبطِ عظمت کے شکار ہو چکے ہیں اور اپنی شناخت مجید نظامی صاحب کے مقابل پیدا کرنے کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آرزومند ہیں۔ جناب مجید نظامی کبھی کبھار سوچتے ہیں۔

میرے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھر کے صنم
آج بت خانے میں بھگوان بنے بیٹھے ہیں''

O دیکھیں اب میرے پاس بھی اخبار ہے۔ میں جو چاہوں اس میں رطب و یابس چھاپتا رہوں۔ اپنی تعریف میں کالم چھپوانا چاہوں تو بھی لکھوا سکتا ہوں۔ لیکن بات یہ ہے کہ مجھے اپنے بارے میں کوئی احساسِ کمتری نہیں۔ اور میرے آئیڈیل میرے والد ہیں مجید نظامی نہیں، مجھے ایسے بتوں کے پیچھے جانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ میں تو اِس بحث میں پڑنا ہی نہیں چاہتا۔ جہاں تک اُنکی بیٹی کا تعلق ہے، وہ تو وہاں ایک ایجنڈے کے تحت ہے۔ میں نے کوشش کی کہ اُن کو ساتھ لے کے چلوں یا اُن کے ساتھ چلوں۔ ادارہ نوائے وقت اتنا بڑا ہے کہ اُس میں وہ بھی سما سکتی تھیں اور میں بھی۔ میں نے آج تک مجید نظامی صاحب کو کسی معاملے میں نہ نہیں کہا۔ میرا خیال ہے کوئی اولاد اپنے والدین کی اتنی خدمت نہیں کر سکتی جتنی میں نے کی۔ لیکن اگر ان کا سافٹ وئیر ہی خراب ہو تو میں کیا کروں؟ جھوٹ کا جواب میں کیا دوں۔ وہ یہ ٹھیک کہتے ہیں کہ میں نے اُن کو خط لکھا۔ اصل میں ہوا یہ، جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں۔ تین مہینے تک شہباز شریف میری طرف آتے رہے یا میں اُنکی طرف جاتا رہا۔ وہ کہتے رہے کہ آپ فارغ ہو جائیں اور اخبار چھوڑ دیں۔ آپ صرف ایمپلائی ہیں۔ جب وہ ساری کوششیں ناکام ہو گئیں تو شہباز شریف میرے پاس آئے اور اُنھوں نے کہا کہ مجید نظامی صاحب کہتے ہیں میں خود ہی اُن سے بات کر لوں گا۔ ایک روز میں دفتر آیا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ میرا دفتر میں آخری دن ہے۔ اُنہوں نے مینجمنٹ کے دو تین لوگوں کو میرے پاس بھیجا جنھوں نے کہا کہ آپ سے حساب لینا ہے اور فارغ کرنا ہے۔ میں مجید نظامی صاحب سے ملنا چاہ رہا تھا جب صورتحال کا علم ہوا تو پھر نہیں ملا اور پھر اپنے وکیل سے مشورے کے بعد بڑے مؤدب انداز میں ترتیب وار اپنا grievance letter لکھا۔ انھیں اگر بہت شوق ہے تو وہ خط میں پاکستان ٹوڈے میں چھاپ بھی سکتا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ قاری کو اُس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اور ویسے بھی میں اپنا کچا چٹھا، کیوں بیان کروں جس طرح وہ کرتے رہتے ہیں۔ شہباز شریف گواہ ہیں اُن سے پوچھیں میں نے استعفیٰ دیا تھا یا اُنھوں نے مجھے فارغ کیا؟

اصل کھیل یہ تھا کہ میسن روڈ مافیا اپنی بیٹی کے ذریعے اِدارے پر قابض ہونا چاہتا تھا اور مجھے وہ اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے تھے۔ بیگم مجید نظامی پہلے فوت ہو گئیں تو انھیں اپنا کھیل بگڑتا ہوا نظر آیا، اُن کے ذہن میں یہ تھا کہ مجید نظامی پہلے روانہ ہو جائیں گے تو ہمارا سارا منصوبہ کامیاب ہو جائے گا پھر ہم آسانی سے سب کچھ ہڑپ کر جائیں گے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بیگم مجید نظامی پہلے فوت ہو گئیں تو اُنھوں نے مجھے نکالنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ اصل میں یہ ہے ساری کہانی!

مجید نظامی

مجید نظامی مختصر علالت کے بعد 26 جولائی 2014ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ وہ ایک طویل اور کامیاب صحافتی کیریئر کے مالک تھے۔ جہاں ان کے نظریات اور طرزِ صحافت کے شیدائیوں کی کمی نہیں، وہیں ایک بڑا حلقہ ان کا ناقد بھی رہا ہے۔ لیکن تمام فکری اختلافات کے باوجود اُنھیں دنیائے صحافت کی عہد ساز شخصیت کے طور پہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ انٹرویو 25 جنوری 2011ء کو اُن کے دفتر میں ریکارڈ کیا گیا۔

ان کے ساتھ ہوئی اس یادگار گفتگو کے دوران کافی اور بسکٹس بھی چلتے رہے۔ ایک دلچسپ صورتِ حال تب پیدا ہوئی جب مرحوم نے اچانک سوال کر دیا کہ: ''چلیں میں آپ سے پوچھتا ہوں آپ محب وطن پاکستانی ہیں یا کہ لبرل، سیکولر؟''

راقم نے جواب دیا کہ میں تو دھرتی کا بیٹا ہوں۔ اس دھرتی کو آباد کرنے میں میرے بڑوں کا خون شامل ہے اور اس دھرتی کا سینہ چیر کر اناج اُگانے والوں میں شامل ہوں لہٰذا مجھ سے زیادہ محب وطن کون ہو گا؟

انٹرویو:

س: نظامی صاحب نوائے وقت کا تحریک پاکستان میں جو کردار بیان کیا جاتا ہے کیا وہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مبالغہ آمیز نہیں؟ کیونکہ تحریک پاکستان کا زیادہ زور بنگال میں تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نوائے وقت بنگال میں جاتا تھا؟ دوسرا یہ کہ اُس وقت پڑھے لکھے لوگوں کی یہاں کتنی تعداد تھی جن پر نوائے وقت اثر انداز ہوتا؟

مجید نظامی: اِس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی پاکستان، مُسلم اکثریتی صوبہ تھا اور مسلم لیگ 1906ء میں قائم بھی وہیں ہوئی لیکن یہ کہنا کہ پاکستان بنگال نے بنایا تھا، مناسب نہیں۔ تحریک پاکستان پورے ہندوستان میں چلی، بمبئی سے لے کر خیبر تک۔ حضرت قائداعظم کا تعلق بھی بمبئی سے تھا اور وہ ہندوستانی مسلمان تھے۔ پہلے 1930ء میں علامہ اقبال نے اپنا تصور پیش کیا اور 1940ء میں اُس تصور کے مطابق قراردادِ پاکستان پاس ہوئی۔ اُس وقت نئی مملکت پاکستان کا نام سامنے نہیں آیا تھا لیکن ⑫ نوں کے لئے ایک علیحدہ مُلک کا تصور موجود تھا۔ معروضی صورتحال یوں تھی کہ 1940ء میں دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے انگریز کمزور ہو کر ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مسلمانوں کا مؤقف تھا کہ انگریز کے جانے سے پہلے ہندوستان تقسیم کر کے جائیں۔ لیکن یہ بات انگریز مانتا تھا نہ ہندو۔ مگر قائداعظم نے اپنے مضبوط مؤقف سے مسلمانانِ ہند کیلئے علیحدہ مملکت کا مطالبہ ہندو اور انگریز کو بھی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن دونوں نے عیاری سے ایک کٹا پھٹا پاکستان بنا دیا۔ ہم پورا بنگال مانگتے تھے اُنھوں نے آدھا دیا۔ ہندو بنگال علیحدہ ہو گیا۔ مشرقی پنجاب علیحدہ ہو گیا۔ سلہٹ، بلوچستان اور سرحد میں ریفرنڈم ہوا۔ بلوچستان نے ووٹ کے ذریعے یا سمجھیں وہاں کے سبھی سرداروں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ سرحد میں غفار خاں جو سرحدی گاندھی کہلاتے تھے اور قیامِ پاکستان کے سخت خلاف تھے اُنھوں نے وہاں ریفرنڈم کا مطالبہ کیا مگر وہاں کے لوگوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی اُنھوں نے پاکستان میں دفن ہونا پسند نہیں کیا بلکہ جلال آباد میں دفن ہوئے۔

پنجاب میں ریفرنڈم وغیرہ تو نہیں ہوا تھا مگر اُس وقت یہاں یونینسٹ، ہندو اور سکھ ووٹ سے اقتدار میں تھے اور خضر حیات ٹوانہ قیامِ پاکستان کے سخت خلاف تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسمبلی کے انتخابات میں اُنھیں شکست ہوگئی تو وہ سرگودھا میں جا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اور جہاں تک سندھ کا تعلق ہے وہ بھی قائداعظم کا ہی صوبہ تھا۔ وہاں جی ایم سید قیامِ پاکستان کے سخت مخالف تھے اور اپنے آپ کو سندھی قوم پرست کہتے تھے۔

☆ جی ایم سید نے تو پاکستان میں شامل ہونے کے لیے قرارداد پیش کی تھی؟

○ پہلے قرارداد پیش کی مگر بعد میں خلاف ہو گئے لیکن اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان بن کر رہا۔ اب آتے ہیں تحریکِ پاکستان میں اخبارات کے کردار پر۔ اُس وقت تو یہاں ایک اخبار ''ڈان'' تھا جو دہلی سے نکلتا تھا اور اِسے قائداعظم نے نکالا تھا پاکستان بنتے ہی یہ اخبار کراچی آ گیا۔ اور کوئی ایسا چکر چلا کہ ٹرسٹ کی بجائے اِس پر ایک لمیٹڈ کمپنی نے قبضہ کر لیا اور یہ ہارون فیملی کا پرچہ بن کر رہ گیا۔ لاہور سے نوائے وقت کا اجرأ 1940ء میں ہوا۔ اِسی طرح زمیندار، شہباز اور احسان نام کے اخبارات تھے۔

میں نے ایم اے سیاسیات پنجاب یونیورسٹی سے کیا ہے۔ میں نے اپنا تھیسز ''پریس اِن پاکستان'' کے موضوع پر کیا تھا جس میں حقائق کی روشنی میں استدلال کے ساتھ ثابت کیا کہ زمیندار، احسان اور شہباز اُس وقت کی گورنمنٹ آف پنجاب کے پے رول پر تھے۔ یہ بات میں نے پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈ سے ثابت کی۔ جہاں تک نوائے وقت کا تعلق ہے اس کا پہلا شمارہ 23 مارچ 1940ء کو پندرہ روزہ کے طور پر نکلا۔ میرے برادر اکبر حمید نظامی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب کے بانی صدر تھے اور دفتر بھی ہمارے گھر میں تھا۔ اِس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نوائے وقت کا کیا کردار ہو سکتا تھا۔ یہ پرچہ 1940ء میں ویکلی ہوا اور 1944ء میں اسے روزنامہ بنا دیا گیا۔ اِس اخبار نے اپنے آپ کو آزاد رکھتے ہوئے خود کو تحریک پاکستان کے لئے وقف کر دیا۔ اُس وقت اُردو کا واحد پرچہ تھا جس نے صحافتی میدان میں تحریک پاکستان کا ساتھ دیا، رہنمائی اور قیادت کی۔

اسلامیہ کالج لاہور، علی گڑھ اور پشاور یونیورسٹی میں ایم ایس ایف نے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تحریک پاکستان کے ہراول دستے کا کام کیا۔ چونکہ پنجاب میں ایم ایس ایف کے بانی صدر حمید نظامی مرحوم تھے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تحریک پاکستان میں ایم ایس ایف اور نوائے وقت کا کیا کردار رہا ہوگا۔ آپ کا جو سوال ہے کہ کیا تحریک پاکستان میں نوائے وقت کا کردار مبالغہ آمیز نہیں؟ تو میں یہ کہوں گا کہ یہ ناواقفیت ہے۔ بلکہ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو یہ احمقانہ سوال ہے۔ اور آپ جیسے سکالر سے میں یہ توقع نہیں کرتا تھا کہ آپ پہلا سوال ہی ایسا کریں گے۔

☆ آپ اپنی تقریروں میں اکثر کہتے ہیں، ہندو بنیا، مکار، عیار، تو پاکستان میں لاکھوں ہندو آباد ہیں۔۔۔

o ہوتے رہیں۔۔۔

☆ سندھ میں ہندوؤں کا اثر ورسوخ بھی ہے۔ آپ کا ہندوؤں کے حوالے سے بڑا سخت مؤقف ہے۔ حمید نظامی صاحب کا 1952ء میں ایک مضمون ایک پنجابی رسالے میں چھپا جس میں انہوں نے لکھا:

''مینوں دلی جان دا اتفاق ہویا تے میں اپنے پرانے دوست نریندر جی مالک تے ایڈیٹر ''پرتاپ'' نوں ملن اوہناں دے گھر وی گیا''۔

یہ تو تھا حمید نظامی صاحب کا مؤقف۔ کیا آپ کے رویے سے پاکستان کی اقلیتیں Let down نہیں ہوتیں؟

o نظامی صاحب کے اگر کوئی ہندو دوست تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہندو نواز تھے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ 47,46ء میں جب پاکستان بن رہا تھا تو نوائے وقت کے ایک نیوز ایڈیٹر ہندو تھے۔ ایڈورٹائزمنٹ منیجر ایک ہندو تھا۔ اُس وقت معاشرہ اس قسم کا تھا کہ اگر آپ نے کام لینا ہے تو عیسائی، ہندو یا اور کوئی بھی ہو اُس سے آپ کام لے سکتے تھے۔ آج بھی میرے ادارے میں عیسائی بھی کام کرتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے تریسٹھ سالوں میں ہندو کو اپنا دشمن پایا ہے۔ ہندوؤں نے ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کو آج تک دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ پاکستان کو کمزور کرنے کا سوچتے ہیں۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مشرقی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پاکستان کو کس نے الگ کیا؟ کتابیں پڑھ لیجئے مکتی باہنی ہندو فوج تھی جو بنگالیوں پر مشتمل تھی جسے مسلمان بنا کر پیش کیا گیا۔ اب جو بھی کتابیں آ رہی ہیں اُن میں یہ ہندو مان رہے ہیں کہ یہ سب اُنھوں نے کیا۔ اُس وقت بھی مسلمانوں کی اکثریت علیحدہ نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن مجیب الرحمن ایک قسم کا پاگل بن چکا تھا اور وہ صرف قید کی وجہ سے پاکستان سے نفرت کر رہا تھا۔ گواہی نہیں ہے لیکن میرے سامنے رزق پڑا ہوا ہے۔ میں اُنھیں تب ملا جب وہ میانوالی جیل سے رہا ہو کر غلام جیلانی کے گھر آ کر ٹھہرے۔ میں نے اُنھیں کہا جناب اب الیکشن آنے والے ہیں تو آپ مشرقی پاکستان میں اکثریت میں ہیں اور آپ نے جو ماحول بنا دیا ہے وہاں عوامی لیگ کی اکثریت ہو گی تو یقیناً پاکستانی پارلیمنٹ میں بھی آپ کی اکثریت ہو گی۔ اب جو ہوا سو ہوا، اُسے بھول جائیں۔ آپ راولپنڈی آ کر پارلیمنٹ کے زور پر وزیر اعظم بنیں، حکومت کریں تاکہ جمہوریت رواں دواں ہو۔"

اُنھوں نے فرمایا "مجید صاحب آپ تو یہ کہہ رہے ہیں مگر فوجی جنرل مجھے برداشت نہیں کرتے، وہ مجھے حکومت نہیں کرنے دیں گے"۔ میں نے کہا اگرچہ میں آپ کی تحریک کے خلاف تھا، لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں نوائے وقت اکثریت کی بنا پر آپ کی حمایت کرے گا۔ بشرطِ کہ آپ کو اکثریت حاصل ہو۔ آپ کو پورا حق ہے کہ آپ وزیر اعظم بنیں اور تب تک حکومت کریں جب تک آپ کی اکثریت رہتی ہے۔ لیکن اُنھوں نے میری بات نہیں مانی۔

☆ نظامی صاحب آپ نے بنگلہ دیش بننے کی بات کی، آج اور پہلے بھی جب کبھی کسی صوبے کے لوگوں نے اپنی زبان یا صوبے کے حقوق کی بات کی تو نوائے وقت نے ہمیشہ اُسے صوبائی عصبیت قرار دیا اور n Condem کیا۔ بنگالیوں کا بنیادی مُطالبہ بھی تو یہی تھا کہ ہماری زبان کے حقوق اور معیشت میں حصہ دیا جائے۔ آپ کیا فرمائیں گے؟

o دیکھئے ٹھیک ہے یا غلط، حضرت قائداعظم نے ڈھاکہ میں فرمایا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہو گی۔ اُردو پاکستان کے کسی صوبے کی زبان نہیں تھی تو اِس سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ اندازہ لگائیں کہ انھوں نے کہا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہوگی تو میں یہ کہتا ہوں کہ بھئی جو اِس وقت پاکستان ہے اُس کی قومی زبان اُردو ہے۔ ہم آپس میں ملتے ہیں تو اُردو میں بات کرتے ہیں۔ ہمارے پنجاب میں اب ہر کلاس کے لوگ بچوں کے ساتھ اُردو میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور میرے خیال میں موجودہ پاکستان کی زبان اُردو ہی ہے۔ اب آپ پنجابی میں کوئی کتاب چھاپنا پسند کریں گے؟ پنجابی میں آپ سائنس پڑھ سکتے ہیں؟

کچھ لوگ کہتے ہیں فلاں ملک میں ایسے ہے۔ جاپان چین ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ پھر اُن کی زبانیں ترقی یافتہ ہیں۔ ہماری زبانیں نہیں 'بولیاں' ہیں۔ جیسے پنجابی یا سندھی ہے۔ کچھ لوگ جو متعصب ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے صوبے کی زبان پنجابی، سندھی یا بلوچی ہو۔ تو میں ایک پاکستانی کے طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ ہماری زبان اُردو اور صرف اُردو ہونی چاہیے، انگریزی بھی نہیں۔

☆ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بنگلہ دیش بننے میں یہ دو مطالبات بنیادی اہمیت کے حامل تھے: زبان کا حق اور معیشت میں حصہ؟

O یہ ایک بہانہ تھا۔ میں اُس زمانے میں CPNE اور APNS کا صدر تھا۔ اور میرا کئی بار مشرقی پاکستان جانا ہوتا تھا۔ مجیب، بھاشانی صاحب اور سہروردی مرحوم سے ملاقات رہتی تھی۔ اِسی طرح ہمارے بنگالی بھائی ایڈیٹر تھے جیسے مانک میاں ''اتفاق'' کے ایڈیٹر تھے، ظہور بھائی اور سندباد میاں صاحب پاکستان آبزرور کے ایڈیٹر تھے جو بعد میں کراچی آ گئے۔ تو ان سب لوگوں سے ملاقاتیں تھیں۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ بھئی، پہلے فیلڈ مارشل ایوب آ گیا، جس نے دس سال بھی ملک کو جمہوری نہیں رہنے دیا۔ اُس نے قائداعظم کا طرزِ حکومت ختم کر کے آمریت قائم کر دی۔ اُس کے بعد جب یحییٰ آئے تو بنگالی صاف مجھ سے کہتے تھے کہ ہمارا تو کوئی فوج میں جنرل نہیں ہے، تو پھر ہماری حکومت کرنے کی باری ہی نہیں آئے گی۔ لہٰذا ہم کس طرح ان کے ساتھ رہیں؟ صرف ایک خواجہ شہاب الدین کا بیٹا جنرل تھا جو بعد میں ریٹائر ہو گیا۔ ایک طرف یہ مسئلہ تھا اور دوسری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

طرف بھارت۔ وہ انھیں گمراہ کر رہا تھا کہ بھئی آپ آزادی حاصل کریں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے آزادی حاصل کرنے کے باوجود بنگالی بھارت کے شردھالو نہیں بنے نہ وہ اُن کے زیرِ اثر ہیں۔ وہ اُسی طرح بھارت سے آزاد اور اُسکے خلاف ہیں جس طرح پاکستان ہے۔

☆ 1951ء میں حمید نظامی کا پنجابی رسالے میں ایک مضمون چھپا۔ ''پنجابی دی ابتدائی تعلیم''، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ''اپنی مادری زبان نوں چھڈ کے یاں بھلا کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکدی'' اور آخر میں وہ کہتے ہیں ''چھوٹیاں بچیاں دی تعلیم اوہناں دی مادری زبان وچ ای ہونی چاہیدی اے''۔ آپ اس حوالے سے کیا فرماتے ہیں؟

o اس حوالے سے میں یہ کہتا ہوں کہ آپ نے ابھی انٹرویو سے پہلے عارف نظامی کا نام لیا تھا۔ حمید نظامی کے تین بیٹے تھے اور عارف منجھلے ہیں۔ اُن سے پوچھیے گا کہ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی تھی۔ سینٹ انتھونی میں پڑھے تھے ماشاء اللہ۔ تو وہاں پنجابی میں پڑھاتے ہیں؟ یا کہ اُردو انگریزی میں؟ اگر حمید نظامی صاحب غلطی کر رہے تھے یا غلط بات کہہ رہے تھے تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ میں اس پر چلوں؟ عارف صاحب سے پوچھ لیں کیا اُن کے بچے پنجابی میں پرائمری کر رہے ہیں؟ اُن کے بچے لندن پڑھ رہے تھے یا پڑھ رہے ہیں۔

☆ کالا باغ ڈیم کے حوالے سے آپ کا بڑا مضبوط مؤقف ہے۔ سندھ میں عام سڑکوں، نیشنل ہائی وے یا ریلوے اسٹیشن پر سائن بورڈ سندھی میں ہوتے ہیں۔ اُنکی ابتدائی تعلیم اور شناختی کارڈ تک بھی سندھی میں ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں سے ایک سندھی اخبار ''کاوش'' سوا لاکھ کے قریب چھپتا ہے اور وہاں کا عام آدمی بھی سندھی تو پڑھ لیتا ہے، اُردو پڑھ اور بول نہیں سکتا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ ''نوائے وقت'' ''جنگ'' یا دیگر اخبار بارہ ایک بجے سکھر پہنچتے ہیں، صرف روزنامہ ''ایکسپریس'' اڈّوں وغیرہ پر نظر آتا ہے دیہاتوں میں سارے سندھی اخبار پڑھے جاتے ہیں اور سندھ میں غلط یا صحیح ایک عام سندھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے لیکر دانشور، صحافی اور سیاستدان تک کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے خلاف ہے۔ جب آپ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے حق میں بات کرتے ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ پنجابی پریس ہمارے خلاف ہے؟

o آپ پنجابی زبان اور کالا باغ کو مکس کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کالا باغ ڈیم کا تعلق سندھ سے بالکل نہیں وہ میانوالی میں بنتا ہے۔ یہ سارا پانی بالآخر دریائے سندھ میں جائے گا اُن کی فصل بھی بڑھے گی۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے سارے دریا براستہ دریائے سندھ سمندر میں جا گرتے ہیں۔ پانی تو سمندر میں گرنے کے بجائے فصلوں کے کام آنا چاہیے۔ اگر کالا باغ ڈیم بنتا ہے تو ابتدائی طور پر دو صوبے فائدہ اُٹھائیں گے پنجاب اور فرنٹیئر۔ لیکن جب اسکا پانی آگے جائے گا تو سندھ بھی فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ لوگوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے کہ یہ منصوبہ سندھ کے خلاف ہے۔ سندھ کا زمینی یا جغرافیائی طور پر اس سے کوئی تعلق ہی نہیں تو اس پر انھیں اعتراض کرنے کا کیسے حق ہے؟ یہ صرف سیاست ہے۔ سیاست باز اپنا کام کر رہے ہیں اور اُن میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو قوم پرست سندھی کہتے ہیں۔

☆ آپ ''نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن'' کے چیئرمین بھی ہیں۔ وہاں کوئی تحقیق یا ریسرچ کا کام کیوں نہیں ہوتا مثلاً بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک کیوں ہے پاکستان کی قومی زبان کونسی اور کیوں ہونی چاہیے۔ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہاں ایک مافیا قابض ہے؟

o ''نظریہ پاکستان ٹرسٹ'' سارے پاکستان میں ایک واحد ادارہ ہے جو نئی نسل کو بتا رہا ہے کہ پاکستان کیوں، کس طرح اور کیسے بنا؟ ہم نے کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں اور کیا قیمت ادا کرنا پڑی؟ آج بھی وہاں ٹیچرز کی ورکشاپ تھی۔ ہم نے میاں شہباز شریف سے درخواست کی تھی کہ آپ تحریکِ پاکستان کو نصاب میں شامل کریں۔ نظریہ پاکستان اور تحریکِ پاکستان ایک ہی چیز ہے۔ یہ حضرت قائداعظم کا فرمان ہے کہ نظریہ پاکستان، گو کہ اس وقت یہ نام نہیں تھا، دو قومی نظریہ تھا جو اَب ''نظریہ پاکستان'' بھی ہے اور دو قومی نظریہ بھی ہے، اُسی وقت معرضِ وجود میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آ گیا تھا جب اِس برّ اعظم میں پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن ایک مافیا ہے، بڑی سخت زیادتی، لاعلمی اور جہالت ہے۔ ہم دس لاکھ بچوں کو اب تک وہاں بتا چکے ہیں کہ پاکستان کیوں اور کس طرح بنا۔ آپ کبھی وہاں جائیں اور اُن سے لٹریچر طلب کریں۔ وہ آپ کو دو چار درجن کتابچے اور کتابیں پیش کر دیں گے۔

☆ آج پاکستان کے کیا مسائل ہیں اور انھیں ہم کیسے حل کریں؟ کیا اِس حوالے سے آپ کے ٹرسٹ میں کوئی کام ہو رہا ہے؟

○ اِس حوالے سے ہم کہتے ہیں کہ پاکستان کو اقبال اور قائد کے تصورات کے مطابق اسلامی، جمہوری اور فلاحی ریاست بنا دیں۔ 'فلاحی' پر زور ہے، اسلام کا فلاحی نظام کہتا ہے کہ عوام کو روٹی، صحت اور تعلیم دو، ان امور پہ اُنھیں پیسہ نہ خرچ کرنا پڑے۔ یہ سب باتیں وہاں ہوتی ہیں اور یہی بات اہم ترین ہے۔ جہاں تک مہنگائی کا تعلق ہے ہمارے وائس چیئرمین، اکنامکس میں پی ایچ ڈی ہیں اور وہ اپنے خیالات وہاں پیش کرتے ہیں۔

آپ وہاں کسی وقت چھاپہ ماریں اور دیکھیں کہ بلا مبالغہ، سو، دو سو، تین سو طلبا و طالبات وہاں آتے ہیں۔ ہماری تصویروں کی گیلری پاکستان میں سب سے بڑی ہے جس میں مختلف ادوار اور لیڈروں کی تصاویر ہیں۔ سرسید اور قائداعظم سے لیکر سب موجود ہیں۔ طلباء پہلے تصویروں کی یہ گیلری دیکھتے ہیں پھر ہم اُنھیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لیکچر دیتے ہیں۔ سوال و جواب کا سیشن بھی ہوتا ہے۔

☆ عارف نظامی صاحب کہتے ہیں کہ "آج کے نوائے وقت کی حمید نظامی کے نوائے وقت سے کوئی نسبت نہیں اور آج کا نوائے وقت جہالت پروموٹ کر رہا ہے"۔

○ دیکھیے اگر اسلام، نظریۂ پاکستان، دو قومی نظریہ جہالت ہے تو جس شخص نے یہ بات کہی ہے میں اُسے جہالت کا بادشاہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ آپ خود کیا سمجھتے ہیں؟ نوائے وقت کی پالیسی تریسٹھ سال کا تسلسل ہے یا جہالت ہے اگر یہ جہالت ہے تو تریسٹھ سال پہلے بھی جہالت تھی۔ 42 سال اُنھوں نے یہاں ملازمت کی۔ وہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جہالت کے دور میں کیوں رہے؟ یہاں سے نکل کیوں نہیں گئے؟ عارف صاحب کے بارے میں میں کوئی بدزبانی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جو شخص حمید نظامی کا بیٹا ہوتے ہوئے 'امن کی آشا' کی بات کرے میں اُس کے بارے میں سیاسی طور پر کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ اُنکے پرچے کا کوئی شمارہ دیکھ لیں۔ آج کا ہی دیکھ لیں آپ کو کوئی نہ کوئی ایسی چیز مل جائے گی جس پر آپ بطورِ محب وطن پاکستانی ضرور اعتراض کریں گے۔

☆ اخباروں میں کالم بھی لکھے گئے اور ویسے بھی خبریں آئیں کہ آپ کی زیرِ سرپرستی نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن نے مجلس ترقی اُردو ادب کی مُلحقہ زمین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُس وقت کے سیکرٹری انفارمیشن اور یا مقبول جان جب مزاحم ہوئے تو اُن کا بھی ٹرانسفر کر دیا گیا، آپ اس حوالے سے کیا فرمائیں گے؟

o نظریۂ پاکستان کی تعلیم نہایت ضروری ہے تبھی پاکستان قائم رہ سکتا ہے۔ اگر آپ ہندوستان کے شردھالو بن جائیں کہ بھارت ہمارا پڑوسی ہے، دوست ہے اسکے ساتھ تجارت ہونی چاہیے اُسکے ساتھ لین دین ہونا چاہیے۔ وہاں سے آرٹسٹ بھی آنے چاہئیں تو خدانخواستہ پاکستان نہیں رہے گا۔ وہ پاکستان کو اس طرح ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ''کشمیر ہماری شہ رگ ہے'' یہ قائدِ اعظم کا فرمان ہے۔ ہمارا سارا پانی وہاں سے آتا ہے کچھ دریائے ستلج، بیاس وغیرہ پہلے ہی 'فیلڈ مارشل' اُنکے حوالے کر گئے تھے۔ باقی راوی، جہلم، پر وہ 70 یا 76 ڈیم بنا رہے ہیں۔ اگر وہ خدانخواستہ اسی طرح ڈیم بناتے رہے اور اُن کا ہاتھ ہم نے سختی سے نہ روکا تو میں دعویٰ سے کہتا ہوں، پاکستان پندرہ بیس سال میں ریگستان میں تبدیل ہو جائے گا۔ اِسی لیے تو میں یہاں تک کہتا ہوں ہمیں ایک ایٹمی قوت ہوتے ہوئے وہاں ایک میزائل مار کے یہ ختم کر دینا چاہیے کہ لالہ جی باز آجاؤ ورنہ میزائل آرہا ہے۔

☆ آپ کا یہ بھی مؤقف ہے کہ ہمیں انڈیا سے جنگ کرنی چاہیے اور ہمیں ہر وقت جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اگر ہم دلی پر ایٹمی حملہ کرتے ہیں تو کیا اُس کا اثر ہم پر نہیں ہوگا؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o ہم پہ اثر یہ ہوگا کہ وہ ہم پر ایک بم مار سکتے ہیں۔ سب سے پہلا بم امریکہ نے جاپان میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر مارا۔ دو بم مارے اور دونوں شہر تباہ ہو گئے۔ جاپان ختم ہوگیا یا ہے؟ جاپان امریکہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ نائن الیون سے پہلے میں ہر سال امریکہ جایا کرتا تھا۔ اُس کے بعد میں نے وہاں جانا بند کر دیا ہے کیونکہ اب وہ آپ کے کپڑے اُتر واتے ہیں، آپ کی بے عزتی کرتے ہیں۔ وہاں کی مارکیٹ جاپانی چیزوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر شہری خواہ امریکی ہو یا پاکستانی ایسی چیز خریدنا چاہتا ہے جو مہنگی نہ ہو، ارب پتی لوگوں کی بات اور ہے۔ آپ دیکھیں گے اِس کے باوجود جاپان نے ترقی کی ہے اور ایسی کہ جو امریکہ سے بہتر ہے۔

☆ آپ نے انڈیا سے جنگ کی بات کی تو ہمیں ہسٹری کو دیکھنا پڑے گا۔ 1965ء میں چلیں ہم کہتے ہیں کہ ہمیں جیت ہوئی اور پوری قوم نے جوش اور جذبے سے حصہ لیا۔ 1971ء میں جنگی قیدیوں کی تعداد 90 ہزار بیان کی جاتی ہے، جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اُسکے بعد ہم نے کارگل میں جو مہم جوئی کی کوشش کی اُس میں بھی ہمیں نقصان اُٹھانا پڑا۔ تو کیا جنگ کی یہ حکمتِ عملی بہتر ہوگی؟ بجائے اسکے ہم اپنی اکانومی بہتر کریں، پہلے بہتر ⓘ ن ہو جائیں اور پھر ہم حملے کے بارے میں سوچیں؟ جس طرح آپ کہہ رہے ہیں اس طرح جنگ کرنے سے ہم بالکل تباہ و برباد نہیں ہو جائیں گے؟

o لیکن اگر آپ انھیں جنگ کی دھمکی نہیں دیتے تو پیشتر اسکے کہ آپ مہنگائی اور دیگر چیزیں دور کریں، میں کہہ رہا ہوں کہ آپ ریگستان بن چکے ہونگے۔ آپ لیبیا یا صومالیہ بننا چاہتے ہیں یا بھارت کے ساتھ دوستی؟ وہ جو مرضی کرے لیکن ہم اُسکے ساتھ دوستی کریں، پیار کریں، محبت کریں اُور اُن کے ساتھ لڑائی نہ کریں بلکہ آپ تو کہتے ہیں کہ لڑائی کی دھمکی بھی نہیں دینی چاہیے۔

☆ آپ کے اخبار میں آپ کے حوالے سے بھی بے شمار کالم چھپتے ہیں اور آپ خود بھی کہتے ہیں کہ میں نے ہر جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہا مگر عارف نظامی صاحب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہتے ہیں کہ ایوب کے زمانے تک تو حمید نظامی مرحوم کی پالیسی جاری رہی بعد میں یہ سب الف لیلہ کے قصے ہیں؟

o اگر یہ الف لیلہ کے قصے ہیں تو اخبار کی فائلیں موجود ہیں، جس طرح آپ مجھے حمید نظامی صاحب کی پنجابی کوٹیشن سنا رہے تھے، کوئی میری بھی کوٹیشن سنا دیں۔ ضیاء الحق، یحییٰ، پرویز مشرف یا کسی کے حوالے سے۔

☆ عارف نظامی صاحب کہتے ہیں کہ آپ پرویز مشرف کے نمائندے بن کر نواز شریف کے پاس گئے اور نواز شریف نے بہت بُرا منایا جب آپ نے کہا کہ سترھویں ترمیم مان لیں، شہباز شریف کو پاکستان بھیج دیں اور آپ لندن جا کے برگر کھائیں؟

o بالکل بکواس ہے کوئی ایسی بات ہی نہیں۔ پرویز مشرف نے تو مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر یہ کہا کہ "You are more Sharif than the sharifs" میں نے کہا کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ آپ جھوٹ اور ایک اختراع کے طور پر یہ بات کر رہے ہیں۔ پرویز مشرف نے ایڈیٹرز سے ایک میٹنگ کی۔ میں پرویز مشرف کیساتھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ کچھ ایڈیٹر اُسکی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ یہ ریکارڈ کی بات ہے۔ آپ کسی سے پوچھ لیجئے گا جو اُس زمانے میں ایڈیٹر تھا۔ پرویز مشرف نے مجھے کہا نظامی صاحب آپ خاموش ہیں۔ میں نے کہا ''جنرل صاحب آپ مجھے خاموش ہی رہنے دیں''۔ کہنے لگے ''نہیں بتایئے آپ کی کیا رائے ہے؟'' میں نے کہا ''جناب نے بُش نہیں پاول کی ایک کال پر سرنڈر کر دیا ہے''۔

تو کہنے لگا ''سرنڈر؟''

میں نے کہا ''یس سرنڈر۔''

تو ایک فوجی جنرل سرنڈر کا لفظ سن کر کرسی پر اُچھل بیٹھا۔ میٹنگ ختم ہونے سے پہلے وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟''

میں نے کہا کہ ''جناب میں اپنا کام کر رہا ہوتا۔ اگر آپ بھی میری طرح اپنا کام کر رہے ہوتے تو آپ کو یہ مشکل پیش نہ آتی یعنی آپ فوجی جنرل ہوتے، حکمران نہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بنتے"۔

میٹنگ ختم ہوئی تو اُن کے سیکرٹری طارق عزیز صاحب میرے ساتھ چلنے لگے۔ کہنے لگے "آپ ہمارے جنرل صاحب سے کیسی باتیں کر رہے تھے" میں نے کہا کہ آپ کون ہیں؟ حالانکہ مجھے پتہ تھا کہ طارق عزیز ہے کہنے لگا کہ میں طارق عزیز ہوں۔ میں نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔

وہ اُنھی قدموں پر رُک گیا اور واپس جا کر اُس نے اُن کے کان بھرے۔ یہ بات عارف نظامی صاحب سے بھی پوچھے گا۔ کیا اُنھوں نے ہی آ کر مجھے یہ پیغام نہیں دیا تھا کہ مشرف کہتا ہے۔ تمہارے انکل نظامی صاحب۔

"He is an arrogant person. I have decided not to invite him into any of my meeting or any briefing." اِسی جگہ جہاں آپ بیٹھے ہیں یہاں بیٹھ کر یہ پیغام عارف نظامی صاحب نے آ کے مجھے دیا۔ کوئی دو تین مہینوں کے بعد اُس وقت کے گورنر خالد مقبول کا مجھے فون آیا۔ ابھی وہ حیات ہیں، اُن سے جا کر پوچھ لیں۔ وہ کہنے لگے نظامی صاحب صرف آٹھ دس لوگ ہوں گے۔ جنرل صاحب آ رہے ہیں تو اُس لسٹ میں آپ کا نام بھی ہے میں نے کہا "آپ کو پتہ ہے انہوں نے اپنی کسی میٹنگ یا بریفنگ میں مجھے نہ بلانے کا پیغام بھجوایا ہے؟"

وہ کہنے لگے "آپ اُس پیغام کو بھول جائیں" میں نے کہا "میں کیسے بھول جاؤں؟ اگر مجھ میں ذرا بھی انا ہے تو میں اُس پیغام کو نہیں بھول سکتا، میں نہیں آ سکتا۔ معذرت چاہتا ہوں۔" کہنے لگے میں آپ کو تھوڑی دیر بعد فون کرتا ہوں۔ اُن کا دوبارہ فون آیا کہنے لگے بات ہو گئی ہے۔ میری تسلی ہو گئی ہے کوئی Embarrassing بات نہیں ہو گی۔

میں نے کہا معاف کیجئے Embarrassing بات تو میری طرف سے ہونی تھی اگر میں جاتا تو۔ میں معافی چاہتا ہوں، میں اس میٹنگ میں نہیں آ سکتا۔

تو عارف صاحب نے پتہ نہیں یہ کیا کہانی سنائی ہے کہ میں نواز شریف کے پاس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گیا۔ یہ گیا وہ گیا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ نواز شریف کے پاس جائیں اُس سے پوچھیں ایسی کوئی بات ہوئی؟

☆ میرے پاس نوائے وقت میں چھپنے والا کالم بھی موجود ہے جس میں آپ کا مؤقف بھی چھپا کہ عارف صاحب نے خود استعفیٰ دیا۔ وہ خود یہاں سے گئے ہیں کیونکہ وہ اپنا اخبار شروع کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ وہ کہتے ہیں کہ میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا اور مجید نظامی، حمید نظامی کی اولاد کے خلاف بُغض رکھتے ہیں اور آج بھی اُنکا نوائے وقت کی بلڈنگ میں داخلہ ممنوع ہے۔ آپ اس حوالے سے کیا فرماتے ہیں؟

o دیکھئے یہ بزنس ٹیبل ہے۔ ادھر قرآن بھی رکھے ہیں اور یہ رزق پڑا ہے (ٹیبل پہ رکھی کافی اور بسکٹس کی طرف اشارہ کرکے) جو بات آپ سے کروں گا سو فیصد حقیقت ہوگی۔ اور واقعہ یہ تھا کہ میری بیٹی لندن سے پولیٹکل سائنس میں بیچلرز کرکے واپس آئی۔ اُس نے کہا "بابا میں کیا کام کروں"؟ میں نے کہا تمہاری انگریزی تعلیم کے حساب سے اُردو صحافت تمہارے بس کا روگ نہیں۔ نوائے وقت کے بجائے، تم نیشن میں کام کرو۔ میں عارف صاحب سے بات کروں گا۔ وہ کہنے لگی میرا خیال ہے کہ "I'm not wanted there" کیونکہ میں جب وہاں جاتی ہوں تو اُن کا موڈ آف ہوجاتا ہے۔ میں نے کہا بھئی اُس کے بغیر گزارہ نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اس سلسلہ میں عارف سے بات کی کہ بھئی میں نے تمہیں چالیس سال پالا پوسا، ٹریننگ دی، پرموٹ کیا، اے پی این ایس کا صدر بنوایا۔ تم رمیزہ کو اُسی طرح اپنی نگرانی میں ٹریننگ دو اور دونوں مل کر یہ ادارہ چلاؤ۔ یہ بات سننا تھی تو بڑی رعونت سے کہنے لگا کہ "آپ سٹاف کو تماشا دکھانا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا "یار میں آپ سے کیا بات کر رہا ہوں اور آپ مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں"۔ وہ جناب اُٹھے اور بغیر کوئی بات کیے باہر نکل گئے۔ He just walked out پیر کو ہماری نوائے وقت اور نیشن کی مشترکہ ایڈیٹوریل میٹنگ ہوتی تھی تاکہ صحافت میں تھوڑی سی جہالت بھی ملا دی جائے اور اُنکا قبلہ درست رہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل وہ کیا کر رہے ہیں۔ اُنکا پرچہ ملاحظہ کریں۔ آج کا ہی دیکھیں ذرا۔ تو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں نے نوٹ کیا کہ وہ میٹنگ میں نہیں آئے۔ پھر میں نے جنرل منیجر اور چیف اکاؤنٹنٹ کو بلایا اور کہا کہ اوپر جا کر دیکھیں کہ وہ موصوف کیوں میٹنگ میں نہیں آئے۔ انھوں نے آ کے بتایا کہ ہم گئے تو وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ہمیں بیٹھنے کی دعوت بھی نہیں دی اور دفتر سے نکل گئے۔ البتہ ایک لفافہ ریسپشنسٹ کو دے دیا۔ جو میرے نام اُنکا خط تھا، وہ بھی ایسا جو نہ کوئی اپنے چچا کو لکھ سکتا ہے جسے وہ چالیس سال اپنے باپ کی طرح کہتا رہا ہو اور نہ ایسا خط کوئی ایمپلائی اپنے ایمپلائر کو لکھ سکتا ہے۔ اُسکے بعد اُنکے بڑے بھائی ہیں شعیب نظامی صاحب، جن کا قندیل پریس ہے۔ یہ اُن کے پاس جا بیٹھے۔ ایک دو دن بعد پتا چلا انہوں نے وہاں اُن کے ساتھ والا کمرہ صاف کروالیا ہے اور وہاں میز کرسی رکھ لی ہے۔ میں نے سٹاف کے ذریعے معلوم کروایا تو پتہ چلا وہ کہتے ہیں کہ میں تو واپس نہیں آؤں گا چنانچہ I considered that letter as resignation. یہ لیٹر آپ کبھی دیکھنا چاہیں تو دیکھ لیجئے گا۔ پھر آپ فیصلہ کر لیجیے گا کہ اُنھیں نکالا گیا یا وہ خود نکلے۔ خط لکھنے کے بعد وہ خود ہی دفتر میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ اُسکے بعد جناب نے مجھے چار مقدموں کا نوٹس بھجوایا۔ ایک مقدمہ تھا defamation کا۔ کسی کا مضمون چھپا تھا، اُن کا یہ کہنا تھا کہ اِس میں میری defamation ہوئی ہے اور ہرجانہ ایک روپیہ مانگا۔ دوسرے میں انھوں نے کہا کہ پرنٹنگ ہال خالی کریں۔ وہ نوائے وقت پبلیکیشن ہے۔ یہ ندائے ملت لمیٹڈ ہے۔ اِس طرح کے مقدمے ہیں۔

اب ہم 69ء میں چلتے ہیں۔ 62ء میں نوائے وقت کے نمائندے کے طور پر میں لندن میں تھا۔ اُس وقت پونڈ 9 روپے چھ پیسے کا تھا۔ ساٹھ ستر پونڈ مجھے ملتے تھے۔ جب 62ء میں، میں واپس آیا تو وہ سو پونڈ بنے۔ تو واپس میں اس طرح آیا کہ آغا شورش مرحوم نے مجھے فون کیا کہ نظامی صاحب آپ فوراً واپس آ جائیں۔

میں نے کہا ''خیر تو ہے؟''

آغا صاحب کہنے لگے کہ حمید نظامی صاحب بہت سخت بیمار ہیں آپ فوراً پہنچیں، اُن کا حکم ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چنانچہ میں واپس آیا تو حمید نظامی صاحب سے میری صرف علیک سلیک ہو سکی، شام کا وقت تھا یا رات ہو چکی تھی۔ وہ کہنے لگے اچھا ہوا تم آ گئے اُسکے بعد انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُسی رات وہ وفات پا گئے۔ جب دو چار دن میں فارغ ہوئے تو میں دفتر آیا تو دیکھا جیسے پنجابی میں کہتے ہیں نا ''برے حال تے بانکے دیہاڑے''۔ چھ صفحے کا لتھو اخبار تھا۔ اپنا پریس بھی نہیں تھا۔ آغا شورش کے پریس میں اخبار چھپتا تھا۔ نیوز پرنٹ اُدھار لیتے تھے۔ جہاں تک تنخواہوں کا تعلق ہے وہ قسطوں میں دیتے تھے۔ یعنی پہلے ہفتے چپڑاسیوں اور کاتبوں کو دوسرے اور تیسرے ہفتے میں فلاں کو فلاں کو۔ قصہ مختصر اس طرح 69ء آ گیا۔ میرے بھٹو صاحب کے ساتھ لندن کے زمانے کے تعلقات تھے، بے تکلفی تھی۔ خیر میرے تعلقات تو ڈکٹیٹروں کے ساتھ بھی Carrot & stick والے رہے۔ وہ (عارف نظامی) بتاتے ہیں بس کہ دوستانہ مراسم تھے۔ مثلاً ضیاء الحق کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ میری باتیں سن لیتے تھے۔ مثلاً میں نے ضیاء الحق سے کہا کہ آپ کا انٹرویو کرنا ہے تو کہنے لگے ایک شرط ہے کہ آپ ساتھ آئیں گے، میں نے کہا میں آ جاؤں گا۔ کوئی آدھا گھنٹہ بات چیت ہوتی رہی۔ تو کہنے لگے کہ نظامی صاحب آپ نے کوئی سوال نہیں کیا؟ میں نے کہا یہ شرط تو نہیں تھی کہ میں سوال بھی کروں گا۔ آپ نے کہا تھا آیئے، میں آ گیا۔ کہنے لگے ''نہیں، سوال بھی کریں۔''

میں نے اُن سے کہا: ''ساڈی جان کدوں چھڈو گے'' تو کہنے لگے: ''میں نے غلطی کی آپ سے کہہ کر کہ آپ سوال کریں''۔ اسی طرح، بھٹو صاحب پر ایک مقدمہ بوسٹن جیل میں چلا۔ میں وہ واحد ایڈیٹر تھا جو جیل میں بیٹھ کر یہ مقدمہ سنتا تھا۔ پھر اُن کا مینی فیسٹو آیا جس میں لکھا تھا ''سوشلزم ہماری معیشت ہے''۔ میں نے کہا ''بھٹو صاحب، آپ ہمارا قبلہ مکہ کی بجائے ماسکو لے جا رہے ہیں۔'' کہنے لگے، یہ اس حرام زادے جے اے رحیم کی شرارت ہے۔ اگر آپ کو پتا ہو تو رحیم فرانس میں سفیر تھے اور اُنھوں نے مینی فیسٹو لکھا تھا۔ بھٹو کہنے لگے ''میں باہر آ کر سب کچھ ٹھیک کر دوں گا'' باہر نکل کے اُنھوں نے مجھے ہی ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اشتہار وغیرہ بند کر دیے گئے۔ اس طرح اُنھوں نے مجھے یہ اِنعام دیا، لیکن اس کے باوجود تعلقات ٹھیک ٹھاک رہے۔ ہمارا دفتر شاہ دین بلڈنگ میں تھا، نیچے ریستوران تھا۔ وہاں وہ گپ شپ کے لیے آتے تھے۔ میرے ساتھ کافی ہاؤس بھی جاتے تھے، یعنی اتنی بے تکلفی تھی۔ جب معاہدۂ تاشقند کے بعد ایوب خان نے اُنھیں فارغ کیا تو پنڈی میں اپنے گھر میں بیٹھے تھے، خاموش۔ میں سلہری صاحب کے ساتھ جا کے اُنھیں ملا۔ بعد میں پتہ چلا کہ سلہری صاحب تو انٹیلی جنس کے آدمی ہیں، میرے ساتھ اِس لیے گئے تھے تاکہ پتہ چل سکے کہ میری اور بھٹو کی کیا بات ہوئی تھی۔

☆ کون سے سلہری صاحب؟

o زیڈ اے سلہری، ایڈیٹر "پاکستان ٹائمز"۔ کچھ دیر وہ شاید آئی ایس پی آر میں بھی رہے۔ لیکن بنیادی طور پر صحافی تھے۔ کچھ عرصہ اُنھوں نے "ڈان" میں بھی کام کیا اور شاید ایک شام کا اخبار بھی کراچی سے نکالا تھا۔ خیر میں نے بھٹو صاحب سے کہا، بھٹو صاحب باہر نکلیے۔ کہنے لگے " مجھے کون چھاپے گا؟ میں نے کہا "میں چھاپوں گا آپ کو"۔ وہ کہنے لگے "آپ تو میرے خلاف ہیں۔" میں نے کہا "سوشلزم کی مخالفت کروں گا"۔ آپ کو اقتدار چاہئے اور مجھے جمہوریت۔ جمہوریت کے معاملے پر ہم اکٹھے ہوں گے۔ جہاں تک اقتدار کا تعلق ہے، آپ جانیں اور آپ کا کام! اگر آپ کو دوبارہ اقتدار ملتا ہے تو موسٹ ویلکم۔ لیکن ہماری پالیسی وہی رہے گی جو اِس وقت ہے۔ کہنے لگے آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ خیر تھوڑے دنوں بعد یومِ حمید نظامی آیا۔ میں نے اُنھیں دعوت دی کہ آپ وائی ایم سی اے ہال میں اس تقریب کی صدارت کریں۔ اُس دن وائی ایم سی اے ہال کی چھت، سیڑھیاں، مال روڈ اور نیلا گنبد والی اطراف لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اِس طرح اُنھوں نے اپنے آپ کو دوبارہ لانچ کیا۔ پھر یوں ہوا کہ میں نے ڈاکٹر مبشر حسن کو درخواست کی کہ آپ بھٹو صاحب کو فلیٹیز ہوٹل میں چھوڑ آیئے۔ نیلا گنبد والی سائیڈ سے بانس کی سیڑھی لگا کر بھٹو صاحب کو نیچے اُتارا۔ مبشر حسن ڈاکٹر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شبر حسن کے چھوٹے بھائی ہیں جو حمید نظامی صاحب کے دوست اور ہمارے فیملی فرینڈ تھے۔ ڈاکٹر شبر صاحب ابھی زندہ ہیں۔ تھوڑے دنوں بعد ڈاکٹر مبشر حسن میرے پاس آئے اور کہنے لگے: ''مجید مجھے خط دو، میں نے بھٹو کو ملنا ہے''۔ میرے خط دینے پر وہ اُس سے ملے اور پتا نہیں کیا چکر چلایا۔ پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل ہو گئے۔ اُن کے گھر پیپلز پارٹی کا پہلا کنونشن ہوا۔ وہ پہلے سیکرٹری جنرل بنے اور پھر وزیر خزانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر شبر حسن اور ڈاکٹر مُبشر حسن دونوں ہماری بھابھی کے پاس گئے، یہ میں 69ء والی بات کر رہا ہوں۔ اُنھوں نے کوئی چکر چلایا اور بھابھی مجھے کہنے لگیں کہ میں نے دفتر آنا ہے۔ میں نے کہا جی حالات ابھی وہی ہیں جو 62ء میں تھے۔ بہت زیادہ بہتر نہیں ہوئے۔ صرف اخبار کی سرکولیشن کافی بڑھ گئی ہے۔ لیکن اُتنے کاہمیں کاغذ خرید کر دینا پڑتا ہے تب سرکاری اشتہار بنتا ہے۔ کمرشل اشتہار چھپ نہیں سکتا کیونکہ لٹھو کا پرچہ ہے۔ تو آپ دفتر آ کر کیا کریں گی تو اِس کے علاوہ کسی دفتر میں دو باس نہیں رہ سکتے۔ آپ جس دن تشریف لائیں گی، میں یہاں نہیں رہوں گا۔ اِس میں کوئی لڑائی جھگڑے والی بات نہیں ہے۔ اُس وقت یہاں بندیال ڈی سی لاہور تھا۔ وہ میرا ایک سال سینئر کلاس فیلو تھا۔ اُس نے فیڈرل سیکرٹری کا بہانہ بنا کر کہا نظامی صاحب اِس طرح نوائے وقت جیسا اخبار ڈوب جائے گا تو آپ کو اگر کوئی مدد چاہئے تو ہم تیار ہیں۔ میں نے کہا جناب! ایوب خان کی حکومت ہے، آپ میری کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔'' وہ کہنے لگا ''آپ اِس کی پروانہ کریں۔''

میں نے کہا نہیں۔ میں اپنی فیملی کے معاملات میں نہ حکومت اور نہ پولیس کو لانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں نے شکریے کیساتھ انھیں انکار کر دیا۔ ایک اور دن میری بھابھی اِسی عارف میاں کے ساتھ شاہ دین بلڈنگ میں میرے دفتر تشریف لائیں اور کہا کہ ''مجید! میں تو آ گئی ہوں'' میں نے کہا ''جی بسم اللہ۔'' میں نے کاغذ بھی نہیں اُٹھایا اور اٹھ کر چلا گیا۔ میری بیگم اُن دِنوں حج پر گئی ہوئی تھیں۔ میں فوری فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ایک تو یہ تھا کہ میں اپنی تعلیم مکمل کرتا۔ میں نے دو سال انٹرنیشنل

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ریلیشنز کا کورس بھی کیا تھا لیکن چونکہ میں نے پریکٹس نہیں کرنی تھی لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے وہی کام کرنا چاہئے جو مجھے آتا ہے۔ کیونکہ بطور طالب علم لندن جانے سے پہلے میں چار سال کالم بھی لکھتا رہا۔ اور لندن سے چھ سال 'مکتوب لندن' بھی لکھتا رہا۔ بہرحال میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے کوئی اخبار نکالنا چاہئے چنانچہ میں نے اپنے ذاتی دوستوں سے بات کی۔ وہ زمانہ بھی ذرا سستا تھا۔ دو، چار، چھ لاکھ میں نے قرضہ لیا اور پرانی انارکلی منشی چیمبر میں پریس لگایا۔ وہاں ایک ہی ہال میں دفتر بھی تھا۔ مینجمنٹ بھی وہیں تھی، نیوز روم بھی اور میں بھی۔ یعنی ہر چیز وہیں تھی۔ ان (عارف نظامی) کے ماموں حامد محمود، حمید نظامی صاحب کے پارٹنر تھے۔ وہ چھوڑ کے چلے گئے تھے کہ میں یہ دباؤ برداشت نہیں کر سکتا اور واقعی اسی دباؤ سے نظامی صاحب کا انتقال ہوا۔

☆ وہ دباؤ کیا تھا؟

○ گورنمنٹ کا پریشر تھا۔ اشتہار بند۔ نیوز پرنٹ بند اور ذہنی دباؤ الگ۔ لہٰذا حامد صاحب نے جا کے سی ایم جی جائن کر لیا تھا لیکن بعد میں بیگم نظامی نے اُسے واپس بلا لیا۔ سارا سینئر سٹاف بھی اُدھر ہی رہا، میرے ساتھ نہیں گیا۔ میں نے وہاں جا کے پرچہ نکالا تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایک سال کے اندر اندر ''نوائے وقت'' بیٹھ گیا اور ''ندائے ملت'' ''نوائے وقت'' بن گیا۔ چنانچہ شعیب اور عارف نے میرے پاس آنا شروع کر دیا کہ چچا جان آپ واپس آ جائیے میں نے کہا، دیکھو بھائی ایک بار میں بے عزتی کروا چکا ہوں۔ دوسری بار کے لیے تیار نہیں۔ اللہ آپ کو مبارک کرے، آپ اپنا اخبار چلائیں۔ آپ ماشاء اللہ دونوں بھائی ہیں، آپ کی اماں جان ہیں۔ حامد محمود ہے جو حمید نظامی صاحب کے پارٹنر تھے۔ پوری ٹیم آپ کے پاس ہے۔

یہاں تک ہوا کہ ایک بار سٹاف نے ہڑتال کر دی اور نوائے وقت تیار نہ ہو سکا۔ میں نے ندائے ملت پر نوائے وقت کی پیشانی لگا کر انھیں کاپی بھیجی کہ یہ لو تم چھاپ لو۔ بہرحال میں نے اُنھیں کہا کہ میں ایسے واپس نہیں آ سکتا، میں منشی چیمبر میں بیٹھ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گیا ہوں، اللہ یہیں ترقی دے گا، یا جو میں نے کرنا ہے یہیں کرلوں گا۔ پھر اُنھوں نے بہت تنگ کیا تو میں نے کہا آپ پلیز مجھے لکھ کر دیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ زبانی بات ٹھیک نہیں ہے۔ نوائے وقت پبلیکیشنز لمیٹڈ پر جب coup d'etat ہوا۔ میں اُن کے مذکورہ سارے عمل کو یہی کہتا ہوں۔ میں بھی پہلے اُس کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔ میرے مطالبے کے بعد انھوں نے کمپنی کا ریزولیشن کیا، جس میں لکھا تھا ہمارے پاس کاغذ نہیں، سیاہی نہیں، تنخواہیں دینے کے لیے پیسے نہیں۔ ہم سخت تنگ ہیں اوران حالات سے نمٹنے کے لیے دو لاکھ پینتیس ہزار روپے رقم کی ضرورت ہے، مجھ سے کہا گیا کہ یہ رقم دینے کی صورت میں ڈیکلریشن نوائے وقت کا ہوگا، جب کہ پیشانی ندائے ملت لمیٹڈ کی ہوگی، اور ہمارا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ میں نے انھیں یہ رقم ادا کی۔ انھوں نے کمپنی ریزولوشن میں یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ مجھے پریس کے لیے ایک ہال دیں گے، اور دوسرا وہ ہال جہاں آج کل 'پاکستان ٹوڈے' کا دفتر ہے۔ وہاں میرا دفتر بن گیا اور میں نے نوائے وقت نکالنا شروع کر دیا۔ آپ فائل دیکھیں شروع میں کہیں لکھا ہوا ہے کہ "اِس میں ندائے ملت شامل ہے۔ اللہ نے کرم کیا اور اپنی پالیسی کی وجہ سے نوائے وقت پھر ایک بار نوائے وقت بن گیا، جسے اب وہ جہالت کہتے ہیں۔ یہ اخبار چار جب کہ نیشن تین جگہ سے نکل رہا ہے۔ فیملی، پھول اور ندائے ملت ہے اور وقت ٹی وی بھی ہے۔ جب میں آیا تھا تو یہ بلڈنگ ہمارے پاس نہیں تھی، یہ بلڈنگ بھی بنائی جس میں ہم بیٹھے ہیں۔ وقت ٹی وی کا دفتر علیحدہ ہے۔ کراچی میں بھی ہماری اپنی بلڈنگ ہے۔ ایک دفتر ڈیفنس میں ہے۔ ملتان اور اسلام آباد کے دفاتر اس کے علاوہ ہیں۔ مختصر یہ کہ اللہ کے فضل سے ''نوائے وقت'' ایک کامیاب اِدارہ ہے۔

اب ہم دوبارہ عارف نظامی صاحب کے واک آؤٹ کی طرف جاتے ہیں کہ یہ میری بیٹی کو اپنے ساتھ قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ حالانکہ میرے ذہن میں تھا کہ ان کے تین بیٹے ہیں جو اُس وقت پڑھ رہے تھے، اب ''پاکستان ٹوڈے'' میں کام کر رہے ہیں۔ شعیب صاحب کا بیٹا بینک یا کسی جگہ مُلازم تھا۔ اِن کا ایک بھانجا تھا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں نے اُسے یہاں پر موٹ کیا۔ آہستہ آہستہ اُسے مینجر ایڈورٹائزمنٹ بنایا۔ وہ بھی اب اُن کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ جب اِن کا پرچہ 'پاکستان ٹوڈے' نکلا تو میں نے اشتہار لگایا کہ بھئی ہم انھیں ویلکم کرتے ہیں۔ اس کا صلہ انھوں نے یہ دیا کہ ہر چینل پر جا کے، جہاں تک جا سکتے تھے اپنی خود ساختہ کہانی سنائی۔ جو بھی دل میں آتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں۔ بالخصوص ''سٹی 42'' پر گئے۔ ''آج'' ٹی وی پر بھی گئے اور اسی طرح جو ایم کیو ایم کے چینل ہیں یا کوئی دوسرے ہیں، اُن پر بھی گئے۔ باقی یہ پاکستان ٹوڈے پڑا ہے۔ آپ اُس کے دس بارہ شماروں کا تحقیقی مطالعہ فرمائیں چونکہ آپ تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ پھر دیکھیں نوائے وقت یا نیشن اور اِس پرچے کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

☆ آپ نے بڑی وضاحت کیساتھ بیک گراؤنڈ بتایا لیکن اِس سلسلے میں اُنکا کہنا ہے کہ آپ کی اپنی حالت بڑی پتلی تھی اِس لئے آپ کو واپس لے لیا؟

o جو شخص دو لاکھ پینتیس ہزار میں نوائے وقت بیچ رہا ہے وہ کیسے دعویٰ کر سکتا ہے کہ بھئی ہم نے پتلی حالت کی وجہ سے مجید نظامی کو بلایا تھا۔

☆ جس بلڈنگ میں نوائے وقت ہے یہ کس کی ملکیت ہے؟

o حمید نظامی تو 62ء میں انتقال فرما گئے تھے۔ یہ دو بلڈنگز اُنکی تھیں جو الاٹڈ ہیں، تعمیر شدہ نہیں۔ یہ ایک بلڈنگ میں نے منظر بشیر سے خریدی۔ شاہ دین بلڈنگ کے پیچھے اُن کی زمین تھی اور یہ ندائے ملت لمیٹڈ کے نام رجسٹرڈ ہے۔ اگر یہ بلڈنگ اُن کی ہو تو وقت ٹی وی کی بلڈنگ اور باقی تین شہروں میں بھی اپنی بلڈنگز بنائی ہیں۔

☆ میں آپ سے ایک اور بات پوچھنا چاہتا ہوں۔۔۔

o جی پوچھیں، بے شک Embarrassing ہو، کوئی بات نہیں۔

☆ ایک زمانے تک اخبار میں ایڈیٹر کی تصویر یا بیان کا چھپنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آپ نے بہت دیر تک اس اصول کی پابندی کی۔ پچھلے کئی سالوں سے آپ کے حوالے سے نوائے وقت میں روز کوئی نہ کوئی کالم ہوتا ہے۔ تصویر یا بیان چھپا ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی کیوں آئی؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o دراصل زمانہ بدل گیا ہے۔ لوگ مجھے مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً میں نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن جاؤں اور میں روز جاتا ہوں۔ آج بھی فیصل آباد، کمالیہ اور اُن علاقوں سے ٹیچرز آئے ہوئے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ سے طے ہوا ہے کہ وہ سکولوں اور کالجز کے ٹیچرز کو ہمارے پاس بھیجیں۔ ہم اُن کو نظریۂ پاکستان کے بارے میں بتائیں گے اور وہ یہ نالج آگے طالب علموں تک پہنچائیں گے۔ اگر اس فنکشن کی تصویر نہیں چھپتی تو فاؤنڈیشن والے کہتے ہیں کہ ہماری پروموشن نہیں ہوتی اور لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

☆ آپ نے جو ابھی اپنا موقف بیان کیا ہے یہ پہلے ہی اخبار میں چھپ چکا ہے۔ جبکہ عارف نظامی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ نوائے وقت گروپ کو چھوڑنے سے تقریباً سال پہلے شہباز شریف اُن کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ ایک سال کی تنخواہ لے لیں اور اخبار چھوڑ دیں۔ اِس میں کہاں تک صداقت ہے؟

o پھر میں کہوں گا کہ وہ رزق پڑا ہے۔ It is other way round یہ ڈیفنس میں رہتے ہیں اور اُس زمانے میں شہباز شریف بھی اپنے بیٹے حمزہ کیساتھ وہیں رہتا تھا۔ اِن کا اُن کے ہاں آنا جانا تھا By the way انھیں (عارف نظامی) پی آر کا بڑا شوق ہے۔ گورنر سے بات کر رہے ہیں۔ فلاں لیڈر سے مل رہے ہیں۔ فلاں سے مل رہے ہیں۔ میں انھیں کہتا تھا دیکھو برخوردار ایڈیٹر کا کام کسی کو کال کرنا نہیں ہے۔ ایڈیٹر کے پاس لوگ آتے ہیں وہ نہیں جاتا۔ Try to be editor شہباز ہو یا نواز ہو یہ بات اب ریکارڈ پہ آ رہی ہے لیکن میں کہہ رہا ہوں۔ وہ میرے گھر آتے ہیں میں اُن کے گھر نہیں جاتا۔ میں کسی ڈکٹیٹر کے پاس بھی نہیں گیا سوائے جب وہ ایڈیٹرز کی میٹنگ بلائیں۔ لیکن جب میں نے آپ کو بتایا کہ مشرف کے بلانے پر بھی اُسکی میٹنگ میں نہیں گیا، بھئی میرا وہاں داخلہ بند تھا۔ چنانچہ اُن کا یہ کہنا بالکل غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ اُن کے پاس گئے اور کہنے لگے بھئی میں نیشن چھوڑ چکا ہوں، یا چھوڑ رہا ہوں، یا ارادہ کر لیا ہے۔ تو مجھے وہ پانچ سو کروڑ دے دیں تو میں اُنکا ''کھیہڑا'' (پیچھا) چھوڑ دوں گا۔ وہ (شہباز شریف

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

) کہنے لگے میں کروڑ پتی ہوں لیکن خدا شاہد ہے میں نے آج تک کروڑ روپیہ بھی نہیں دیکھا۔ آپ کو پتا ہے پانچ سو کروڑ کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ اُن سے کہیں کہ پانچ سو کروڑ مجھے دیں۔ نیشن، نوائے وقت، فیملی، پھول۔ یہ چاروں دفتر جو کچھ ہے، وہ لے لیں۔ یہ سب اُنکا اور میں فارغ۔ قصہ مختصر پانچ سو کروڑ سے وہ آئے دو سو، ڈیڑھ سو کروڑ پر۔ ڈیڑھ سو کروڑ تک میں راضی ہوا۔ میں نے کہا کہ اُس میں اُن کا پروویڈنٹ فنڈ اور گریجوئٹی ہے، کوئی سولہ لاکھ کے قریب۔ نوے لاکھ بنا باقی؟ اُن کی تنخواہ بھی کوئی ساڑھے تین لاکھ تھی۔ دراصل میں نے اُن کا بھلا چاہا تھا۔

He will have some money to stand up. ویسے تو اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اتنا پیسہ دیا ہے کہ وہ ایک اخبار نکال رہے ہیں۔ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا کہ یہ پیسے اُنھیں کہاں سے اور کیسے ملے۔ میں نے بھی کہیں سے سنا ہے۔ اچھا، وہ جناب ڈیڑھ سو کروڑ پہ تقریباً راضی ہو گئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ کچھ رقم ہم یک مشت دیں گے، باقی قسطوں میں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ جس طرح تنخواہ دیتے ہیں تین، چار لاکھ روپیہ مہینہ دے دیں گے تو 48 یا 50 لاکھ، سال میں اُن کا ختم ہو جائے گا۔ پھر اچانک مجھے شہباز کا فون آیا کہ نہ وہ خود ٹیلی فون کرتا ہے اور نہ میرا ٹیلی فون سنتا ہے۔ So that deal is off. اُسکے بعد مقدمے کے نوٹس آ گئے۔ یہ وکیل کونسے ہیں جی۔۔۔ چھوٹے سے ہیں جو؟

☆ اعتزاز احسن؟

o اعتزاز احسن کو اُنھوں نے وکیل کیا۔ جو میرا بھی بھتیجا لگتا ہے۔ تو اِس طرح ہمیں چار مقدموں کا نوٹس آ گیا۔ جیسا کہ میں نے کہا اِس نے مختلف چینلز پہ اور شامی صاحب کے ڈائجسٹ میں کوئی پچیس تیس صفحے کا انٹرویو دیا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کی انٹ شنٹ باتیں اُنھوں نے آپ سے کی ہیں کہ وہ (مجید نظامی) دراصل اُس وقت ہمارے پاس آئے۔ سوال یہ ہے میں نے اگر اُن کے پاس جا کے اخبار مانگنا تھا تو اُنھوں نے وہ بیچا کیوں؟ بلکہ انھوں نے خود یہ بیچا۔ اِس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بات کا ثبوت اِن کے ریزولیشن کی شکل میں میرے پاس موجود ہے۔ جہاں تک استعفیٰ کا تعلق ہے تو وہ لیٹر جو اُنھوں نے جانے سے پہلے میرے نام لکھا، وہ ان کا استعفیٰ ہی ہے۔ انٹ شنٹ بولنا اور بات ہے، حقیقت اس طرح نہیں۔ میں نے اپنا مؤقف ایک اخبار میں مختصر سا دیا تھا، کسی کو میں نے انٹرویو نہیں دیا۔ چونکہ آپ کتاب لکھ رہے ہیں اِس لیے میں انٹرویو پر راضی ہوا۔

☆ یہ جو صحافی پلاٹ لیتے ہیں، اس عمل کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

o میں سمجھتا ہوں کہ صحافیوں کو پلاٹ لینے کا کوئی حق نہیں اور نہ کبھی میں نے لیا ہے۔

☆ تقریباً دو ہفتے پہلے CNBC ٹی وی پر عارف نظامی صاحب نے ایک انٹرویو میں کہا کہ مجید نظامی صاحب نے بھی کئی پلاٹ لیے ہیں؟

o اگر ایک بھی ثابت ہو جائے تو میں مُجرم ہوں۔ میں تو اب Defamation کیس ہی کر سکتا ہوں۔ لیکن میں دنیا کو نہیں بتانا چاہتا کہ بھئی حمید نظامی صاحب کی فیملی یہ کام کر رہی ہے۔ میں نے ایک بھی پلاٹ نہیں لیا۔ میں نے اپنا گھر میسن روڈ پر بنایا، جہاں کھیت تھے اور رہٹ چلا کرتا تھا۔ وہاں میں نے چار کنال کا پلاٹ بولی دیکر خریدا۔ وہاں سارے نیلام شدہ پلاٹ ہیں، کوئی الاٹمنٹ نہیں۔ اسلام آباد میں میرا اپنا گھر ہے۔ کراچی میں بھی ذاتی پلاٹ ہے۔ ہاں البتہ اسلام آباد میں حکومت نے اخبارات کے لئے لندن کی طرز پر ایک سٹریٹ بنائی تو نوائے وقت کو بھی وہاں ایک پلاٹ الاٹ ہوا جہاں اب نوائے وقت کا دفتر ہے۔ جنگ کو چونکہ پنڈی میں پہلے ہی مل چُکا تھا اِس لیے اُنھیں وہاں نہیں ملا۔ اُس جگہ دوسرے اخبارات کو بھی پلاٹ الاٹ ہوئے۔

☆ کہا جاتا ہے کہ آپ خوشامد بہت پسند کرتے ہیں۔ نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن اور اخبار میں بھی آپ کے گرد خوشامدی ہیں؟

o یہ بالکل غلط ہے مثلاً میں بھارت مُخالف ہوں اور اگر میں اس حوالے سے کوئی بیان دیتا ہوں تو لوگ اُسکی تعریف کرتے ہیں تو یہ میری خوشامد تو نہیں۔

☆ ''سرراہے'' نوائے وقت کا ایک مقبول سلسلہ رہا ہے۔ اِس میں سیاست اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سیاستدانوں کی تضحیک کی جاتی ہے یا کی جاتی رہی ہے۔ اِس بارے میں کیا کہیں گے؟

o 50ء سے لیکر 54ء تک حمید نظامی صاحب کی زیر نگرانی ''سرراہے'' میں بھی لکھتا رہا۔ 54ء میں جب لندن گیا ہوں تب میں نے چھوڑا۔ ذاتی طور پر تو میں اپنی تحریر کا ذمہ دار ہوں۔ اُس میں طنز و مزاح ضرور تھا، تضحیک نہیں تھی۔

☆ نوائے وقت میں نوابزادہ نصراللہ خاں جیسے اصولی سیاستدان کا بھی مذاق اُڑایا جاتا رہا۔ جرنیلوں کا مذاق تو کبھی نہیں اُڑایا گیا؟

o اُن کے حقے کا ذکر ہو گیا یا کوئی اور ایسی بات ہو گئی۔ یہ تضحیک نہیں ہے۔ نواب زادہ کا تو میں خود مداح تھا۔ اُنھیں ہم نے چھاپا۔ پروموٹ کیا۔ ہماری اُن سے دوستی تھی۔ اُن کی بیٹھک نکلسن روڈ پہ تھی۔ وہاں میں جاتا رہا۔ سیاستدانوں کے ساتھ بھی تعلقات ہوتے ہیں اخباراُنکے متعلق لکھتا بھی ہے اور لکھنا پڑتا بھی ہے۔

☆ لیکن جرنیلوں کے بارے میں ''سرراہے'' میں ایسا نہیں لکھا گیا؟

o جرنیلوں کے بارے میں، میں آپ کو دکھا دیتا ہوں۔

☆ آج کل نوائے وقت میں، خاص طور پر سرِ راہے میں جو زبان استعمال کی جا رہی ہے۔ جیسے 26 دسمبر 2010ء کا یہ کالم ہے۔ ''چودھریوں اور ڈاکٹروں نے بڑا جنسی ہنیر مچا رکھا ہے، اِن کو پکڑ کر درختوں سے لٹکا کر پھانسی دی جائے، جیسا کہ ایران میں ہوتا ہے، تب جا کر اِن کا 'مچ' مرے گا۔ اگر اِن زن باز ڈاکٹروں اور چودھریوں میں ہمت ہے تو کسی چودھری یا ڈاکٹر کی بیٹی اغواء کر کے اِس سے اجتماعی زیادتی کر کے دکھا دیں۔ حکومت کرنے والوں کی بیٹیوں کی عصمت دری کیوں نہیں ہوتی؟ اگر اللہ کا عذاب آ گیا تو وہ دن دور نہیں کہ حکمرانوں، چودھریوں اور ڈاکٹروں کی بیٹیاں بھی سرِ عام عصمت دری کا نشانہ بنیں گی۔ اب وہ زمانہ گیا کہ انصاف حکومت سے مانگا جائے۔ بلکہ آج کا تقاضا ہے کہ غریب لوگ ایکا کر کے زانی سے براہ راست ٹکر لیں۔ اسکی عزت کو یرغمال بنائیں۔ پھر ایک کالم ہے یکم دسمبر 2010ء کا اِس میں لکھا ہے۔ شیدا ٹلی صاحب نے اپنا نام عوامی مسلم لیگ رکھ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لیا ہے۔

اسی طرح 2 جنوری 2011ء کے سرِ راہے میں لکھا ہے ''وینا کا منہ اپنا، بدن اپنا، نیم عریاں لباس اپنا، باقی سب کچھ بھارت کا تھا''۔ اور یہ کہ ''سپیکر صاحب اپنا اسمبلی کا کالا بزنس جاری رکھیں'' یہ کیسی زبان استعمال ہو رہی ہے؟

o میری بات سُنیں۔ میں انھیں ڈیفنڈ نہیں کر رہا، خبر چھپتی ہے تو ڈسکس ہوتی ہے۔ تقریباً روز ایسی خبر چھپتی ہے میں خود محسوس کرتا ہوں کہ کسی کی بیٹی گھر میں [redacted] نہیں ہے۔ لہٰذا خبر سے متاثر ہو کر ہی اُنھوں نے لکھا ہے چونکہ خبر کے مُطابق کوئی چودھری تھے جنھوں نے زیادتی کی تھی۔

☆ لیکن میں یہ کہہ رہا تھا کہ سرِ راہے کا ایک معیار تھا۔ آپ خود بھی لکھتے رہے ہیں اور آج کل یہ زبان؟

o اُس زمانے میں یہ چیزیں اتنی تھیں بھی نہیں۔

☆ اب دوبارہ واپس چلتے ہیں۔ میں نے آپ کی گفتگو سے محسوس کیا ہے کہ اپنی بیٹی کے حوالے سے آپ چاہتے تھے کہ ہم اپنے خاندان میں ہی مل بیٹھیں؟

o جی بالکل خدا شاہد ہے۔

☆ لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے رمیزہ کو ساتھ لے کے چلانا چاہا۔ یا میں اُن کا حصہ بننا چاہتا تھا۔ مگر نظامی صاحب کے میسن روڈ والے سارے رشتے دار ایک مافیا ہیں۔ وہ نوائے وقت پر قابض ہونے کا ایجنڈا لیکر آئے ہیں؟

o میں ایسے سفید جھوٹ کا جواب نہیں دینا چاہتا، یہ بالکل بکواس ہے۔ ایسی باتیں وہ ہی کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔

☆ نظامی صاحب، آپ کہتے ہیں انڈیا سے ہمیں جنگ کرنی چاہئے۔ فرض کریں جنگ کے نتیجے میں ہمیں فتح ہو جاتی ہے۔ اور سارا ہندوستان بھی پاکستان بن جاتا ہے۔ اور فرض کریں کہ طرزِ حکومت بھی جمہوریت ہی رہتا ہے تو اکثریت کی بنا پر ہندو ⓒ نوں پر غالب نہیں آ جائیں گے؟

o ہم یہ بھارت کو کنٹرول کرنے کے لیے کہتے ہیں تا کہ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پہنا سکے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے ''کہ دشمن، کفار کے مقابلے میں اپنے گھوڑے تیار رکھو''۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ تمہارا دشمن تمھیں ختم کرنا چاہتا ہے، یہ کوئی گپ شپ نہیں، حقیقت ہے۔ ویسے آج کل کے گھوڑے میزائل اور ایٹم بم ہیں۔

☆ ابھی ''سرِ راہے'' میں دوبارہ ایک فقرہ چھپا کہ ''ایکٹنگ بطور پیشہ ناجائز ہے''۔ تو آج کل کے زمانے میں جیسے وقت ٹی وی بھی چل رہا ہے۔ اُس میں وائس آف امریکہ کا اشتہار بھی چل رہا ہے۔ ایکٹنگ تو اُس میں بھی ہوتی ہے؟

o دیکھئے جہاں تک اُس اشتہار کا تعلق ہے اُس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اینٹی پاکستان ہو۔ اگر وہ پروگرام اینٹی پاکستان ہو تو آپ اعتراض کر سکتے ہیں۔

☆ نذیر ناجی نے جنگ میں ایک کالم میں آپ کا نام لیے بغیر لکھا کہ:

''اُن کو اپنی جان عزیز نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں بم کے ساتھ بندھ کر گر پڑو''۔

o اِس کا جواب ہم کوئی چھ کالم لکھ کر دے چکے ہیں۔

☆ ناجی صاحب کے کالم میں آپ کی تضحیک نہیں تھی، جب کہ نوائے وقت میں ناجی صاحب کے خلاف چھپنے والے کالموں میں بہت سطحی زبان استعمال ہوئی، جیسے:

''ارے او پاجی۔ کرائے کے کالم نگار''۔ ''کتے قافلوں کی راہ کھوٹی نہیں کر سکتے''۔

o وہ تضحیک ہی تھی! وہ کالم آپ دوبارہ پڑھیں۔ آپ نے ٹھیک طرح سے پڑھا نہیں ہوگا۔

☆ نذیر ناجی صاحب کو کیا مسئلہ ہے، وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

o نذیر ناجی صاحب کرائے کے لکھنے والے ہیں۔ میں نے اُنھیں نواز شریف کے گھر، شراب کی بوتل، چارپائی کے ساتھ رکھے ہوئے، چارپائی پر بیٹھ کر، جو وہ چاہتے تھے وہ لکھ کر دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ مہینہ رہے، سال رہے، چند سال رہے، اب وہ اُن کے خلاف لکھتے ہیں۔ کیوں کہ جو دینے والا ہے وہ کہتا ہے یہ لکھو۔

☆ عباس اطہر، ارشاد عارف، عطاء الحق قاسمی وغیرہ یا نذیر ناجی۔ یہ لوگ نوائے وقت سے کیوں چلے گئے۔ حالانکہ وہ طویل عرصہ نوائے وقت سے وابستہ رہے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ اُسکی وجہ یہ ہے کہ نوائے وقت میں اُن کی تنخواہ تھوڑی تھی۔ انھیں زیادہ تنخواہ ملی تو وہ وہاں چلے گئے، میرے اور اُن کے تعلقات ویسے ہی ہیں۔ ابھی کل یا پرسوں ہم نے قادر حسن کا کالم چھاپا ہے۔

☆ جس میں آپ کی بہت تعریف کی گئی تھی؟

○ جی، جس میں انھوں نے میری تعریف کی تھی اور مُجھے فون کر کے بھی بتایا تھا۔ عباس اطہر نے بھی ایک ٹیلی وژن انٹرویو میں میری تعریف کی اور کہا کہ مجھے کالمسٹ انھوں نے بنایا تھا اور وہ مُجھ سے بہت پیار اور عزت کرتے تھے۔ اب بھی اللہ کا شکر ہے میرے اور اُن کے تعلقات اچھے ہیں۔ اِسی طرح عطاء قاسمی ہیں۔ پچھلے دنوں اُن کی فیملی میں کوئی وفات ہوئی، میں اُن کے گھر گیا، فاتحہ خوانی کے لیے۔ جہاں آج کل وہ ملازم ہیں وہاں بھی میں چلا جاتا ہوں، کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مہنگائی کا زمانہ ہے۔ اگر ہم وہ تنخواہ نہیں دے سکتے تو کوئی ہمیں چھوڑ کر بھی جا سکتا ہے۔ میری یہ پالیسی ہے کہ اگر کوئی آدمی واک آؤٹ کر جائے تو میں اُسے نہیں کہتا کہ تم واپس آؤ۔

☆ آپ ڈاکٹر قدیر کے حوالے سے ہمیشہ جذباتی رہے ہیں۔ لیکن ایک ٹی وی انٹرویو میں آپ نے کہا کہ اُن کا کالم پانچ سو روپے کا بھی نہیں اور وہ پیسے کا پُتر ہے آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے؟

○ (ہنستے ہوئے) میں اب بھی اُن کی ویسے ہی عزت کرتا ہوں لیکن یقین کریں اِن کی اور نواز شریف کی نہیں بنتی تھی۔ یہ میرے گھر تشریف لائے۔ کہنے لگے مجھے ابا جی (میاں شریف) اور میاں صاحبان سے ملنا ہے۔ میں نے فون کیا تو وہ اتفاق سے گھر پر تھے۔ میں نے کہا چلیے جی۔

ابا جی اور نواز شریف سے میں نے اِن کی ملاقات کروائی اور اِن کا استقبال انھوں نے ہاروں سے ایسے کیا جیسے کوئی دولہا میاں آ گیا ہے۔ خواتین بھی چھپ چھپ کر دیکھ رہی تھیں بھئی یہ ڈاکٹر قدیر ہیں جنھوں نے ایٹم بم بنایا ہے۔ طے یہ ہوا کہ یہاں صرف رسمی بات چیت ہوگی، جو اصلی کاروباری بات ہے وہ اسلام آباد میں ہو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گی۔ اُسکے بعد جو وہ چاہتے تھے، طے ہو گیا۔ ایٹم بم بن گیا، آپ کو پتا ہو گا میں نے کہا تھا۔ میاں صاحب دھماکہ کریں، نہیں تو قوم آپ کا دھماکہ کر دے گی۔ انھوں نے پھر مجھے چاغی سے فون کیا کہ مبارک ہو نظامی صاحب میں نے دھماکہ کر دیا ہے اب آپ کو میرا دھماکہ نہیں کرنا پڑے گا۔ تو اللہ کا شکر ہے میں نے یہ کام کروانے میں حصہ لیا۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہے تو جب مشرف نے انھیں قید کیا یا ہاؤس اریسٹ کیا تو میں نے بلا مبالغہ کروڑوں روپے کے اشتہارات اُنکی رہائی کے لیے، فرنٹ اور کلر صفحات پر شائع کئے۔ جب وہ رہا ہوئے تو میں نے وہ اشتہار شکریے کے ساتھ بند کیا۔ انھوں نے اس کا صلہ مجھے یہ دیا کہ جا کے جنگ میں کالمسٹ بن گئے۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی نہ پوچھا کہ بھئی میں کالم لکھنا چاہتا ہوں یا مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ مجھے اتنے پیسے دے سکتے ہیں۔ اگر میں نہ کرتا تو الگ بات تھی۔ لیکن ایک شخص کے لیے اتنا کیا جائے اور وہ یہ صلہ دے تو تھوڑا بہت ری ایکٹ کرنا پڑتا ہے۔ میں فرشتہ نہیں!

☆ نظامی صاحب ایک ایڈیٹر کے طور پر آپ کو غیر جانبدار ہونا چاہئے آپ مسلم لیگیں کیوں اکٹھی کرتے ہیں؟

o دیکھیے اس میں کوئی شک نہیں کہ میں غیر جانبدار ہوں لیکن اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں پیدائشی مسلم لیگی ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ہمارے گھر میں بنی۔ میں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ یہ آپ کے سامنے اسلامیہ کالج میں تحریک پاکستان میں کام کرنے کے اعزاز کے طور پر ملنے والا سرٹیفکیٹ لگا ہوا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے میں غیر جانبدار نہیں ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ پاکستان کی مادری جماعت ہے اور جس طرح پاکستان سیاسی مسائل میں اُلجھا ہوا ہے مسلم لیگ اگر ایک ہو تو پاکستان کے بہت سے سیاسی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

☆ لیکن عملی طور پر پاکستان بننے کے بعد نہ تو مسلم لیگ نے پاکستان میں انتخابات

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کروائے اور بعد میں کسی نہ کسی شکل میں مسلم لیگ نے ہمیشہ آمروں کا ساتھ ہی دیا؟

o یہ تو میں بھی کہتا ہوں۔

☆ لیکن آپ اس بات کا کس طرح تجزیہ کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے آمروں کے لیے ہمیشہ گھوڑی کا کردار ادا کیا ہے؟

o میں تو یہ کہتا ہوں یہ لیڈروں کی کمزوری ہے، حرام زدگی ہے۔

☆ آپ نے کہا تھا میں بعد میں بتاؤں گا کہ عارف نظامی صاحب نے اخبار نکالنے کے لیے کہاں سے پیسے لیے ہیں؟

o اُن سے پوچھا؟ وہ کیا کہتے ہیں؟

☆ وہ کہتے ہیں کہ میرے لیے حرام ہے اگر میں نے سیاستدانوں سے ایک پیسہ بھی لیا ہو۔ میں نے اپنے دوستوں سے پیسے لے کے اخبار شروع کیا ہے۔

o مشہور یہ ہے کہ زرداری صاحب نے اُنھیں نیشنل بینک سے بیس کروڑ روپیہ دلوایا ہے، آپ نیشنل بینک سے معلوم کیجئے۔

☆ آپ کے مخالفین کا کہنا ہے، مشرف کے دور میں آپکے اشتہارات بند تھے تو آپ یعنی نوائے وقت گروپ کو نواز شریف پیسے دیتے تھے؟

o نواز شریف میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ وہ کسی کو ایک پیسہ بھی دے، مجھے یا آپ کو۔ لینا دینا تو بعد کی بات ہے اُس میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس میں کوئی گٹس (Guts) ہی نہیں کہ وہ کسی کو پیسہ دے سکے۔

☆ مشہور تو یہ ہے کہ وہ صحافیوں کو بہت پیسے دیتے ہیں؟

o جو لفافے لیتے ہیں وہ ہر کام بھی کرتے ہیں۔ ناجی کا میں نے ذکر کیا ہے۔ کوئی خدمت کرے تو پیسے لے۔ میں نے تو دوست ہوتے ہوئے ہمیشہ اُن پر تنقید کی ہے۔ نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن میں بھی۔ اب گزشتہ روز کی بات ہے جب یومِ تاسیسِ پاکستان تھا۔ وزیرِ اعلیٰ شہباز شریف نظریۂ پاکستان میں صدارت کر رہے تھے۔ اُس میں میری کی ہوئی تقریر (آپ نوائے وقت میں پڑھ لیں) میں نے اُن سے کہا کہ اپنے برادرِ اکبر سے کہیے کہ وہ اپنی انا کو چھوڑ دیں۔ دل بڑا کریں اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مسلم لیگ کو ایک کریں۔ ورنہ آپ کا ووٹ بنک پہلے ہی کم ہو رہا ہے، مزید تقسیم ہو جائے گا۔ آپ اور ق لیگ جب مقابلہ کریں گے تو جو سیٹ کی بوٹی ہے وہ کوئی اور چیل اُڑا کر لے جائے گی۔

☆ جب میں نے عارف نظامی صاحب سے کہا کہ آپ کو ایجنسیوں نے اخبار نکالنے کے لئے پیسے دیئے ہیں تو اُنھوں نے کہا کہ میں تو نہیں گیا مگر مجید نظامی صاحب اپنا دُکھڑا لے کر زرداری صاحب کے پاس گئے تھے؟

o اب سنیے، مجید نظامی صاحب اس لیے گئے کہ مجید نظامی صاحب نے انہیں مردِ حُر کہا ہوا تھا جب وہ جیل میں تھے۔ انہوں نے گیارہ سال جیل کاٹی، کیسے؟ یہ وہ جانتے ہیں۔ میں نے اُنہیں مردِ حُر کہا۔ میری اُن کی واقفیت یا دوستی جو بھی کہہ لیں، پہلے سے تھی جب وہ بے نظیر کے شوہر تھے۔ یہاں تک کہ ہماری اُن سے ملاقات پی ایم ہاؤس میں اور باہر بھی تھی۔ جب یہ (عارف نظامی) ملے تو پتا چلا انھوں نے اُن (آصف زرداری) کو اُلٹی سیدھی باتیں بتائی ہیں۔ جس طرح آپ کو بتائی ہیں کہ مجید نظامی صاحب نے یہ کہا وہ کہا۔ جیسے 1969ء میں نوائے وقت اخبار تو وہ بیچتے ہیں۔ ریزرویشن ان کا موجود ہے۔ دو لاکھ پینتیس ہزار جو اِن کو ادا کیا گیا اُسکی رسید موجود ہے۔ سودا ہوتا ہے اور سودا یہ کرتے ہیں لیکن کہتے یہ ہیں کہ مجید نظامی صاحب کے حالات پتلے تھے تو ہم نے رحم کرتے ہوئے اُنکو واپس بُلا لیا۔ کہاں بُلا لیا؟ اُس نوائے وقت میں جو بند ہو رہا تھا۔ جو ایک روز چھپ نہیں رہا تھا اور میں نے انھیں کاپی بھیجی۔ ٹھیک ہے جی، اور جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے۔ مجھے دوستوں نے کہا بھئی بہتر یہ ہے کہ آپ ان (زرداری صاحب) کو تصویر کا دوسرا رُخ بھی بتا دیں۔ وہ (عارف نظامی) اب اپنے آپ کو بڑا 'پپلیا' ثابت کرتے ہیں کہ میں پیپلز پارٹی ہوں اور آپ (زرداری) بھی پیپلز پارٹی ہیں۔ وہ (مجید نظامی) تو مسلم لیگی ہیں اور اینٹی پی پی پی ہیں۔

☆ ویسے آپ اینٹی پیپلز پارٹی ہیں؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o نہیں، میں سیاسی مبصر ہوں۔ وہ جو اچھا کام کرتے ہیں اُسکی ہم حمایت کرتے ہیں۔ مثلاً جب بھٹو نے کشمیر پر ہزار سال جنگ کرنیکی بات کی تو بھٹو ہمارا ہیرو تھا۔ اب بھی ہم لکھتے ہیں کہ: ''بھٹو کی بخشش کے لیے یہ کارنامہ کافی ہے کہ اُنھوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا تھا''۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مخالف ہونا اور بات ہے۔ لیکن خدانخواستہ اُسے دشمنی میں تبدیل نہیں کرنا چاہئے۔ مخالفت سے میری مراد ہے۔ I do not agree with you. اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ میل ملاقات بھی بند نہیں کرنی چاہئے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ دوستوں کے مشورے پر کہ زرداری کو دوسرے رُخ کا پتا ہونا چاہئے میں نے اُن (زرداری) سے ٹائم لیا۔ جب میں گیا تو اُس نے پانچ دس منٹ چائے نہیں منگوائی۔ میں نے کہا کہ کیا بات ہے میرے مردِ حُر کے پاس آج چائے کی پیالی بھی نہیں؟ کہنے لگا اوہو چائے منگاؤ بھئی چائے منگاؤ۔ اُن کے پریس سیکرٹری ہیں بابر صاحب، وہ بیٹھے ہوئے تھے وہ ان سب باتوں کے گواہ ہیں جو میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ میں نے کہا بھئی عارف آیا تھا آپ کو ملنے۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ آپ کو کیا بتا کر گئے ہیں۔ لیکن میں نے یہی سنا ہے کہ آپ ماشاءاللہ اُن کے فنانشل سپورٹر بنے ہیں، تو آپ کو یہ مبارک ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے پندرہ منٹ میں انھیں سارے معاملات کی تفصیل بتائی۔

☆ مسلم لیگیں اکٹھی کرنے میں سب سے بڑی رُکاوٹ کیا ہے؟

o نواز شریف، اُس کی انا۔ اب دیکھئے میں نے نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن میں نواز شریف کو بلایا۔ چودھری شجاعت کو دوسرے دن بلایا۔ پیر صاحب پگاڑا کو دعوت دی۔ انھوں نے کہا میں آنہیں سکتا۔ میرا نمائندہ آ کے بات کرے گا۔ پیر صاحب کے نمائندے نے آ کر کہا کہ پیر صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی یا کونسل میں کوئی عہدہ یا کوٹہ نہیں چاہئے۔ اگر مسلم لیگ اکٹھی ہوتی ہے تو فنکشنل مسلم لیگ غیر مشروط طور پر اُس کا حصہ ہوگی۔ نظامی صاحب اگر یہ کام

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کر سکتے ہیں تو انھیں یہ مبارک ہو۔ لیکن میاں صاحب نے پکڑائی نہیں دی۔
میں نے میاں صاحب کو کہا یہ وہی شجاعت ہیں جن کے گھر آپ خود فیملی ٹھہراتے تھے اور میں آپ کو منع کیا کرتا تھا کہ کبھی یہ آپ کے سیاسی حریف ہو سکتے ہیں یہ کام نہ کریں۔ میرا وہاں اسلام آباد میں پرانا، چھوٹا سا تین بیڈ روم کا مکان ہے۔ بہر حال غریب خانہ کہہ لیں۔ میں نے اُسے کہا میرے گھر آ جایئے۔ اُسے پتا تھا کہ وہ رہنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ (نواز شریف) اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ کہنے لگا کہ میں اُسے اپنی مسلم لیگ کا دفتر بنا دوں گا۔ میں نے کہا میرا دماغ خراب ہے کہ میں آپ کو اپنا گھر مسلم لیگ کے دفتر کے لیے دے دوں اور خود ہمیشہ کے لیے اُس سے فارغ ہو جاؤں۔ میرا آپ کی مسلم لیگ سے کیا تعلق ہے۔ میں تو کہتا ہوں قائد اور علامہ اقبال کی ایک متحدہ مسلم لیگ ہونی چاہیے۔ ن، ف یا ق نہیں ہونی چاہئے۔ جہاں تک زرداری صاحب کا تعلق ہے میں نے اُنھیں تصویر کے دوسرے رخ کے متعلق بتایا، جیسے آپ کو۔

☆ نظامی صاحب، وقت ٹی وی دوسرے ٹی وی چینلز کے مقابلے میں زیادہ آگے نہیں آ سکا۔ اُسکی وجہ کیا ہے؟

o اُس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تو عارف نظامی صاحب اس کے کرتا دھرتا تھے۔ انھوں نے صرف 'پھیرا' رکھا۔ سجاد میر کو میں نے کراچی سے بلایا۔ وہ معاملہ بھی نہیں چل سکا۔ پھر ایک دو، اور آئے جن کے سچی بات ہے مجھے نام بھی یاد نہیں۔ پھر جیسے کہ میں نے آپ کو بتایا جب میری بیٹی آئی تو میں نے کہا بیٹی آپ کو تجربہ نہیں ہے۔ لیکن آپ باہر سے پڑھ کر آئی ہیں۔ تمہیں سوجھ بوجھ ہے تم اِسے ہینڈل کرو لیکن قصور میرا ہے کہ روزِ اول سے میں نے کہا کہ

This is no non sense channel. یہاں خباثت نہیں ہوگی۔ اب اسے بہتر کرنا چاہتے ہیں کہ It should be the best news and views channel میں کہتا ہوں جس نے دیکھنا ہے دیکھے جس نے نہیں دیکھنا نہ دیکھے۔ جس طرح میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نوائے وقت کے بارے میں کہتا ہوں۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ بڑا خشک اخبار ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں انڈین ایکٹریس کی تصویر نہیں چھپے گی۔ اگر چھپ جائے تو میں جرمانہ کرتا ہوں۔ آپ جو مرضی کہہ لیں لیکن یہ میری پالیسی ہے۔

☆ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے نوائے وقت کی پالیسی جماعت اسلامی سے بہت ملتی جلتی ہے حالانکہ جماعت اسلامی نے پاکستان بننے کی مخالفت کی تھی؟

○ میرے خیال میں جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا تھا بلکہ 46ء کے انتخابات میں غیر جانبدار، رہ کے ایک قسم کی مخالفت کی تھی۔ میں نے اپنا مؤقف دوبار مولانا مودودی صاحب کے سامنے پیش کیا تھا۔ ایک دفعہ اُن کے گھر اور دوسری دفعہ قدرت اللہ شہاب کی بلائی ہوئی میٹنگ میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب جماعت اسلامی نظریۂ پاکستان کی حامی ہوگئی ہے لیکن یقین کریں مجھے ہنسی آتی ہے، جب وہ نظریۂ پاکستان کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ تحریک پاکستان کے وقت انھوں نے غیر جانبدار رہنا قبول کیا تھا۔ یہ ریکارڈ کی بات ہے کہ 1946ء میں تحریک پاکستان کے حق میں جماعت اسلامی نے ووٹ نہیں دیا تھا۔

○

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پاکستان میں پاکستان

25 دسمبر 1990ء کو روزنامہ ''پاکستان'' کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اخبار کے پہلے چیف ایڈیٹر ضیاء شاہد ''پاکستان'' کی ابتداء اور انتظامیہ سے اپنے اختلافات کی کہانی یوں بیان کرتے ہیں:

''نواز شریف جو اُن دنوں اپوزیشن میں تھے، اخبار نکالنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے ایک فنانسر اکبر علی بھٹی دیا، جسے میں نہیں جانتا تھا، وہ مشہور میڈیسن ڈیلر اور ایم این اے بھی رہے ہیں۔ میں نے بطور چیف ایڈیٹر ''پاکستان'' کا آغاز کیا۔ چند ماہ بعد ہی مالکان سے اختلافات جنم لینے لگے، وہ چاہتے تھے کہ ان کے میڈیسن کے بزنس میں ان کی مدد کروں، چونکہ ان کا تعلق مسلم لیگ سے ہے، لہٰذا حکومت کے خلاف کچھ نہ چھاپا جائے''۔((1

اِس روزنامے میں صحافتی اعتبار سے نئے تجربات کیے گئے۔ اخبار کے فرنٹ، بیک اور اندرونی صفحات پر رنگین تصاویر کی اشاعت شروع کی گئی۔ اسی طرح شوبز، سپورٹس، کامرس، کرائمز اور انٹرنیشنل خبروں کو علیحدہ باکس میں یا ان کے مکمل صفحات بنا کر شائع کیا۔ یہ تجربات کامیاب رہے اور یہ اخبار اچھا خاصا چل نکلا۔ ''روزنامہ پاکستان نکالنے کے لئے آٹھ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کروڑ روپیہ بینک سے قرض لیا گیا جو اخبار کے مالک نے واپس نہ کیا۔"(2) مالکان سے اختلافات کی بنا پر صرف چار ماہ سترہ دن بعد ضیا شاہد فارغ ہو گئے۔ ضیا شاہد کے بقول پیشہ ورانہ طور پر ایڈیٹر کیلئے بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ فنانسر کی بات مانے یا اپنی سوچ کے مطابق اخبار کو چلائے۔

1996ء تک یہ اخبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور ملکی سطح پر اسے ایک سنجیدہ اخبار کے طور پر لیا جاتا تھا۔ 1996ء میں ہی پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے انگریزی اخبار "پاکستان ٹائمز" کو خریدنے کیلئے اکبر علی بھٹی 4 کروڑ 55 لاکھ کی بولی تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ اردو میں "پاکستان" اور انگریزی میں "پاکستان ٹائمز" ان کے پاس ہو۔ اُس زمانے میں اتنی بڑی بولی لگانے کا مطلب یہ ہے کہ 1996ء تک ان کے پاس اچھے خاصے وسائل تھے یا ایسے وسائل کا بندوبست تھا۔ ظاہر ہے اتنی بھاری رقم کی بولی تو پاکستان ٹائمز کا ڈیکلریشن یا پریس وغیرہ کے لیے تھی۔ اخبار کو بعد میں چھاپنے اور چلانے کیلئے بھی ان کے ذہن میں کوئی منصوبہ بندی اور وسائل کا بندوبست ہوگا۔ 'پاکستان' اسلام آباد کے ایڈیٹر حامد میر کے بقول 1997ء کے وسط تک اکبر علی بھٹی نے اخبار بیچنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کیا اُفتاد آن پڑی کہ ایک سال کے اندر اندر اکبر علی بھٹی اس حال کو پہنچ گئے اس بات کی وضاحت بھی حامد میر ہی کرتے ہیں:

"جب نواز شریف وزیر اعظم بن گئے تو کچھ عرصے کے بعد ایک صبح انہوں نے مجھے، نصرت جاوید اور ظفر عباس کو ناشتے پر بلایا۔ ناشتے میں اُنھوں نے ٹھنڈی لسی کے دو گلاس غٹا غٹ پیئے اور ڈکار مار کر کہا کہ "یار میر صاحب! تُسی روزنامہ پاکستان دی ایڈیٹری چھڈ دیو، تسی بڑے وڈّے جرنلسٹ او تے ایہہ اخبار بڑا ای چھوٹا اے"

"یہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ وزیر اعظم صاحب سنجیدہ تھے۔ انہوں نے دو مرتبہ کہا کہ آپ کو روزنامہ پاکستان کی ایڈیٹر شپ چھوڑنا ہوگی اور کل تک مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کریں۔ شام کو مجھے دفتر میں پیغام ملا کر آپ کو حسن پیرزادہ نے وزیر اعظم ہاؤس بلایا ہے۔ پیرزادہ صاحب، نواز شریف خاندان کے فیملی فرینڈ اور بزرگ تھے اور ان کی حیثیت میاں محمد شریف کے نائب کی سی تھی۔ وہ وزیر اعظم ہاؤس ہی میں رہتے اور مجھ سے بہت پیار کرتے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھے انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ ''بھتیجے تم پاکستان اخبار کے چیف ایڈیٹر کیوں نہیں بن جاتے؟'' اور پھر سارا قصہ کھول دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اخبار کے اصل مالک اکبر علی بھٹی کو بنکوں کے نادہندہ ہونے کی وجہ سے جیل میں پھینک دیا جائے کیونکہ انہوں نے 1993ء میں نواز شریف کا ساتھ چھوڑ کر بلخ شیر مزاری کی نگران حکومت میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور اخبار کے تمام شیئرز شریف خاندان کا کوئی فرنٹ مین خرید کر اس پر اپنا چیف ایڈیٹر مسلط کر دے گا۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر حسن پیرزادہ سے معذرت کر لی اور دفتر جا کر اکبر علی بھٹی کو ساری کہانی بتا دی جس پر اُنھوں نے مہتاب خاں کو اخبار بیچنے کیلئے مذاکرات شروع کر دیے''۔(3)

اپنے ایک دوسرے انٹرویو میں حامد میر نے مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ بعد ازاں شہباز شریف، جو اس وقت پنجاب کے چیف منسٹر تھے، وہ کہنے لگے:

''آپ کو میاں صاحب نے کہا ہے کہ پاکستان اخبار چھوڑ دیں تو آپ کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟''

میں نے کہا کہ جی میں نہیں چھوڑنا چاہتا۔ انہوں نے کہا: ''دیکھیں اگر آپ نہیں چھوڑیں گے تو آپ کے چیف ایڈیٹر کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے''۔ لہٰذا ابتدائی طور پر میاں صاحبان مجھے روزنامہ پاکستان کا مالک بنانا چاہتے تھے لیکن میں نے جب انکار کر دیا تو اس کے بعد انہوں نے شامی صاحب اور سردار خاں نیازی کے ساتھ معاملہ کیا۔ بعد میں ان دونوں کی بھی آپس میں لڑائی ہو گئی۔''(4)

یوں روزنامہ پاکستان کی ملکیت یکم جنوری 1999ء کو مجیب الرحمن شامی کے پاس آ گئی۔ مگر شامی صاحب نہ تو اس معاملے میں حسن پیرزادہ کا کوئی کردار تسلیم کرتے ہیں۔ (ماسوائے اس کے کہ انہوں نے کہا تھا ''سردار خاں نیازی کو اپنے ساتھ ملا لیں'')۔ اور نہ ہی میاں صاحبان کے عمل دخل سے آگاہی کا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ کہتے ہیں:

''میرے اور بھٹی صاحب کے درمیان یہ معاہدہ آزادانہ طور پر طے ہوا''۔

اسی طرح سردار خاں نیازی بھی اس معاملے میں نواز شریف کی کسی مداخلت سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں صرف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

''نواز شریف اکبر علی بھٹی سے تنگ ضرور تھے اسے دباؤ میں بھی نواز شریف ہی لائے تھے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آج کل روزنامہ پاکستان دو حصوں میں منقسم ہے۔ اسلام آباد میں ایڈیٹر سردار خان نیازی اور لاہور میں مجیب الرحمان شامی ہیں۔ دونوں میں مقدمے بازی چل رہی ہے۔ سردار خاں نیازی کی عملداری میں پاکستان گروپ آف نیوز پیپرز کے زیر اہتمام روزنامہ پاکستان بیک وقت اسلام آباد، مظفر آباد، کراچی، ملتان اور کوئٹہ سے شائع ہوتا ہے۔

یہی ادارہ دوپہر کا اخبار ''میرا پاک وطن'' انگریزی اخبار ''ڈیلی دی پیٹریاٹ'' روزنامہ ''نوائے نواب شاہ''، ''ڈیلی ایکشن'' کراچی۔ ماہنامہ ''نیارخ'' کراچی، ہفت روزہ ''پاکستان زندہ باد'' کا انٹرنیشنل ایڈیشن برمنگھم (برطانیہ) سے بھی شائع کرتا ہے۔''(5)

علاوہ ازیں اسی ادارے کے تحت 'روز' ٹی وی بھی چل رہا ہے۔ اسلام آباد سے چھپنے والے روزنامہ ''پاکستان'' کی پرنٹنگ اور کاغذ دونوں معیاری نہیں۔ کوئی نامور کالم نگار بھی اس اخبار سے وابستہ نہیں۔ روزنامہ پاکستان اسلام آباد نیٹ پر بھی موجود ہے۔ 20 صفحات کا میگزین بھی نیٹ پر پڑھا جاسکتا ہے۔ اخبار کی ویب سائٹ میں بہتری کی بہت گنجائش ہے۔ جبکہ میگزین میں انفارمیشن بہت ہے مگر یہ تازگی سے محروم محسوس ہوتا ہے۔

''پاکستان'' کے مالک بننے سے پہلے مجیب الرحمان شامی ہفت روزہ ''زندگی'' نکالتے تھے۔ ''پاکستان'' کی ملکیت ملنے کے بعد اب وہ ''زندگی'' کو اس اخبار کے سنڈے میگزین کے طور پر چھاپ رہے ہیں۔ روزنامہ پاکستان اسلام آباد کے سنڈے میگزین کی طرح ''زندگی'' میگزین میں بھی اشتہارات بہت کم ہیں۔ یہ روٹین کا میگزین ہے جس میں کچھ بھی ہٹ کر یا نیا نہیں، بس میگزین چھاپنے کی خانہ پری کی جاتی ہے۔ اسی طرح رنگین سپیشل ایڈیشنز میں بھی کوئی خاص مواد نہیں ہوتا۔

1999ء میں شامی صاحب جیسے سینئر اخبار نویس نے جب ''پاکستان'' سنبھالا تو اخبار کافی حد تک سنبھل گیا اور پسند کیا جانے لگا۔ لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ اشتہارات تو خاصے ہوتے ہیں مگر اخبار کا معیار وہ نہیں جو نوے کی دہائی میں تھا۔ شامی صاحب کے چیف ایڈیٹر ہوتے ہوئے اخبار کا لاوارث محسوس ہونا سمجھ سے بالاتر ہے۔ ویسے تو پاکستان میں شوبز اور فلمی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہیں اور اخبار اِدھر اُدھر سے خبریں لگا کر کام چلاتے ہیں مگر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خبروں کا دہرایا جانا اور پرانی خبروں کو شائع کرنا بہر حال ایک حیران کن امر ہے۔

لاہور میں روزنامہ 'پاکستان' کی سرکولیشن خاص قابلِ ذکر نہیں ((6 شامی صاحب کا ادارہ ''پاکستان گروپ آف پبلیکیشنز'' کے نام سے کام کرتا ہے۔ جس کے زیر اہتمام روزنامہ ''پاکستان'' بیک وقت لاہور، کراچی، ملتان، پشاور اور راولپنڈی سے شائع ہوتا ہے۔ ہفت روزہ ''زندگی'' دوپہر کا اخبار ''یلغار'' اور ماہنامہ قومی ڈائجسٹ بھی یہی گروپ شائع کرتا ہے۔

قومی ڈائجسٹ سنجیدہ مواد پر مبنی ایک رسالہ ہے جس میں ادب، سیاست اور سماجیات پر خوبصورت اور بھرپور تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ اس میں ہر مہینے چھپنے والا انٹرویو بھی عموماً بہت اچھا ہوتا ہے۔ 'قومی ڈائجسٹ' ادارے کی اچھی پیش کش ہے مگر اس کو بہتر مارکٹنگ کی ضرورت ہے۔

بہر حال محسوس یوں ہوتا ہے جیسے روزنامہ ''پاکستان'' کے دونوں مالکان سردار خاں نیازی اور مجیب الرحمان شامی کا دھیان اخبار سے زیادہ دیگر ''کاروباری امور'' پر ہے۔ روزنامہ پاکستان کے معاملات کو سمجھنے کیلئے پہلے سردار خاں نیازی صاحب اور بعد ازاں مجیب الرحمان شامی صاحب کا انٹرویو کیا۔ سردار خاں نیازی کے ہاں دیئے گئے وقت پر پہنچنے کے بعد کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ ان کے منیجر نے وقفے وقفے سے چائے قہوے اور بسکٹس سے تواضع کرنے کی کوشش کی اور اپنے ادارے کے حوالے سے مختلف دستاویزات دیں۔ جن میں روزنامہ ''پاکستان'' اور ''پیٹریاٹ'' کی خبروں پر چیف جسٹس کی طرف سے لئے جانے والے از خود نوٹس اپنے مختلف اخباروں کی کاپیاں اور دیگر کاغذات اور کالم وغیرہ شامل تھے۔

سردار خاں صاحب تشریف لائے تو کہنے لگے میں صرف آپ کی وجہ سے آیا ہوں اور آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ مگر انٹرویو کے دوران جب ان کے پراپرٹی کے کاروبار کے حوالے سے سوالات کیے تو برا مان گئے۔ نیازی صاحب کا خیال تھا کہ موضوعِ سخن مجیب الرحمان شامی ہی کو رہنا چاہئے۔ ان کے اخبارات اور ٹی وی، رافع پلازہ اور رافع مال میں دکانیں، فوڈ کورٹ وغیرہ خریدنے کی پیش کش بذریعہ اشتہارات کرتے ہیں اور یہ سارا بزنس وہ خود چلاتے ہیں۔ مزید برآں انہوں نے اپنے انٹرویو میں ملک کے 40 بڑے بزنس گروپس کی ایک لسٹ بھی دی جس کے مطابق ان کا 'SK Group' پاکستان میں 34 ویں نمبر پر ہے۔ بزنس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گروپ کے پہلے ہی تعارفی جملے میں لکھا ہے: ''سردار خاں گروپ آف کمپنیز'' چھ کمپنیوں پر مشتمل ہے جو بزنس کے مختلف شعبوں میں سرگرم عمل ہے، جیسے رئیل اِسٹیٹ، ڈویلپر، بلڈرز، میڈیا، تجارت اور انرجی سیکٹر''۔(7

یہ انٹرویو 20 جولائی 2011 کو روزنامہ ''پاکستان'' اسلام آباد کے آفس میں ریکارڈ کیا گیا۔

سردار خاں نیازی

س: پاکستان اخبار کی ملکیت کے حوالے سے آپ کا مجیب الرحمان شامی سے کیا قضیہ تھا؟

نیازی: ہمارا شامی صاحب سے پہلا رشتہ ''زندگی'' رسالے کی وجہ سے قائم ہوا۔

☆ آپ ''زندگی'' میں لکھتے رہے ہیں؟

o ''زندگی'' میرا تھا۔ اصل میں یہ رسالہ الطاف حسن قریشی صاحب کا تھا اور اُن سے شامی صاحب نے اسے خریدا۔ شامی صاحب اور الطاف حسن قریشی کو ہم اس وقت بہت ہی نظریاتی جرنلسٹ سمجھتے تھے اور بہت متاثر بھی تھے۔ جنرل ضیاء کے گھر ان کا بہت آنا جانا تھا اور میرے والد صاحب کے بھی جنرل ضیاء سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ہماری ملاقات وہیں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر سعید الٰہی جو اُس وقت پی ایم اے کے لیڈر اور ہمارے اور شامی صاحب کے مشترکہ دوست تھے اُنھی کے توسط سے ہمارا شامی صاحب سے ''نکاح'' ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر سعید الٰہی مجھے کہنے لگے کہ ''نیازی صاحب شامی صاحب بہت مشکل میں ہیں۔ وہ رسالہ لے تو بیٹھے ہیں مگر اُن سے چلتا نہیں۔'' اب ان کا مسئلہ حل کرنا ہے۔ اپنا بزنس گروپ اس وقت میں ہی چلا رہا تھا۔ مجھے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ میں نے چیلنج قبول کیا اور شامی صاحب سے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں کتنے میں آپ کا مسئلہ حل ہوگا؟ کہنے لگے 15 لاکھ میں ہم سکھی ہو جائیں گے۔ میں نے 15 لاکھ کا چیک دے دیا۔ وہ چیک شامی صاحب نے کیش بھی کرا لیا۔ یہ سارا ریکارڈ میرے پاس موجود ہے اور سعید الٰہی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گواہ بھی ہے۔ اس طرح ہماری قربتیں بڑھ گئیں۔ آپ جانتے ہیں کہ رسالوں سے اتنی کوئی خاص آمدن تو ہوتی نہیں لیکن میرا جرنلزم کو سیکھنے اور سمجھنے بوجھنے کا جو شوق تھا اس کی بھی تسکین ہوگئی اور شامی صاحب کی ذاتی زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع بھی مل گیا۔

'پاکستان' اخبار کا سلسلہ تو کافی عرصے بعد شروع ہوا۔ اس سے پہلے میں 'زندگی' رسالے میں لکھتا بھی تھا اور مجلس ادارت میں میرا نام بھی چھپتا تھا۔ جب 'پاکستان' کی باری آئی تو مجھے ان باتوں کا کچھ علم نہیں تھا کہ اخبار کے مالک اکبر علی بھٹی ہیں یا ان سے کوئی اخبار خریدا جا رہا ہے۔ اس وقت مسلم لیگ کی حکومت تھی اور میاں برادران بھٹی کے خلاف تھے۔ اخبار کا دفتر میلوڈی، اسلام آباد میں تھا اور حامد میر ایڈیٹر تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے حامد میر کو نواز شریف نے بلایا اور کہا کہ ہم کہیں سے اِنوسٹمنٹ کا بندوبست کرتے ہیں اور آپ کو اس اخبار کا مالک بنا دیتے ہیں۔ مگر حامد میر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اس پھڈّے میں نہیں پڑوں گا۔

نواز شریف پرائم منسٹر تھا اور حسن پیرزادہ اس کے گھر میں ہی رہتے تھے، جن سے ہمارا تعلق یہ تھا کہ ہمارے بزنس گروپ نے پاکستان میں پہلی دفعہ ڈائیلیسز مشینیں درآمد کی تھیں اور اپنے ویلفیئر ٹرسٹ کے تحت ایک فری ہسپتال بنوایا تھا۔ حسن پیرزادہ ویلفیئر کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے، وہ نواز شریف کے پیر بنے ہوئے تھے، میں بھی اُن کے پاس جاتا تھا اور حامد میر بھی۔ وہاں ہم بہت دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔

میں گالف کھیلتا تھا، اُس وقت بھی اور اب بھی میں آرمی گالف کلب کا وائس پریزیڈنٹ ہوں۔ ایک دفعہ ہم نے نواز شریف کو بلایا، اور میں نے ہی آرمی کے گالف کلب میں سارا انتظام کیا۔

نواز شریف کو میرے بارے میں بس یہی پتا تھا کہ میں گالفر اور جنرل نیازی کا داماد ہوں۔ جنرل نیازی میرا چچا بھی ہے اور سسر بھی۔ نواز شریف کو بزنس یا جرنلزم سے میرے تعلق کا علم نہیں تھا۔ البتہ نواز شریف کو جب اپنی کمپنی کی طرف سے میں نے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ڈائلیسز مشینیں دیں تو تب بھی مختصر سی ملاقات ہوئی۔

جیسا کہ میں ذکر کر رہا تھا کہ ایک دن حسن پیرزادہ صاحب نے کہا کہ وہ حامد تو نہیں مانا اب آپ اخبار میں اِنوسٹمنٹ کریں۔ پہلے بھی آپ اور مجیب الرحمن شامی ''زندگی'' میں اکٹھے ہیں۔ مالک آپ ہونگے اور اخبار شامی چلائے گا۔ وہ اخبار چلانے کیلئے تیار ہے۔ اس وقت انڈرسٹینڈنگ دی گئی کہ شامی اخبار کو بطور ''ایمپلائی ایڈیٹر'' کے طور پر چلائے گا اور مالک آپ ہوں گے۔ میں کسی حد تک راضی ہوگیا۔ اُنھی دنوں میں عمرے پر گیا تو پیچھے بھٹی کو گرفتار کرلیا گیا۔

اچھا جب پاکستان اخبار لینے کی بات چل رہی تھی تو اس وقت کوئی ایسی انڈرسٹینڈنگ نہیں ہوئی تھی کہ شامی صاحب اخبار میں حصہ دار ہوں گے۔ کیونکہ میں ''زندگی'' کے لیے پہلے ہی پیسے دے چکا تھا جو کہ اخبار کے معاملے سے چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔

☆ اُنھوں نے آپ کو کوئی پیسہ واپس نہیں کیا؟

○ زندگی رسالے میں وہ ہر مہینے نقصان ہی دکھایا کرتے تھے۔ لیکن اخبار کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ اس میں نقصان نہیں ہوگا۔ پھر ہم نے دو کروڑ کے چیک 'باریکس پاکستان' کے نام دے دیئے، جو کہ کمپنی میں جمع ہو گئے اور آج تک ریکارڈ میں ہیں۔ یہ معاملہ 1999ء کا ہے۔ مجھے اس وقت اتنا پتا نہیں تھا کہ اخبار کا کوئی ڈیکلریشن ہوتا ہے یا ایک فرد پبلشر ہوتا ہے یا کمپنی پبلشر ہوتی ہے۔ اس وقت دو کروڑ کی بہت بڑی رقم ہوتی تھی، اس دو کروڑ کے علاوہ ہم نے اسے رننگ کیپٹل بھی دیا۔

ابتدائی طور پر جب ہم نے ٹیک اوور کیا تو اخبار ہمیں تقریباً 3 کروڑ میں پڑا۔ تقریباً 7 کروڑ روپے اکبر بھٹی کے ذمے بنک کا قرضہ تھا۔ وہ بھی ہماری کمپنی باریکس کو ٹرانسفر ہوگیا۔ شامی صاحب نے مختلف ڈائریکٹر بنالیے اور میرا نام بطور چیئرمین باریکس کمپنی' پورے ملک میں جہاں جہاں سے اخبار چھپتا تھا ''پاکستان'' میں چھاپنا شروع کردیا۔ مجھے نہیں پتا وہ اندر خانے کیا کھچڑی پکاتے رہے یا ان کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیا نیت تھی؟ اُس وقت شہباز شریف پنجاب کا چیف منسٹر تھا اور شعیب بن عزیز ڈی جی پی آر۔ میں جب مجیب الرحمن شامی کے پاس جاتا تھا تو یہ دونوں بھی اکثر وہاں بیٹھے ہوتے تھے۔ بدقسمتی سے یہ سارا معاملہ طے کروانے والے حسن پیرزادہ فوت ہو گئے۔

شرائط کے کاغذات تیاری کے مراحل میں تھے، تفصیلات زبانی طور پر ہمارے درمیان حسن پیرزادہ نے طے کیں تھیں مثلاً یہ کہ شامی صاحب اخبار میں کس حیثیت میں کام کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ شامی صاحب کی کوئی اِنوسٹمنٹ تو تھی نہیں بلکہ شامی صاحب اس زمانے میں بہت کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ اچھا اب جب حسن پیرزادہ کی وفات ہوگئی تو شامی صاحب کا رنگ اور طور طریقے تبدیل ہو گئے۔ جب میں بطور چیئرمین میٹنگ کرنے جاتا تو یہ میٹنگ ہی نہ کرتے اور کاغذات میں ہیرا پھیری شروع کرادی۔ ہمارے ملک کا المیہ یہ ہے کہ جو جرنلسٹ جتنا زیادہ ٹی وی پر آتا ہے اُتنا ہی بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ وہ بلیک میل کرتا ہے، اور لوگ بھی اُس سے ڈرتے ہیں۔ خیر شامی صاحب نے ''پھڑائی'' دینا بند کردی۔ ہیڈ آفس لاہور میں تھا اور سارے کاغذات شامی صاحب کو دیئے گئے تھے۔ مدار المہام بھی وہی تھے۔ جبکہ حقیقتاً جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ پرچہ باریکس نے خریدا تھا اور باریکس کا چیئرمین میں تھا۔ کاغذات سارے شامی صاحب نے بنوانے تھے۔ مجھے تو ڈیکلیریشن اور 'Nominee' وغیرہ کا بھی پتا نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہوتا ہے۔

پھر الطاف قریشی نے مجھے کہا کہ یہ سلسلہ تو بہت خراب ہے، آپ کے ساتھ تو دھوکہ ہو گیا کیونکہ جو آدمی آپ کے درمیان تھا وہ تو انتقال کر گیا لہٰذا اب تو شامی ملازم نہیں رہے گا۔ پھر مختصراً یہ کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی جیسا ایک معاہدہ انھوں نے بنایا اور الطاف حسن قریشی صاحب نے مجھے کہا کہ اب تو آپ کو شامی کو شیئر ہولڈر ماننا پڑے گا۔ اس طرح ایک کروڑ کے شیئرز میں نے اُسے بطور قرضہ دیئے اور طے یہ ہوا کہ یہ قرضہ وہ تین سال میں مجھے واپس کرے گا۔

ٹوٹل 3 کروڑ کے شیئرز تھے۔ 1 کروڑ کے شیئرز خورد برد کر کے انھوں نے اپنے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نام کر لیے۔ الطاف حسن قریشی اور ابن حسن ٹرسٹی تھے۔ 1 کروڑ کے شیئرز تین سالوں میں شامی نے کہاں واپس کرنے تھے۔ دو تین کروڑ مزید کھا گئے۔ باریکس کی پراپرٹی اور دکانیں بیچ دیں، پلاٹ بیچ دیئے۔ الطاف حسن قریشی اور ابن حسن نے اپنے شیئرز مجھے دے دیئے۔ اسی دوران ہم ہائی کورٹ میں چلے گئے۔ اس سے پہلے ہم ایس ای سی پی (SECP) میں گئے تو وہاں بھی شامی نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ اب اُن دنوں ایک اور المیہ تھا کہ شامی صاحب پاکستان اخبار کی ایڈیٹر شپ کی بنیاد پر تین سال CPNE کے اور ایک سال APNS کے صدر رہے۔

☆ اخباری مالکان بھی آپ کو سپورٹ نہیں کر رہے تھے؟

○ شامی ان کا پرانا بندہ تھا مجھے تو کوئی جانتا بھی نہیں تھا اسلئے کوئی سپورٹ نہیں کر رہا تھا۔ ہائی کورٹ میں جسٹس علی نواز چوہان نے بھی اڑھائی تین سال لگا دیے۔ بہر حال فیصلہ کر دیا کہ اس معاملے کی انوسٹی گیشن ہونی چاہئے اور انوسٹی گیشن کوئی فارن کمپنی کرے۔ میں اور شامی صاحب دونوں عدالت میں تھے۔ شامی صاحب کو جسٹس چوہان نے کہا کہ جب آپ خود اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں کہ میرا کوئی پیسہ نہیں لگا تو پھر شیئر آپ کے کہاں سے آ گئے؟ یہ کہنے لگا کہ نیازی صاحب مجھ سے شیئر نہیں مانگ رہے یہ تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ کوئی فارن کمپنی یہ انوسٹی گیشن کرے کہ یہ کمپنی کس کی ہے اور اخبار کس کا ہے۔ کیونکہ رشید بھٹی اشتہاری (Absconder) تھا۔ لہٰذا ڈیکلریشن بھی جعلی طریقے سے شامی صاحب نے اپنے نام کروا لیے۔ رشید بھٹی امریکہ میں ہوتا ہے۔ بعد میں وہ آیا اور لکھ کر عدالت میں بیان دے دیا کہ: ''ہم نے پیسے سردار خاں نیازی سے لیے تھے اور انھی سے ہمارا معاہدہ تھا۔ یہ باریکس کا پرچہ تھا اور یہ جو لاہور کا ڈیکلریشن عمر مجیب شامی کے نام ہوا ہے یہ جعلی طریقے سے ہوا ہے۔ کیونکہ میں اس وقت اشتہاری تھا اور اشتہاری تو ڈی سی او کے سامنے پیش ہی نہیں ہو سکتا۔''

جسٹس عظمت سعید اور جسٹس آصف سعید کھوسہ پر مشتمل ہائی کورٹ کا بنچ انوسٹی گیشن کر رہا تھا۔ چونکہ شامی CPNE اور APNS کا صدر تھا اس لئے یہ انوسٹی گیشن

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس نے رُکوادی۔ انوسٹی گیشن پر stay نہیں ہوتا۔ انہوں نے سات سال stay لیے رکھا۔ stay خارج ہونے کے بعد بنچ نے دوبارہ کیس سنگل بنچ کو بھیج دیا۔ یہ بھی ہمارے ملک میں بدقسمتی ہے کہ نو سال سے ایک کیس لٹکا ہوا ہے۔

☆ تو آپ سمجھتے ہیں کہ عدلیہ جانبدار نہیں ہے؟

○ جی بالکل غیر جانبدار نہیں ہے۔ میں تو یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ اخبار میرا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ رہا تھا کہ fact اور زمینی حقائق دیکھنے کیلئے انوسٹی گیشن کرلیں کہ کمپنی کس کی ہے؟ یہ اخبار کمپنی کا ہے کہ کسی فرد کا اور شیئرز کا تعین کریں کہ کس تناسب سے کس کو اِیشو ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس نے stay کروالیا۔ جسٹس خواجہ شریف شامی صاحب کے دوست تھے۔ اُنھوں نے اپنے عرصے میں پتا بھی نہیں ہلنے دیا۔

☆ تو آپ سمجھتے ہیں کہ خواجہ شریف بھی غیر جانبدار جج نہیں تھے؟

○ وہ تو بالکل غیر جانبدار جج نہیں تھے۔ سمجھتے کیا ہیں، میں تو openly کہہ رہا ہوں کہ وہ جانبدار جج تھے۔ اُنھیں جو شامی صاحب کہتے تھے وہ وہی کرتے تھے۔ اسی لیے لاہور کے ڈیکلریشن کا کیس بھی ابھی تک طے نہیں ہوا۔ انھوں نے اس کیس کو ہائی کورٹ سے نکلنے ہی نہیں دیا گیا۔ اس طرح ایک کیس ہائی کورٹ میں ہے، تین سپریم کورٹ میں۔

اچھا اسلام آباد کے معاملات میں جہاں جلدی میں ان سے کمی بیشی رہ گئی وہاں تو میں کنٹرول کر گیا۔ کوئٹہ کا ڈیکلریشن میں نے کسی تھرڈ پارٹی سے خریدا۔ اس کا اکبر بھٹی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ ڈیکلریشن بھی میں نے اسی جھگڑے کی وجہ سے خریدا چونکہ موجودہ قانون کے مطابق جس کے پاس پرانا ڈیکلریشن ہوتا ہے وہی مالک ہوتا ہے اور کوئٹہ کا ڈیکلریشن اکبر بھٹی کے ''پاکستان'' سے بہت پہلے کا ہے۔

☆ جیسا کہ آپ بتا رہے ہیں آپ کی شامی صاحب سے بہت پرانی شناسائی تھی تو آپ نے اُن سے نہیں پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

○ شامی صاحب CPNE اور APNS کے صدر اور منہ زور آدمی تھے۔ اگر مجید نظامی نہ ہوتے تو وہ مجھے جیل بھجوا دیتے، جیسے اکبر بھٹی کو بھجوایا تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ مجید نظامی نے آپ کی حمایت کی؟

o بہت کی اور یہ حمایت اُنھوں نے میرٹ پر کی۔ میں اُن سے بہت متاثر ہوں۔ مجھے تو APNS اور CPNE میں حمید ہارون وغیرہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور شامی صاحب سے سارے ڈرتے تھے۔ مگر ڈرنے کے باوجود حمید ہارون نے Arbitration دی جب وہ APNS کے صدر تھے۔ انہوں نے بھی لکھا کہ ساری انوسٹمنٹ نیازی صاحب کی ہے۔

☆ اگر مجیب الرحمان شامی آپ کے ساتھ وہ سلوک نہ کرتے جو آپ بتا رہے ہیں تو شاید آج بھی آپ مالک، اور وہ ایڈیٹر ہوتے۔ یعنی آپ عملی طور پر جرنلزم میں نہ آتے جس طرح کہ اب ہیں؟

o عملی طور پر تو میں نے جرنلزم میں آنا ہی تھا۔ اس معاملے کے تھوڑے عرصے بعد مسنگ پرسنز (Missing persons) کا کیس میں نے ہی اٹھایا تھا۔ رہ گئی شامی صاحب کے مالک ہونے کی بات تو وہ اب بھی اس اخبار کے مالک نہیں ہیں۔ وہ تو ایک قبضہ گروپ ہیں۔ انھوں نے میری جائیداد پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اللہ ان سے پوچھے گا۔ ہم تو چھوٹے لوگ ہیں۔ چونکہ پاکستان میں بڑے جرنلسٹوں پر سوال اُٹھانے والا کوئی نہیں لہذا وہ جسے چاہیں بلیک میل کر لیتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس آئے تھے، اُن کے پاس کرایہ تک نہیں تھا اور وہ اپنے آرٹیکلز میں میرے کاروبار کی تعریفیں لکھتے تھے۔ یہ دیکھ لیں انہوں نے اپنے دستخطوں سے میرے کاروبار کے متعلق اخبار میں چھاپا ہوا ہے۔ (سردار خاں نیازی نے فوٹو کاپیاں دکھائیں اور فراہم بھی کیں) اگر کبھی میں ان کے پاس جاتا تو میرے سامنے نہیں بیٹھتے تھے۔ ان پر میرے اتنے احسان ہیں۔ میں نے انہیں ساڑھے تین چار کروڑ روپے خرچ کر کے ایک پلیٹ فارم کا مالک بنایا۔ اگر وہ مجھے عزت دیتے تو میرا اُن سے جھگڑا ہی کیا تھا۔ پھر انہوں نے باریکس کی ملکیت بہت سی جائیدادیں، فلیٹ، مکان، دکانیں بیچ دیں۔ صنم گارڈن اسلام آباد میں چار پلاٹ بیچ دیئے۔ صرف باریکس کمپنی کی جیل روڈ لاہور والی بلڈنگ رہ گئی ہے، باقی اُنھوں نے کچھ نہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چھوڑا۔

☆ وہ بچ کیسے سکتے تھے؟

o بس اس وقت ان کا طوطی بولتا تھا۔

☆ یہ سب مشرف کے دور میں ہوا؟

o مشرف کے دور ہی میں ہوا ہے جب پرویز الٰہی وزیر اعلیٰ تھا۔ پرویز الٰہی اُن کے ملازموں کی طرح تھا۔ شامی صاحب کہتے تھے میں اس کا استاد رہا ہوں۔ میں نے پرویز الٰہی کو پڑھایا ہے۔ میں اس کا ٹیچر ہوں۔

☆ پرویز الٰہی نے بھی آپ کا کوئی ساتھ نہیں دیا؟

o پرویز الٰہی بندہ ہی ان کا تھا۔

☆ مجیب الرحمان شامی صاحب میڈیا، ٹیلی ویژن، اخبار میں تو مذہب، اسلام اور اخلاقیات کی بہت تبلیغ اور پرچار کرتے ہیں لیکن عملی طور پر آپ بالکل اور ہی شکل بتا رہے ہیں؟

o عملی طور پر میں بتا رہا ہوں؟ آپ کو اچھی طرح پتا ہے۔ جناب، جب وہ میرے پاس اخبار میں آیا تھا تو مصطفی صادق کہتے ہیں کہ پانچ سو روپے بس کا کرایہ اُن سے لے کر آیا تھا۔ مصطفی صادق سے پوچھ لیں۔ جو اس کا قریبی دوست تھا۔ آپ اُنھیں جانتے ہوں گے نام سنا ہوگا۔ (مصطفی صادق اس وقت زندہ تھے)۔

☆: وفاق والے

o ہاں۔ پانچ سو مصطفی صادق سے لیکر آیا تھا اور یہاں اسلام آباد سے لاہور واپسی کیلئے دو ہزار روپے مجھ سے لیے تھے۔

☆ یہ دو ہزار واپس کر دیے تھے اُنھوں نے؟

o (ہنستے ہوئے) نہیں۔ یہ ایجنسیوں کے پے رول پر تھا۔ 'جلسہ عام' کے نام سے کالم لکھتا تھا۔ آئی بی والے اس کو پیسے دیتے تھے۔ پھر اتنی جلدی یہ امیر ہوا۔ ہمارے کاروبار کے چرچے لکھتا تھا۔ ''زندگی'' میں بھی اس نے کئی بار لکھا اور پاکستان کے اداریے جو اس نے لکھے وہ بھی میں نے آپ کو دیے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ آئی بی کا تو آپ نے نام بتایا۔ دیگر ایجنسیوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ یہ کن ایجنسیوں کے پے رول پر تھے؟

o یار آپ ریکارڈ بھی کر رہے ہیں اور مجھ سے پوچھنا بھی چاہتے ہیں۔ جو آپ اُسے سمجھتے ہیں وہ اُسکے سو فیصد بلکہ ایک سو دس فیصد اُلٹ ہے۔ سو نہیں ایک سو دس پرسنٹ۔

☆ کیسے؟

o آپ کے سامنے ہے پریکٹیکل۔

☆ ویسے ہمارے سامنے تو۔۔۔ ان کا بہت اچھا امیج ہے۔۔۔

o آپ ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔ آپ کے سامنے ہے کہ وہ ٹھیک شخصیت نہیں ہے۔

☆ آپ کچھ بتائیں گے تو مجھے پتا چلے گا۔

o دیکھیں، آپ کے سامنے ہے۔۔۔ اگر بندہ ٹھیک ہوتا تو جب جج نے کہا کہ ایک معاملے کی انوسٹی گیشن ہونی چاہیے۔ اس کے دل میں چور نہ ہوتا تو وہ انوسٹی گیشن ہونے دیتا۔ آپ جسٹس چوہان کا فیصلہ پڑھ لیں۔

☆ نیازی صاحب یہ بتائیں کہ پاکستان اخبار باریکس یا شامی صاحب کو دلوانے میں نواز شریف کا کیا رول تھا؟

o پتا نہیں نواز شریف کا کیا رول تھا۔ اس وقت میں نواز شریف کا واقف نہیں تھا، وہ تو حسن پیرزادہ سب کچھ پہلے کروا رہے تھے۔

☆ لیکن کچھ رول تو ہوگا؟

o نواز شریف کا کیا رول ہو سکتا ہے؟ پیسے میں نے جمع کروائے تھے۔ ہاں نواز شریف اکبر بھٹی کو Under-Cloud لایا تھا۔ شامی صاحب نے نواز شریف کو کہا تھا کہ اس کو پکڑیں، اسے جیل میں شامی صاحب ہی نے ڈلوایا تھا۔

☆ گویا کہ یہ اخبار پر قبضہ کرنے کا پلان تھا؟

o مجھے نہیں پتا۔ میں کنفرم نہیں کر سکتا۔ لیکن شامی اس طرح کے کرتوت کرتا رہتا ہے کہ لوگوں کو انڈر پریشر لا کے بلیک میل کیا جائے۔ شاید اس نے ان کو پٹی پڑھائی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہو۔ ہاں اکبر بھٹی سے نواز شریف تنگ ضرور تھے۔

☆ یعنی اُنھوں نے اکبر بھٹی کو سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا؟

o یہ میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھے حقیقت کا اتنا پتہ نہیں، سیاسی انتقام تھا یا نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ نواز شریف کو پٹی شامی نے پڑھائی ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اکبر بھٹی کو اندر انھوں نے ہی کروایا۔

☆ آپ نے بتایا کہ شہباز شریف اور شعیب بن عزیز شامی صاحب کے پاس آ کر بیٹھے ہوتے تھے۔۔۔

o چونکہ ان کا تعلق تھا۔ شامی سے ان کا تعلق آج بھی ہے۔

☆ اب تو سنا ہے شریف برادران کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہیں ہیں؟ شریف برادران شامی صاحب کو پسند نہیں کرتے؟

o یار آپ کو ساری باتوں کا پتا ہے۔ آپ ماڈل ٹاؤن، گلبرگ چلے جائیں جہاں سب ناجائز پٹرول پمپ گرا دیے گئے، جبکہ شامی کے پٹرول پمپ کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا، بلکہ اُس نے تو دو پمپ اور ایشو کروا لیے ہیں۔

☆ مجیب الرحمن شامی نے؟

o جی ہاں انھیں دو پٹرول پمپوں کے لئے جگہ ایل ڈی اے نے دی ہے۔

☆ ان کا وہ پمپ بھی ناجائز ہے جو نہیں گرایا گیا؟

o ان کی کون سی چیز ہے جو جائز ہے؟ آپ ریکارڈ کر رہے ہیں۔ ایک دن پارک ویو والے عبدالعلیم (پرویز الٰہی کے دور کے آئی ٹی منسٹر) کا Brother in law فراز چودھری میرے پاس آیا۔ اور مجھے بتایا کہ شامی صاحب نے ہمارے ساتھ بہت دھوکہ کیا ہے۔ میں نے پوچھا کیا دھوکہ ہو گیا؟ اس نے بتایا کہ پرویز الٰہی کے دور میں فیڈرل گورنمنٹ سے پارک ویو (مہاجروں کی) میں ڈیڑھ سو کنال زمین کا الاٹمنٹ لیٹر شامی لے آیا اور ہم سے آٹھ کروڑ روپیہ لے لیا۔ بعد میں زمین کی الاٹمنٹ کینسل ہو گئی ہے اور ڈی ایچ اے (DHA) والے ہمیں نیب میں لے جا رہے ہیں۔ کیونکہ زمین ہم نے آگے DHA لاہور کو بیچ دی تھی۔ شامی صاحب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اب ''پھڑائی'' نہیں دے رہے۔ پھر متروکہ وقف املاک کا چیئرمین آصف ہاشمی میرے پاس آیا۔ خیر ابھی تو وہ ڈرا ہوا ہے کیس کو آگے نہیں چلا رہا۔ کہتا ہے کہ شامی صاحب کے خلاف قبضے کا ریفرنس دائر ہو جائے گا۔ لاہور میں لارنس روڈ پر متروکہ وقف املاک کے دو فلیٹ بھی شامی نے الاٹ کروائے ہیں اور جیل روڈ پر ہماری بلڈنگ کے پیچھے متروکہ وقف ٹرسٹ کی چھ کنال زمین پر بھی اُنھوں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ اس کا ریفرنس داخل ہو چکا ہے۔ لیکن فی الحال آصف ہاشمی نے معاملے کو دبا دیا ہے۔ اس کو بھی ڈرا سا دیا ہے۔ ویلیوٹی وی بھی ایک الگ سے ڈرامہ ہے۔ دیکھیں جی آپ لاہور میں بیٹھے ہیں۔ جتنے بڑے فراڈ وہ کرتا ہے کوئی اسے پوچھتا تک نہیں۔ جس کیس میں مونس الٰہی اندر ہے اس کیس میں اصل بندہ (Culprit) تو عمر تھا۔

☆ عمر کیسے؟

o عمر مجیب شامی بھی اس چکر میں شامل تھا۔

☆ اس نے بھی کوئی پیسے ویسے لیے؟

o ہاں، اس کا تو کوئی نام نہیں لیتا۔

☆ تقریباً کتنے پیسے؟

o پتا نہیں، اب تو یہ لوگ کروڑ پتی ہیں، بڑے لوگ ہیں۔ ہم تو ان کے 'پاسکو' بھی نہیں۔ بلکہ اب تو ہم ان سے ڈرتے ہیں۔

☆ اچھا۔ آپ کو وہ ڈراتے بھی ہیں؟

o ہاں۔۔۔ ڈراتے ہیں۔ کہتے ہیں شہباز شریف ہمارے پاس آیا تھا۔

☆ شہباز شریف یا نواز شریف نے آپ کو کبھی دھمکی دینے کی کوشش کی؟

o نہیں کبھی نہیں۔ شامی صاحب نے نیچے سنبھالا ہوا ہے۔ سیکرٹریز وغیرہ سے بنا کر رکھی ہوئی ہے۔

☆ مجیب الرحمن شامی نے کبھی آپ کو براہِ راست دھمکایا؟

o وہ میری جگہ پر قبضہ کر کے بیٹھا ہوا ہے جبکہ میں کرائے پر بیٹھا ہوں اس سے زیادہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دھمکانا کیا ہوتا ہے۔ اخبار میرا ہے اور لاہور سے نکال وہ رہا ہے۔ اخبار کی ملکیت کا سپریم کورٹ میں کیس چل رہا ہے اور وہ APNS کا صدر بن بیٹھا ہے۔ ٹی وی پر بڑی دلیری سے آتا ہے، قرضے معاف کرواتا ہے۔

☆ نیشنل بنک سے قرضوں کا بھی کوئی ایشو تھا؟

o نیشنل بنک میں ان کا رشتہ دار ہے۔ اس نے انھیں 5 یا 6 ملین قرضہ دیا تھا۔ ذاتی استعمال کیلئے بعد میں وہ قرضہ شامی نے معاف کروالیا۔ قرضے معاف کروانے کے حوالے سے سپریم کورٹ میں جو کیس چل رہا ہے اس میں شامی صاحب کا بھی نام ہے۔ صحافیوں میں سے یہی موصوف ہیں جن کا نام قرضے معاف کروانے والوں میں شامل ہے۔ نہ تو آج تک کسی عدالت نے انوسٹی گیٹ کروایا نہ ہمارے ایشو کا فیصلہ ہوا۔

☆ سپریم کورٹ بھی ان کیسز میں آپ کی فیور نہیں کرتی؟

o اب سپریم کورٹ کی یہ حالت ہے کہ زیادہ تر از خود نوٹس میرے اخباروں کی خبروں پر ہوتے ہیں۔ میرے اخبار کی خبر پر گم شدہ افراد (Missing persons) کا نوٹس لیا گیا۔ میں نے ملٹی پروفیشنل ہاؤسنگ سوسائٹی کی خبر دی اور از خود نوٹس کے بعد سپریم کورٹ کو میں نے ہی ثبوت مہیا کیے، اس کیس میں سپریم کورٹ نے تاریخی فیصلہ دیا۔ اِس سوسائٹی کو سی ڈی اے نے فیصل مسجد کے ساتھ پورا سیکٹر مفت دے دیا تھا۔ یہ ایک سو پچاس ارب کی زمین تھی، جس پر اس گروپ نے کام بھی شروع کر دیا تھا۔ پراجیکٹ میں تین سیون سٹار ہوٹل تھے اور فیصل بٹ اس کے کرتا دھرتا تھے۔ یہ معاملہ موجودہ حکومت کا کارنامہ ہے۔ مجھے بہت لوگ کہتے رہے کہ آپ بیک آؤٹ کر جائیں۔ سپریم کورٹ رپورٹس مانگتا رہا اور ہم دیتے رہے۔

☆ کون لوگ آپ کو بیک آؤٹ کا کہتے، نام لینا پسند کریں گے؟

o نام اس لیے نہیں لوں گا کہ ان میں بہت بڑے بڑے لوگوں کے نام آتے ہیں۔

☆ آرمی کے لوگ تھے؟

o نہیں! آرمی کا تو اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ سیاسی لوگ؟

o ہاں! سیاسی لوگ تھے۔ ڈھائی سال ہم نے کیس لڑا۔ اس میں بڑے سے بڑا وکیل تھا۔ بہرحال عدالت نے وہ منصوبہ ختم کیا۔ لیکن میں ذاتی کیسز میں دھکے کھا رہا ہوں۔ ہم تو چاہتے ہیں انوسٹی گیٹ ہو' پاکستان' اخبار کا اصل مالک کون ہے؟ اس کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا۔

☆ آپ پنڈی میں ٹھیکیداری کرتے تھے۔ آرمی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ آپ کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا کہ آپ اخبار کے مالک بن گئے؟

o میرے والد کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ میں خود کاروبار میں بعد میں آیا میرے بھائی پہلے سے تھے۔ سرگودھا کارن وے ہم نے بنایا۔ شامی صاحب نے بھی ہمارے کاروبار کے بارے میں لکھا۔

☆ پراپرٹی کا کام آپ نے کب شروع کیا؟

o پراپرٹی کا کوئی خاص کام نہیں ہے۔ ہم خریدتے بیچتے نہیں ہیں۔ والد صاحب کی بنائی ہوئی جائیداد ہے اسی کو بیچ کر ہم کھا رہے ہیں۔ اب تو پندرہ بیس سال ہو گئے ہم نے کچھ خریدا بھی نہیں۔

☆ اچھا یہ فرمائیں، پنڈی میں یہ خاص رجحان (Trend) ہے کہ پراپرٹی ڈیلر اخبار بھی نکالتے ہیں؟

o میں پراپرٹی ڈیلر نہیں ہوں۔ جو پراپرٹی ڈیلر اخبار نکالتے ہیں ان کے کوئی خاص مقاصد ہونگے۔ ہم تو ٹرسٹ چلاتے ہیں اور یہ اخبار بھی ایک ٹرسٹ کے ذریعے چل رہا ہے۔ ہم پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ شامی صاحب نے G-12 میں چار پلاٹ الاٹ کروائے اور بیچ دیئے۔

☆ اپنے نام پر یا کسی کے نام پر؟

o اپنے نام پر۔ بیٹے اور بھتیجے کے نام پر اس طرح کے بے شمار قصے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں کہے گا کہ میں نے ایک بھی پلاٹ الاٹ کروایا ہو۔ کوئی ہم پر ایک روپے کا الزام نہیں لگا سکتا۔ نیب، نواز شریف، فوج اور پیپلز پارٹی کی حکومتیں بھی آئی ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک روپے کی کرپشن کوئی ہم پر ثابت نہیں کر سکتا۔

☆ میں نے آپ سے Categorically پوچھا کہ پراپرٹی ڈیلر یا۔۔۔

o (سردار خاں نیازی غصے میں آ گئے اور سوال کے بیچ میں ہی بول پڑے) پراپرٹی ڈیلروں سے پوچھیں!

☆ آپ اس Category میں نہیں آتے۔۔۔؟

o آپ۔۔۔ آپ رہتے ہی احمقوں کی جنت میں ہیں۔ اسی لیے آپ اتنا گندہ سوال کر رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہی نہیں ہے کہ میں پراپرٹی ڈیلر نہیں ہوں آپ جرنلسٹ کس کے ہیں؟ آپ نے مجھے پراپرٹی ڈیلنگ کرتے دیکھا ہے؟

☆ میں تو Public Perception کی بات کر رہا ہوں۔

o تو غلط سوال ہی نہ کریں۔ کوئی ایسا Public Perception نہیں۔ میں پراپرٹی ڈیلنگ کرتا تو ایسا ہوتا۔ مثال کے طور پر 'اساس' والے پراپرٹی ڈیلنگ کرتے ہیں۔ کالونیاں ڈویلپ کرتے ہیں۔ ہماری اگر والد کے زمانے کی پرانی زمین پڑی ہے، اس کے اگر کہیں پچاس ساٹھ کنال رقبے کو ڈویلپ کر کے ہم نے بیچا ہے تو اس کو تو پراپرٹی ڈیلنگ نہیں کہتے۔ ہم سی این جی سیکٹر میں کام کرتے ہیں۔ امپورٹ کرتے ہیں۔ ڈیفنس منسٹری سے کام کرتے ہیں ہماری ایس کے گروپ کی مختلف کمپنیاں ہیں۔ پورے ملک میں ہمارے 38 گیس سٹیشن ہیں۔ ملک میں پہلی بار سی این جی ہماری کمپنی نے ہی متعارف کروائی تھی۔

☆ یعنی بنیادی طور پر آپ نے میڈیا سے کچھ بھی نہیں کمایا؟

o کوئی منافع نہیں لیا اور نہ ہم کسی چیز کو چھپانا چاہتے ہیں۔ اب غور سے سنیں کیونکہ آپ کا Perseption ہے۔ آپ جرنلسٹ ہیں آپ کو پتا ہونا چاہئے۔ آپ کو نالج ہونا چاہئے۔ Poor نالج کے ساتھ کسی کا انٹرویو نہ کریں۔ میرے پاس "روز" کے نام سے پہلا اور واحد ٹی وی چینل ہے جس کی اسلام آباد سے اپ لنکنگ ہے۔ جیو بھی دوبئی سے اپ لنکنگ کرتا تھا۔ جیو، اے آر وائی، دنیا، کسی کے پاس بھی ایسا لائسنس نہیں اور بڑی بڑی دنیا آج کل آپ کو پتا ہی ہے لائسنسوں کے پیچھے پھر رہی ہے اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مجھے کروڑوں کی آفر ہے اور اگر مجھے اپنے تحفظ (Safe Side) کی ضرورت ہوتی تو میں اپنا ٹی وی شروع کر لیتا۔ لوگ پیسے لگانے کیلئے تیار ہیں۔

☆ آپ کا اخباری گروپ نو پرافٹ نو لاس کی بنیاد پر چل رہا ہے؟

o بس کسی کی مدد ہو جاتی ہے تو ہم اس کو بہت بڑا فائدہ سمجھتے ہیں۔ لوگ نہیں مانیں گے کیونکہ جرنلسٹوں کے کیا معاملات ہیں آپ کو پتا ہی ہے۔ لوگ آج کل ہر کسی کو چور یا اس کی کوئی مصلحت سمجھتے ہیں اور مصلحت ہوتی بھی ہے۔ لیکن ہماری کوئی مصلحت نہیں ہے نہ ہمارا حلقہ (Constituency) فوج ہے نہ سیاسی لوگ ہیں۔ ہم بالکل صاف ستھرے لوگ ہیں۔ یہ گیلپ سروے ہے۔ اس میں جنگ اور نوائے وقت گروپ بھی ہیں۔ 23 نمبر پر ہمارا گروپ ہے۔ یہ رپورٹ ویب سائٹس پر بھی ہے۔ (مذکورہ دستاویز کی کاپی بھی انہوں نے فراہم کی)

☆ نیازی صاحب آپ اسلام آباد کے ایک بڑے اخبار کے مالک ہیں۔ آپ کو ٹی وی ٹاک شوز میں لوگ بلاتے نہیں ہیں یا آپ جاتے نہیں؟

o دیکھیں ہم عملی لوگ ہیں۔ فیلڈ میں جاتے ہیں۔ ہماری رپورٹنگ پر سب سے زیادہ سپریم کورٹ نے از خود نوٹس لیے ہیں۔ میں بنیادی طور پر سپورٹس مین ہوں۔ خود ہی گریز کرتا ہوں۔ مجھے اتنا شو شا کا شوق بھی نہیں ہے ورنہ اپنا چینل کھول لیتا۔ ان چیزوں کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتا کہ شامی صاحب کی طرح ہر وقت ٹی وی پر بیٹھا رہوں تاکہ لوگ مجھ سے ڈریں۔ کوئی تنگ کرے تو چلا بھی جاتا ہوں لیکن شامی صاحب کی طرح وتیرہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے وہ ججوں، جرنیلوں اور لوگوں کو ڈرا کے رکھتے ہیں۔ خواہ کوئی ڈرے نہ ڈرے۔ وہ ایسے اپنے معاملات کو چھپاتے ہیں۔ تو ہمارا کوئی ایسا سلسلہ نہیں ہے کہ ہم معاملات کو چھپائیں۔

☆ حامد میر کا بھی آپ نے ذکر کیا' پاکستان' اخبار کے معاملے میں۔۔۔

o دیکھیں حامد میر کے اور معاملات کو تو ہم نہیں سمجھتے، لیکن اس معاملے میں حامد میر نے بڑے کردار والی بات کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں پارٹی نہیں بنوں گا کہ اکبر بھٹی کو ننگ کیا جائے یا کسی اور کو فائدہ پہنچایا جائے۔ یہ اس کی کریکٹر والی بات تھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جو میں نے حسن پیرزادہ سے سنی تھی۔

☆ آپ ایک میڈیا گروپ چلا رہے ہیں، تو آپ اسے پروفیشن نہیں، عبادت سمجھ کے کر رہے ہیں؟

o وہی پروفیشن ہوتا ہے جس کو عبادت سمجھ کر کیا جائے مالی فائدے سے بھی روٹی کھانی ہوتی ہے۔ سکون لینا ہوتا ہے۔ میں دیہاتوں میں کھلی کچہریاں کرتا ہوں۔ لوگوں کو انصاف دلوا کر بھی سکون ملتا ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ شامی صاحب کو بھی میں نے ہی ایکسپوز کیا ہے۔ آپ کا تو سارا لاہور اس سے ڈرتا تھا۔ نہ کوئی اب لکھتا ہے۔ اخباروں اور اے پی این ایس کے فورم پر میں نے ہی بات اُٹھائی۔ اور بھی بہت لوگوں کو میں نے ایکسپوز کیا۔

☆ اور کون کون سے لوگ ہیں؟

o اب ان کا کیا نام لینا، آپ کو پتا ہی ہے۔

☆ مثلاً کن لوگوں کو؟

o نہیں نہیں، ان کے متعلق میری آپ سے بات چیت نہیں ہو رہی۔ شامی کے موضوع پہ بات ہو رہی ہے۔

☆ فرض کریں۔۔۔

o نہیں نہیں۔۔۔ کیوں؟ ہنستے ہوئے۔ آپ کو سارا پتا ہے، مجھ سے زیادہ آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ (' آف دی ریکارڈ' انھوں نے ایک دو شخصیات کا ذکر کر دیا)۔

☆ اچھا نیازی صاحب یہ فرمایئے گا کہ پاکستان میں پچھلے چند سالوں سے جس طرح سنچری گروپ کا ایکسپریس آیا، اذکار، اساس اور جناح اخبار آیا اور بڑے ٹی وی چینل جس طرح اے آر وائی گروپ ہے۔ بڑے بزنس مینوں نے اپنے اخبار اور میڈیا گروپ بنائے۔۔۔ کیا آپ سمجھتے ہیں؟

نیازی: (بات کاٹ کر) یہ آپ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کو سمجھ نہیں ہے یا آپ کو نالج نہیں ہے یا آپ کو پتہ نہیں ہے اگر کوئی جائز طریقے سے کاروبار کرتا ہے، شامی صاحب کی طرح زمینوں پر قبضے نہیں کرتا یا لاہور میں تین چار پٹرول پمپ سرکاری طور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پر خورد برد کر کے نہیں لگاتا بلکہ اپنے جائز کاروبار سے کام چلاتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔

میر شکیل الرحمن کا بھی کاروبار ہے۔ جنریٹرز اور ائیر کنڈیشنر پلانٹ کی تمام ایجنسیاں ''ڈان'' کے حمید ہارون کے پاس ہیں۔ اب مجید نظامی صاحب پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی ساری کتابوں کے ٹھیکے لے کر چھاپتے ہیں۔ شکیل الرحمن سب سے بڑا بزنس مین ہے۔ یہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ لاکھانی بزنس مین تھے اور بعد میں اخبار میں آئے ہیں اور دوسرے لوگ بھی اخبار میں آئے ہیں تو بزنس شروع کیا۔

☆ غلط یا صحیح، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بزنس گروپس اپنے کاروباری تحفظ کیلئے اخبار نکالتے ہیں یا اپنے چینل کا سہارا لیتے ہیں؟

○ دیکھیں اٹھارھویں ترمیم کو میں نے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا تھا اور سترہ ججوں کے سامنے میں خود دلائل دیتا تھا۔ آپ جانتے ہوں گے جسٹس رمدے بہت تیز مزاج جج تھے انہوں نے ایک دو چبھتے ہوئے سوال کیے تو میں نے کہا کہ آپ لوگ جرنلسٹوں، ججوں، وکیلوں اور جرنیلوں کا احتساب نہیں کرتے۔ ہمیں یہ بات کرنی چاہئے اگر کوئی جرنلزم میں آ گیا تو کیا ہو گیا۔ مشرف کے دور میں کراچی، سندھ میں لاکھانیوں کا ایکسپریس اخبار، جنگ سے بھی آگے نکل گیا تھا مگر مشرف نے پھر بھی لاکھانی کو اندر کر دیا، اخبار اُسے تو نہیں بچا سکا۔ وہ تو ہماری گورنمنٹ اور عدلیہ ٹھیک ہونی چاہئے کہ جو کسی کو بھی غلط کام کرنے ہی نہ دے۔ آپ ریکارڈ چیک کر لیں 2000ء کی بات ہے، سندھ میں لاکھانی کا ایکسپریس نمبر ون تھا۔ جنگ کوئی نہیں پڑھتا تھا، ایکسپریس پڑھتے تھے۔ مشرف نے آ کر اسے بزنس کے حوالے سے ہی گرفتار کیا۔ اخبار زوروں پر تھا مگر اسکی ڈھال نہ بن سکا۔ وہ بہت عرصہ اندر رہا۔ اگر حکومت کچھ کرنا چاہے تو اخبار ڈھال نہیں بن سکتا۔

☆ لیکن آپ کہہ رہے ہیں بڑے جرنلسٹوں کو کوئی نہیں پوچھتا؟

○ اگر کوئی صحیح گورنمنٹ ہو گی تو ان کو بھی پوچھ لے گی اگر کوئی تگڑا حکمران آ گیا اور ججز بھی تگڑے ہوئے تو ان کو بھی پوچھ لے گا۔ آپ کی اور ہماری سوچ تو یہ ہونی چاہئے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ اس کو ڈھال بننے ہی نہ دیا جائے اور معاملات میرٹ پر طے ہوں۔ دیکھیں یہ ایف سیون جناح پارک (اسلام آباد) میں میکڈونلڈ تھا۔ اس پر ہم نے سٹوری دی اور اس کے بعد سلطان لاکھانی مجھ سے ناراض بھی رہا لیکن ہم نے اس کیس کی پیروی کی۔

☆ سلطان لاکھانی آپ سے کیوں ناراض رہا؟

o کہ یہ سٹوری کیوں دی۔

☆ ان کا کیا مفاد تھا؟

o احسن لاکھانی ان کا بھائی ہے۔ جناح پارک میں انھی کا میکڈونلڈ تھا۔

☆ ان کی chain پورے پاکستان میں ہے؟

o لاہور میں عمران خان ٹاور میں جو میکڈونلڈ ہے اس میں شاید شہباز شریف کا کوئی معاملہ ہے۔ مجھے تفصیل کا پتا نہیں، بہرحال میکڈونلڈ احسن لاکھانی کی چین (Chain) ہے۔

☆ آپ جس طرح بیان کر رہے ہیں کہ اتنے زیادہ کیسز کو آپ نے اٹھایا اور کورٹ میں لے گئے، کوئی دھمکیاں وغیرہ ملتی ہیں؟

o روزانہ ملتی ہیں۔

☆ کس ٹائپ کے لوگ ہیں اور دھمکیاں کس طرح کی ہوتی ہیں؟

o جن لوگوں کے مالی نقصانات ہوتے ہیں وہ دھمکاتے ہیں۔

☆ مثلاً کیا دھمکیاں ہوتی ہیں؟

o Life threats ہوتی ہیں اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔ فون کر کے دھمکاتے ہیں۔ میرے پاس تو نہ کوئی گن مین ہے۔ گاڑی بھی خود چلاتا ہوں اور نہ میں جرنلسٹوں سے ڈرتا ہوں۔

☆ اچھا نیازی صاحب یہ ویج بورڈ کا کیا ایشو ہے؟

o ہم تو یہ کہتے ہیں جوں جوں چیزوں کی قیمتیں اور اخراجات بڑھتے ہیں تو کارکنوں کے بھی اخراجات بڑھتے ہیں۔ مگر اخباروں میں کوئی انکریمنٹ نہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے۔ لیکن ایمپلائز کو بھی مالکان کو بلیک میل نہیں کرنا چاہئے کہ کام ہی نہ کریں اور ویج بورڈ مانگیں۔ یا کام ہی نہ کریں اور تنخواہ مانگیں۔ لیکن صحافی کی آمدنی میں اضافہ ضرور ہونا چاہیے۔

☆ اخبارات مالکان ویج بورڈ کے خلاف کیوں ہیں؟

○ دیکھیں جی وہ بڑے لوگ ہیں ان کے لیے انکریمنٹ ہوتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ایسے نہیں ہونا چاہئے اور ان کو مل بیٹھ کر کام کو سلجھانا چاہئے۔

☆ اس کے نفاذ میں رُکاوٹ کیا ہے؟

○ نقصان یہ ہے کہ وکیل ہی کروڑ کروڑ روپیہ اخباری مالکان سے فیس لے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے اخباری مالکان اور صحافی بیٹھ جائیں تو کوئی حل نکل آئے گا۔ یا پھر گورنمنٹ صلح نہیں ہونے دیتی ہوگی۔ میں تو بالکل اس حق میں ہوں کہ اخباری کارکنوں کی تنخواہوں میں اضافہ کرنا چاہیے، چاہے کوئی ڈرائیور ہے یا صحافی۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اشتہار کا ریٹ 40 فیصد زیادہ کرو تو پھر کارکنوں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ بھی ہونا چاہئے۔

☆ نیازی صاحب یہ آپ کی ٹیبل کے اوپر، آپ کی مشرف کے ساتھ بھی تصویر لگی ہوئی ہے۔ آپ کا کوئی خصوصی تعلق تھا اس سے؟

○ یہ اس لیے نہیں اتاری کہ اب وہ چلا گیا تو میں اتار دوں۔ بس گالف کھیلنے کے حوالے سے تعلق تھا۔

مجیب الرحمن شامی

ملک کے معروف صحافی ہیں۔ وہ تقریباً گزشتہ پانچ دہائیوں سے عملی طور پر صحافت سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اپنی صحافت کا آغاز ساٹھ کی دہائی کے وسط میں روزنامہ ''حریت'' کراچی سے کیا۔ زیادہ شہرت ستر کی دہائی کے اوائل میں بھٹو مخالف تحریروں کی وجہ سے ملی جس کی پاداش میں ان پر 1972ء میں مارشل لاء کے ضابطے کے تحت مقدمہ بنا اور جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔ وہ بھٹو کے مخالف ترین اور ضیاالحق کے قریب ترین صحافیوں میں شمار

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیے جاتے رہے ہیں۔ مگر آج وہ بھٹو کو بڑا عوامی لیڈر اور ملکی اثاثہ تسلیم کرتے ہیں۔ شامی صاحب کا شمار ان صحافیوں میں ہوتا ہے جن کے ذکر کے بغیر ملک کی صحافتی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ان کا شمار دائیں بازو کے نمائندہ صحافی کے طور پر ہوتا ہے۔ مگر کچھ عرصے سے ان کے نقطہ نظر میں واضح توازن محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے روزنامہ پاکستان کی پالیسی کے طور پر یوں کیا ہے۔ ''روزنامہ پاکستان'' پاکستان کے نظریے پر پختہ یقین رکھتا ہے، اس کے نزدیک اسلام پاکستان کی روح ہے، اس کے بغیر اس کا وجود بے معنی ہے۔ لیکن روزنامہ ''پاکستان'' اسلام کی جاہلانہ اور جاگیردارانہ تعبیر پر یقین نہیں رکھتا، اسلام کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ہر شہری کے ساتھ یکساں سلوک ہو، اس کے یکساں حقوق ہوں، مملکت کے وسائل پر سب کا یکساں حق تسلیم کیا جائے اور عوام کی عزت نفس کو مجروح کرنے والے اس پاک سرزمین کے باغی اور غدار قرار دیے جائیں۔''

شامی صاحب کے نقطہ نظر سے اختلاف ہوسکتا ہے مگر ان کا شمار ان چند خوش قسمت لوگوں میں ہوتا ہے جن کو خدا نے لکھنے اور بولنے کی دونوں نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان کے حوالے سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ لکھاری اچھے ہیں یا مقرر۔ وہ بولتے ہوئے بلاتکان دلائل در دلائل دیے جاتے ہیں۔ 'جلسہ عام' کے عنوان سے نوائے وقت، جنگ اور دیگر اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہے ہیں۔ یکم جنوری 1999ء سے وہ روزنامہ پاکستان کے چیف ایڈیٹر کے طور پر فرائض انجام دے رہے ہیں اور آج کل وہ دنیا ٹی وی پر بطور تجزیہ کار ''نقطہ نظر'' کے نام سے پروگرام بھی کررہے ہیں۔

انٹرویو کیلئے بارہا رابطہ کرنے کے باوجود جب معاملہ نہ بن پایا تو شامی صاحب کے نام ایک صفحے کا مختصر خط ارسال کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ آپ کے حوالے سے کچھ چھاپنے سے پہلے آپ کا موقف جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ اپریل 2012ء کے پہلے ہفتے میں روزنامہ ''پاکستان'' لاہور آفس میں ان کے انٹرویو کا پہلا حصہ ریکارڈ ہوا۔ گفتگو کے ساتھ چائے اور بسکٹ بھی چلتے رہے۔ شامی صاحب کے صاحبزادے عثمان شامی کتاب ہذا کے لیے ہماری تصویریں بناتے رہے۔

روزنامہ پاکستان کے ڈیکلریشن کے حوالے سے گفتگو شروع ہوئی تو انٹرویو کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دوران ہی میں شامی صاحب نے اسلام آباد ہائی کورٹ کے اپنے حق میں ہونے والے تفصیلی فیصلے کی کاپی بھی دی جس کے مطابق سردار خاں نیازی نے 22 مارچ 2001ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اسلام آباد کو درخواست دی کہ ''روزنامہ پاکستان کے پبلشر عمر شامی نے ایک معاہدے کے تحت 27 جون 2000ء کو روزنامہ ''پاکستان'' کا ڈیکلریشن میرے حق میں سرنڈر کر دیا ہے (کاپی درخواست سے لف ہے) لہٰذا بطور پبلشر میری تصدیق کی جائے۔''

اس درخواست کے نتیجے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اسلام آباد نے قانونی کارروائی کے بعد 13 جون 2001ء کو روزنامہ پاکستان اسلام آباد کا ڈیکلریشن عمر شامی کے نام سے منسوخ کر کے اِسی روز سردار خاں نیازی کے نام جاری کر دیا۔ اس فیصلے کے خلاف عمر شامی اسلام آباد ہائی کورٹ میں چلے گئے۔ لہٰذا 12 نومبر 2008ء کو کورٹ نے یہ کہتے ہوئے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے خلاف ضابطہ کارروائی کی ہے، لہٰذا فیصلہ عمر شامی کے حق میں کر دیا گیا۔

پہلی نشست کے چند دن بعد شامی صاحب کی کال آگئی کہ آپ نے فیصلہ پڑھا ہے کہ نہیں؟ خیر کچھ توقف کے بعد 10 جولائی 2012ء کو انٹرویو کا دوسرا حصہ ریکارڈ ہوا۔ انٹرویو کے دوران نجم ولی خاں بھی آگئے اور سوال و جواب کے دوران مسکرانے کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ انٹرویو ختم ہونے تک گفتگو بے تکلف رنگ اختیار کر چکی تھی۔ اپنی سواری آگئی تو شامی صاحب سے اجازت چاہی مگر انھوں نے کہا سواری کو جانے دیجئے کھانا کھائے بغیر آپ نہیں جا سکتے۔ ایک پر تکلف لنچ کے بعد اُنھوں نے انکار کے باوجود اپنی گاڑی پر ڈراپ بھی کروایا۔ انٹرویو کے دوران شامی صاحب نے تمام سوالات کا نہایت تحمل سے جواب دیا۔ زیرِ نظر انٹرویو محض روزنامہ پاکستان کے معاملات ہی نہیں بلکہ اُن کی صحافتی زندگی، خیالات اور سیاسی کردار کا احاطہ بھی کرتا ہے۔

☆ یہ فرمائیے کہ پاکستان اخبار کی ملکیت آپ کو کیسے ملی؟

○ یہ تو کوئی راز نہیں ہے۔ اکبر علی بھٹی صاحب اِس اخبار کے مالک تھے اور یہ ادارہ بہت مالی مشکلات کا شکار تھا۔ لہٰذا وہ مختلف دوستوں کے پاس گئے کہ وہ اِس اخبار کو لے لیں۔ میرے پاس بھی تشریف لائے۔ پھر اُن سے بات چیت ہوتی رہی۔ ایک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زمانے میں جب ''پاکستان'' اخبار روزنامہ 'دن' کے پاس چلا گیا تھا۔ میں اِس کا ایڈیٹر تھا۔ دن اخبار کے مالک جناب محمود صادق نے اِس اخبار کو ٹھیکے پر لے لیا تھا۔ ڈاکٹر سعید الٰہی میرے دوست ہیں انہوں نے مجھے مجبور کیا بلکہ میرے ایڈیٹر ہونے کا اعلان بھی کر دیا لہٰذا اِس طرح پاکستان اخبار کی ایڈیٹر شپ میں نے سنبھال لی۔

اکبر علی بھٹی اخبار کے معاملے میں مختلف دوستوں کے پاس گئے اِس طرح وہ میرے پاس بھی آئے۔ اُن کے ساتھ بات چیت اور بحث و مباحث چلتے رہے اور بالآخر میرے اور اُن کے درمیان معاملات طے پا گئے۔ ابتدائی طور پر تو یہ بھی طے ہوا تھا کہ محمود صادق صاحب بھی میرے شریک کار ہونگے لیکن بعد میں انہوں نے مناسب سمجھا کہ وہ اِس معاملے میں شامل نہ ہوں۔ تو اِس طرح یہ اخبار میری ذمہ داری میں آ گیا۔ اکبر علی بھٹی سے معاہدہ طے پا گیا اور ہم نے یہ اخبار حاصل کر لیا۔ اِس اخبار پر بنکوں کا بہت قرض تھا جو اُن کیلئے مشکلات کا باعث بنا ہوا تھا۔ ہم نے ایک طرح سے یہ قرض اپنے ذمے لے لیا اور وہی اُسکی قیمت تھی۔ اسی طرح اخبار کی جو پرنٹنگ کمپنی تھی اُسی کا سارا بوجھ تھا۔ روزنامہ پاکستان اُس کمپنی کا حصہ نہیں تھا۔ ڈیکلریشن اکبر علی بھٹی کے بھائی کے نام پر تھا۔ یہ دونوں بھائی آپس میں معاہدہ کر کے چلتے تھے، بہر حال ہم نے اُن سے دونوں چیزیں حاصل کر لیں۔

☆ لیکن آپ اپنے اداریوں میں لکھتے رہے کہ ''پاکستان کو چلانے والی کمپنی کے چیئرمین جناب سردار خاں نیازی ہیں جن کے کاروبار کی وسعت اور نوعیت سے اسلام آباد اور راولپنڈی کے رہنے والے بخوبی واقف ہیں''۔ تو یہ بتایئے کہ نیازی صاحب کا اِس اخبار کے ساتھ کیا معاملہ تھا؟

o سردار خاں نیازی صاحب ہمارے دوست تھے اور شاید اب بھی ہیں۔ جس زمانے میں اخبار لینے کے حوالے سے میری بات چیت چل رہی تھی، انہوں نے بھی میرے ساتھ شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لہٰذا جب روزنامہ پاکستان اور باریکس لمیٹڈ کا معاملہ میں نے بھٹی صاحب سے کر لیا تو پھر کچھ دوستوں کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ معاملات کو چلانے کیلئے کچھ سرمایہ کاری کریں۔ ہمارے پاس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کوئی خاص ذرائع نہیں تھے محض ساکھ اور مہارت تھی اور تعاون پہ آمادہ کچھ دوست تھے۔ چنانچہ ہم نے ان کے ساتھ گفتگو کی۔ سردار خاں نیازی صاحب بھی اس معاملہ میں شریک تھے۔ باقی دوستوں نے بھی پرنٹنگ کمپنی کے شیئرز حاصل کیے۔ یہ نواز شریف صاحب کا زمانہ تھا ان کے بعد پرویز مشرف صاحب آئے مگر اُنکے ساتھ ہمارا معاملہ اس طرح نہ رہا جس طرح نواز شریف صاحب کے ساتھ تھا۔ ہمیں ان کے ساتھ اختلاف رہا اور کوئی ایڈجسٹمنٹ نہ کر سکے۔

اِسی دوران سردار خاں نیازی نے ہمارے خلاف مقدمے بازی شروع کر دی اور مختلف جگہوں پر درخواستیں دینی شروع کر دیں۔ اُنھوں نے طرح طرح کا موقف اختیار کیا اور کوشش کی کہ روزنامہ پاکستان پر ان کا تسلط ہو جائے۔ ہمارے پاس ان سے طے شدہ تمام معاہدات تحریری شکل میں موجود ہیں۔

ایس ای سی پی میں انہوں نے درخواست دی اور اس سارے معاملے کی انکوائری کیلئے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ اس انکوائری کی تریسٹھ صفحات پر مشتمل رپورٹ بھی موجود ہے۔ پھر اے پی این ایس نے ثالثی کے لیے حمید ہارون کو ثالث مقرر کیا جنھوں نے اس حوالے سے رپورٹ بھی لکھی، بدقسمتی سے نیازی صاحب نے کسی رپورٹ پر عمل نہیں کیا، لہٰذا ہمارے اور ان کے درمیان قانونی چارہ جوئی چل رہی ہے اور بے شمار مقدمات عدالتوں میں ہیں۔

☆ سردار خان نیازی تو یہ کہتے ہیں کہ شامی صاحب بہت بار سوخ ہیں، ٹی وی پر آتے ہیں اور اسی اخبار کی بنیاد پر وہ اے پی این ایس کے صدر بھی رہے اور میں ایک قسم کا مظلوم ہوں، کوئی میری بات ہی نہیں سنتا۔

o بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو دو باتیں بتائی ہیں۔ ایک ایس ای سی پی کے انسپکٹر کی رپورٹ ہے۔ ایک اے پی این ایس کے صدر کی ثالثی کا فیصلہ ہے۔ یہ آپ دیکھ لیں۔ باقی کے مقدمات عدالتوں میں ہیں۔ میں ان پر رائے زنی نہیں کرنا چاہتا۔

☆ وہ کہتے ہیں کہ دو کروڑ روپیہ میں نے انویسٹ کیا؟

o میری اس پر بحث ہی نہیں ہے۔ انہوں نے پیسے دیے۔ ایک کروڑ روپے ان کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قرضہ ہے اور ایک کروڑ روپیہ انہوں نے انویسٹ کیا۔ اور انہوں نے باریکس لمیٹڈ کے شیئرز خریدے۔ اسکے بعد اخبار کے معاملات اُن کے اپنے طے شدہ معاہدے کے مطابق چلتے رہے۔ روزنامہ پاکستان کا ڈیکلریشن میرے بیٹے عمر شامی صاحب کے نام منتقل ہوا اور باریکس لمیٹڈ کے چیئرمین کے طور پر نیازی صاحب نے ذمہ داری سنبھالی۔ آپ کو معلوم ہے کہ کمپنی کے چیئرمین کا عہدہ علامتی ہوتا ہے۔ میں کمپنی کا چیف ایگزیکٹو تھا۔ نیازی صاحب اور عمر شامی صاحب کے درمیان ہی اخبار چھاپنے کا معاہدہ ہوا۔ مجھ سے کسی نے پوچھا تھا آپ کے درمیان تنازعہ کیا ہے۔ تو میں نے کہا تنازعہ کوئی خاص نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ انہوں نے گاڑی کے بونٹ پر پیسہ لگایا تھا اور اب وہ کہتے ہیں کہ گاڑی میری ہے چونکہ بونٹ گاڑی میں لگا ہوا ہے۔ جس طرح انہوں نے پرویز مشرف صاحب کے دور میں اسلام آباد کا ڈیکلریشن اپنے نام منتقل کرایا اُسکی پوری تفصیل اسلام آباد ہائی کورٹ کے فیصلے میں آ گئی ہے۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ ہم اِس طرح لڑائی لڑتے کہ ادارہ تباہ ہو جاتا لیکن ہماری کوشش یہ تھی کہ عدالت میں ہماری لڑائی بھی جاری رہے اور ادارے پر مقدمے بازی کے اثرات بھی کم سے کم پڑیں۔ ہم نے ادارے کے تحفظ اور وسعت کی کوشش کی۔ الحمدللہ آج ہم قرض کا بہت بڑا حصہ ادا کر چکے ہیں۔

☆ ابھی آپ کے علاوہ بھی اِس کمپنی میں پاکستان اخبار کے شیئر ہولڈرز ہیں؟

○ جی میرے علاوہ بھی ہیں۔ باریکس لمیٹڈ اور روزنامہ پاکستان دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اب ہمارے اور نیازی صاحب کے درمیان جو بھی قانونی معاملات ہیں وہ عدالتوں میں ہیں اور اگر آپ اُن کی تفصیلات حاصل کر لیں تو آپ کو پڑھ کر خود ہی اصل معاملات کا اندازہ ہو جائے گا۔ نہ میں اُن پر کوئی الزام لگانا چاہتا ہوں اور نہ ہی اِس حوالے سے کسی بحث میں اُلجھنا چاہتا ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے بڑی حد تک دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا ہے اور بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔

☆ حامد میر نے اپنے مختلف انٹرویوز میں کہا ہے کہ ''منصوبہ یہ تھا کہ اخبار کے اصلی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مالک اکبر علی بھٹی کو بنکوں کا نا دہندہ ہونے کی وجہ سے جیل میں ڈال دیا جائے کیونکہ 1993ء میں اُنھوں نے نواز شریف کا ساتھ چھوڑ کر بلخ شیر مزاری کی حکومت میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اور اخبار کے تمام شیئرز، شریف خاندان کا کوئی فرنٹ مین خرید کر اپنا چیف ایڈیٹر مسلط کر دے''۔ نواز شریف چونکہ اکبر علی بھٹی سے ناراض تھے اِس لئے اُن کا ارادہ تھا کہ وہ پاکستان اخبار کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو تبدیل کر دیں گے۔ جب حامد میر نے اِس معاملے میں آلۂ کار بننے سے انکار کیا تو پھر آپ کو ایڈیٹر لگایا گیا۔ یہ بتایئے کہ نواز شریف حکومت کا آپ کو پاکستان اخبار کا مالک بنانے میں کیا کردار تھا؟

o بھٹی صاحب اِس دنیا میں موجود نہیں۔ اگر وہ موجود ہوتے اور یہ بات چیت ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اُن کے بھائی اور برخورداران موجود ہیں اُن سے پوچھا جا سکتا ہے۔ نواز شریف صاحب اور چودھری پرویز الٰہی صاحب بھی موجود ہیں اور بنکوں کے جو ذمہ داران ہیں وہ بھی موجود ہیں۔

☆ اس موضوع پر تو پوری ایک کتاب ہو سکتی ہے۔

o اِس معاملے کے بنیادی کردار تو فوت ہو چکے ہیں۔

☆ جیسے حسن پیرزادہ؟

o حسن پیرزادہ بے چارے کا اِس میں صرف یہ کردار تھا کہ سردار خان نیازی صاحب اُن کے حلقہ بگوش تھے اور انھوں نے مجھے کہا تھا کہ نیازی صاحب کو اپنے ساتھ ضرور شریک کریں۔

مجھے نواز شریف صاحب کے اِن عزائم کا کوئی علم نہیں کہ وہ اِس ادارے پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی آج تک اُنھوں نے مجھ سے اِس حوالے سے گفتگو کی۔ معاملہ یہ تھا کہ بھٹی صاحب میر شکیل الرحمن صاحب، مجید نظامی صاحب، ضیا شاہد صاحب کے پاس بھی گئے کہ یہ اخبار لے لیں اور محمود صادق صاحب کے ساتھ بھی اُن کا معاہدہ ہوا۔ میرے اور بھٹی صاحب کے درمیان یہ معاہدہ آزادانہ طور پر طے ہوا۔ پھر اِس سلسلے میں، میں نے اپنے دوستوں سے مشاورت بھی کی، جن میں چودھری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شجاعت حسین اور پرویز الٰہی بھی شامل تھے۔ جب یہ سارا معاملہ اُن سے طے پا گیا تو میں نے نواز شریف صاحب سے کہا کہ یہ معاملہ ہم اِس طرح کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے کہا بالکل ٹھیک ہے آپ کریں۔ لہٰذا اِس حوالے سے میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کاش اکبر علی بھٹی زندہ ہوتے اور اگر کوئی ایسا معاملہ ہوتا تو پرویز مشرف صاحب کا جب دور آیا تھا تو اُس وقت وہ اس کو واپس لینے کا کلیم کر لیتے۔ اور ہم اُن کو واپس کر دیتے۔ اُن کے اوپر تو ساڑھے آٹھ کروڑ کا قرض تھا جس سے اُن کی نجات ہوئی۔ ہم نے اُن قرض لے لیا تھا اگر وہ مانگتے تو ہم اُنھیں واپس کر دیتے۔

ایک اور دل چسپ بات بھی ہے اگر تو میں نے سب کچھ نواز شریف صاحب سے مل کر کیا ہے تو پھر سردار خاں نیازی صاحب بیچ میں کہاں سے آ گئے، اور سردار خاں نیازی صاحب نے اُن سے مل کر کچھ کیا ہے تو میں کہاں سے آ گیا؟ ایک بات اور آپکو بتا تا چلوں کہ روزنامہ جنگ کے ساتھ جب نواز شریف صاحب کا جھگڑا شروع ہوا تو اُس وقت بھی ایک تجویز میرے پاس آئی تھی کہ میں جنگ کا گروپ ایڈیٹر بن جاؤں۔ میر شکیل الرحمن بھی اِس کے لئے تیار تھے اور حکومت نے بھی منظوری دے دی تھی۔ مشاہد حسین سید صاحب موجود ہیں جو اُس وقت وزیر اطلاعات ونشریات تھے۔

☆ حکومت کا کیا تعلق تھا اِس سارے معاملے سے؟

o آپ کو تو پتا ہے حکومتوں کے کیا معاملات ہوتے ہیں۔ حکومت کی اور جنگ گروپ کی لڑائی چل رہی تھی۔ اور حکومت چاہتی تھی کہ جنگ کی پالیسی اُسکے خلاف اتنی جارحانہ نہ ہو۔

☆ اِس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حکومتیں اخباری یا صحافتی معاملات میں بہت زیادہ دخیل ہوتی ہیں؟

o ہاں، کہیں نہ کہیں تو دخیل ہوتی ہیں اور ہوتی رہی ہیں۔ جیسے ہمارے ادارے میں پرویز مشرف صاحب کی حکومت دخیل رہی۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ اُس وقت میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نے یہ کہہ کر جنگ کا ایڈیٹر بننے سے انکار کر دیا تھا کہ میں ایک ایسا ایڈیٹر نہیں بن سکتا جو کسی سمجھوتے کے نتیجے میں ذمہ داری سنبھالے۔ میں ایڈیٹوریل آزادی پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ میں ضمناً بات کر رہا ہوں۔ روزنامہ پاکستان کوئی پھولوں کا ہار نہیں تھا بلکہ کانٹوں کی مالا تھی جس کو اللہ کے فضل و کرم سے دوستوں سے مشورہ کر کے اپنے گلے میں ڈال لیا۔ بعد میں ہمیں اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ قرضہ اتنا زیادہ تھا کہ بھٹی صاحب بری طرح پھنس چکے تھے اگر وہ زندہ ہوتے اور آپ یہ انٹرویو اُن سے کرتے تو بہتر ہوتا۔

☆ سردار خاں نیازی کہتے ہیں کہ حسن پیرزادہ میرے اور شامی صاحب کے ساتھ معاملات طے کروا رہے تھے، لیکن وہ بیچ میں ہی فوت ہو گئے تو شامی صاحب کا رویہ تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ پہلے میں جا کے میٹنگ چیئر کرتا تھا لیکن پھر شامی صاحب نے کاغذات میں ہیرا پھیری شروع کر دی پھر ایک موقع پر آ کے الطاف حسن قریشی نے آپ اور نیازی صاحب کے درمیان معاملات طے کروائے؟

o میں صرف ایک بات کروں گا۔ ''لعنت اللہ علی الکاذبین'' اور کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔

☆ سردار خاں نیازی یہ بھی کہتے ہیں کہ ''زندگی'' رسالے کیلئے بھی انھوں نے آپ کو پندرہ لاکھ روپے دیے تھے؟

o میں آپ سے یہ عرض کر رہا ہوں جتنی تفصیل میں جائیں گے آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ ہر چیز عدالتوں میں لے گئے ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی مقدمہ، کبھی ادھر کبھی اُدھر لگا ہوتا ہے۔ اگر مقدمہ بازی کی پوری فائل پڑھ لیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ حقائق کیا ہیں۔

☆ سردار خاں یہ بھی کہتے ہیں کہ خواجہ شریف، چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ شامی صاحب کے دوست تھے اور انہوں نے اپنے دور میں پتا بھی نہیں ہلنے دیا۔ انوسٹی گیشن پر کوئی Stay نہیں ہوتا لیکن پاکستان اخبار کے معاملات پر سات سال سٹے رہا؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o اگر آپ میرے وکیل کے پاس چلے جائیں تو آپ کو بہت حیرت ہوگی کہ کس کا وکیل آ کر پیشیاں لیتا رہا اور انوسٹی گیشن کا تو مسئلہ ہی نہیں ہے۔ انوسٹی گیشن تو ''ایس ای سی پی'' سے ہو چکی ہے۔ اور وہ تین سو صفحات کے ڈاکومنٹس موجود ہیں۔ اب مزید سے مزید تر انوسٹی گیشن، یہ معاملہ کہیں تو رکنا چاہیے۔ میں الزام تراشی میں آگے نہیں جا سکتا۔ میرا موقف بہت واضح ہے اور عدالتوں کے فیصلے گواہ ہیں۔ آپ میرے وکیل کے پاس چلے جائیں اور مقدمات کی فائلیں دیکھیں، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کا وکیل ہر پیشی پر آ کر تاریخ لیتا ہے اور مقدمات کو طول دینا چاہتا ہے۔ میں نے آج تک کسی جج سے اپنے مقدمات کے حوالے سے بات نہیں کی۔ اور خواجہ شریف صاحب سمیت جتنے ہمارے دوست ہیں ان کا ہمارے مقدمات سے کبھی کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔

☆ چیف جسٹس تو تھے وہ.....

o تو کیا میں اُن سے یہ کہوں گا کہ میرے مقدمے حل کروا دیں؟ خواجہ شریف یقیناً میرے دوست تھے، میں اُن کا احترام کرتا ہوں۔ تو کیا میں اُن کے پاس جاتا اور پھر وہ میرے حق میں فیصلہ دے دیتے؟ اعجاز چودھری چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ رہے وہ میرے انتہائی قریبی دوست ہیں تو کیا وہ میرے حق میں فیصلہ کروا دیتے؟ ہائی کورٹ کے جتنے بھی جج ہیں وہ میرا احترام کرتے ہیں۔ لیکن اگر تعلقات یا واقفیت کی بنیاد پر مقدمات کا فیصلہ ہونا ہوتا تو پھر مقدمات کا فیصلہ میرے حق میں کیوں نہ ہوتا۔ اِس طرح تو کئی مقدمات کو نپٹ جانا چاہیے تھا، نہ کہ وہ لٹکے رہتے۔

☆ لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس چوہان نے آپ کو کہا کہ جب آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا کہ آپ کا کوئی پیسہ نہیں لگا تو آپ کے شیئرز کہاں سے آ گئے؟ ایسی کوئی بات ہوئی تھی؟

o آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کمپنیاں ایک روپیہ پر اور سو روپے پر بھی بکی ہیں۔ جب کسی کمپنی کی Liabilities زیادہ ہو جاتی ہیں۔ تو ایسے ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ بھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ساڑھے آٹھ کروڑ میں بکا ہے چونکہ قرضہ خریدا گیا۔

☆ آپ نے عمر شامی صاحب کے نام ڈیکلریشن کی بات کی۔ سردار خاں صاحب کا کہنا ہے کہ رشید بھٹی کے نام ''پاکستان'' اخبار کا ڈیکلریشن تھا تو اُس نے عدالت میں آ کر بیان دیا کہ میں تو اشتہاری تھا تو عمر شامی کے نام پر ڈیکلریشن کیسے ہو گیا؟

○ اگر ایسی بات ہوتی تو ہمارا ڈیکلریشن ختم ہو جاتا۔ میں پہلے ہی معاملے کی وضاحت کر چکا، اب میں جھوٹ میں تو کسی طور شریک نہیں ہو سکتا۔ آپ اِس معاملے میں جب اتنی مشقت کر رہے ہیں تو آپ اِن مقدمات کی تمام فائلوں سے گزر جائیں اور ایس ای سی پی کی رپورٹ بھی پڑھ لیں۔ اس طرح آپ کو معاملے کی نوعیت کا پوری طرح علم ہو جائے گا۔

روزنامہ 'پاکستان' اسلام آباد کے حوالے سے آپ اسلام آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ پڑھ لیں کہ کیسے عمر شامی صاحب کے نام سے یہ ڈیکلریشن منسوخ ہوا۔ اور پھر اُس کے اندر کیا کیا معاملات کیے گئے۔ کمشنر اسلام آباد نے کس طرح ہمارا ڈیکلریشن ختم کر کے اُسی روز سردار خاں نیازی کو جاری کر دیا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اِس لیے میں کسی جھوٹ کے مقابلے میں جھوٹ نہیں گھڑنا چاہتا۔ میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ بے شمار مقدمات انہوں نے ہمارے اوپر کیے۔ کئی مقدمات کے فیصلے ہو گئے، کچھ ابھی زیر التوا ہیں۔ جن کے فیصلے ہو گئے ہیں وہ آپ پڑھ لیجئے۔

☆ ویسے رسالہ: 'زندگی' کے لیے نیازی صاحب نے آپ کو پندرہ لاکھ دیے تھے؟

○ دیکھیں جو کچھ بھی لیا ہو گا یا دیا ہو گا سب ریکارڈ کا حصہ ہے۔ کوئی ایک پیسہ ایسا نہیں ہے جو مجھے کیش کی صورت میں دیا گیا ہو۔

☆ نیازی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ جب شامی صاحب لاہور سے مجھے اسلام آباد ملنے آئے تھے پانچ سو روپے مصطفیٰ صادق سے لے کر آئے تھے اور جاتے ہوئے دو ہزار مجھ سے لے کر گئے تھے تو بعد میں شامی صاحب کے پاس پیسے کہاں سے آ گئے؟

○ میں اِسی شہر اِسی ملک میں رہ رہا ہوں۔ چالیس سال سے زائد عرصے سے یہی کام

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کر رہا ہوں۔ لوگ مجھے جانتے ہیں۔ اب اِس طرح کی فقرے بازی اور طعنہ زنی میں آپ کو کس کس بات کا جواب دوں کہ یہ ٹھیک ہے یا غلط ہے۔ میں نے تو ایسا کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا کہ میں کوئی کروڑ پتی آدمی تھا اور میں نے یہ ادارہ کروڑوں میں خریدا ہے۔ انہوں نے ایک معاہدہ کیا اور اُسی کے تحت بنکوں کے مروجہ نظام کے ذریعے انہوں نے پیسے دیے اور شیئرز خریدے۔ اب وہ ادارے پر قبضہ کرنا چاہیں تو اُن کی مرضی۔

☆ نیازی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے کالموں، جلسہ عام وغیرہ میں مخصوص نقطۂ نظر بیان کرنے کیلئے آپ کو آئی بی پیسے دیتی تھی؟

○ (ہنستے ہوئے) اب میں اِس بات کا کیا جواب دوں۔ اللہ کے پاس اُنھیں بھی جانا ہے، مجھے بھی۔ اگر ایسا تھا تو پھر مجھے بھٹو صاحب اور پرویز مشرف صاحب بھی پیسے دے دیتے۔ وہ جو بھی کہتے رہیں۔۔۔ میں اُس سطح پر نہیں اُتر سکتا۔

☆ رفیق ڈوگر صاحب نے اپنی ایک کتاب میں آپ کا نام سی آئی اے کی لسٹ میں شامل ہونے کا تذکرہ کیا۔ انڈیا میں اِندرا گاندھی کی بہو مانیکا گاندھی نے بھی ایک لسٹ چھاپی، اُس رسالے کے مطابق سوئٹزرلینڈ میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں سی آئی اے کے پے رول پر صحافیوں کی ایک لسٹ پیش کی گئی تو مانیکا گاندھی نے لسٹ میں موجود بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان کے صحافیوں کے نام اپنے رسالے میں چھاپ دیے۔ پاکستان سے بمطابق اس رسالے کے، اُس لسٹ میں مجیب الرحمن شامی، تکبیر والے مولانا صلاح الدین، عبدالقادر حسن اور پاکستان ٹائمز راولپنڈی کے ایڈیٹر سید شبیر حسین شاہ کا نام شامل تھا؟

○ ''لعنت اللہ علی الکاذبین''، ایک ہی بات ہے۔ شبیر حسین شاہ کے بارے میں دنیا جانتی ہے جس طرح انہوں نے دیانت داری کی زندگی گزاری۔ جہاں تک عبدالقادر حسن اور مولانا صلاح الدین کے ناموں کی بات ہے تو سیاسی مخالفین ایسی باتیں کرتے ہی ہیں۔

☆ مانیکا گاندھی کی کیا سیاسی مخالفت تھی کہ وہ آپ سب کے نام چھاپتی؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o پتا نہیں وہ نام کس نے دے دیے۔ ہم نے کونسی ریسرچ کی ہے؟

☆ ڈوگر صاحب کو کیا مسئلہ تھا کہ انہوں نے تذکرہ کیا؟

o ڈوگر صاحب کو بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ کہیں خبر لگی ہوگی تو اُنھوں نے چھاپ دیا ہوگا۔

☆ رفیق ڈوگر کی یہ کتاب بلوچستان کے حوالے سے ہے اور کتاب کے آخر میں مولانا صلاح الدین کے نام کافی طویل خطوط ہیں جن میں آپ اور جاوید ہاشمی کے حوالے سے کافی باتیں ہیں۔ ایک خط کا عنوان ہے ''صلاح الدین کے نام آخری خط'' جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''آپ کا جواب یہ ہے کہ پہلے ہی سی آئی اے کے ایجنٹوں کی فہرست دوبارہ شائع کر چکے ہیں۔ جس میں شامی صاحب کا نام بھی درج تھا۔ پہلے روز یہ نام خارج کرنا اور پھر شامل کرنے یا کرانے میں میرا کیا قصور ہے''؟ ڈوگر صاحب یہ سوال صلاح الدین صاحب سے کر رہے ہیں۔ ڈوگر صاحب آپ کے رسالے میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔ اِس حوالے سے بھی کتاب میں ذکر ہے جب جاوید ہاشمی ضیاالحق کے منسٹر تھے تو آپ کے ساتھ شیخوپورہ گئے تھے؟

(شامی صاحب نے کہا کہ میری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری تو انہیں رفیق ڈوگر صاحب کی کتاب دکھادی گئی)

o وہ .....تو..... اب ..... کتنی پرانی کہانیاں ہیں۔ لیکن اگر کسی کے پاس ایسا کوئی ثبوت موجود ہے تو اسے کارروائی کرنی چاہئے اور اگر کوئی ایسے ہی کسی کے اوپر الزام تراشی کے طور پر کسی کا نام اِدھر اُدھر سے بھیج دے تو اس کا کیا کیا جاسکتا ہے؟

☆ ایٹمی دھماکوں سے پہلے آپ نے ان دھماکوں کی بہت شدّومدّ سے مخالفت کی، کالم لکھے۔ لیکن دھماکوں کے ایک سال بعد تقریبات کا نام تجویز کرنے کیلئے جو کمیٹی بنی آپ اس کے چیئرمین تھے اور شاید نام ''یوم تکبیر'' بھی آپ نے ہی تجویز کیا۔ ethically آپ اس کمیٹی کے چیئرمین نہ بنتے تو بہتر نہیں تھا؟

o کیوں؟

☆ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o کیوں؟ ethics اس میں کہاں سے آ گئیں؟

''پاکستان کے پاس ایٹمی صلاحیت نہیں ہونی چاہئے'' اس حوالے سے میرے اور دوسرے لوگوں کے موقف میں فرق تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ایٹمی دھماکہ کرنے سے پاکستان کی معیشت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کا کوئی بندوبست کرنا چاہئے۔ رواروی میں یہ کام نہیں کرنا چاہئے اور اپنے دوستوں سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔ نواز شریف صاحب نے ایڈیٹرز کی ایک کانفرنس طلب کی تھی وہاں بھی میں نے یہی کہا۔ پھر جب نواز شریف صاحب نے دھماکہ کیا تو اس سے پہلے اُنھوں نے اس کا بندوبست کیا۔ کنگ عبداللہ جو اس وقت ولی عہد تھے اُن سے نواز شریف صاحب نے بات کی اور انہوں نے کہا ہم پانچ سال تک پاکستان کو تیل فراہم کریں گے اور ایسا کیا بھی۔

جب نواز شریف صاحب نے سارے بندوبست کر لیے تو دھماکہ کر دیا۔ یا تو میں یہ کہتا کہ پاکستان کے پاس ایٹمی صلاحیت نہیں ہونی چاہئے تو پھر یہ بات درست ہوتی۔ مجھے چیئرمین نہیں بننا چاہئے تھا۔ میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ ایٹمی دھماکوں کے جو منفی نتائج ہونگے وہ بہت سخت ہو سکتے ہیں، اس لیے ان سے گریز کرنا چاہئے اور اس حوالے سے انتظام کر لینا چاہئے۔ میرے پاس اس وقت بھی مشاہد حسین سید صاحب اور شہباز شریف صاحب آئے تھے۔ اس ملاقات میں بھی میرا موقف یہی تھا۔ اگر دھماکے کرنے ہیں تو اپنے دوستوں بشمول چین اور سعودی عرب سے مشورہ کیا جائے۔ اور آپ نے دیکھا کہ انہوں نے انتظام کر بھی لیا لیکن ایٹمی دھماکوں کے ہماری معیشت پر منفی اثرات تو ہوئے البتہ سعودی عرب سے ہمیں تیل فراہم ہوتا رہا اور اس طرح ہم ایک بہت بڑے صدمے سے بچ گئے۔

میرا اختلاف دھماکے پر نہیں تھا۔ اس کے وقت اور پس منظر پر تھا۔ 28 مئی کا دن منانے کا فیصلہ نواز شریف حکومت نے کیا اور اس دن کا نام تجویز کرنے کیلئے بننے والی کمیٹی کا چیئرمین مجھے بنایا گیا۔ کسی نے اس وقت مجھ پر اعتراض نہیں کیا کہ یہ کیوں چیئرمین بن رہے ہیں کیونکہ سب کو پتہ تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ بعض لوگ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تھے جو کہہ رہے تھے کہ پاکستان کے پاس ایٹمی صلاحیت ہونی ہی نہیں چاہئے۔

☆ جب مشرف آئے تو آپ نے ایک اداریہ بھی لکھا کہ ''الفاظ سے زیادہ عمل پر یقین رکھنے والے ہمارے نئے ''چیف ایگزیکٹو''۔ اور پھر جس طرح بیان کیا جاتا ہے 5 نومبر 1999ء کو آرمی ہیس میں اخباری مدیران سے ملاقات کے وقت آپ نے مشرف کو قائداعظم سے ملاتے ہوئے کہا کہ ''قائداعظم کے بعد آپ دوسرے رہنما ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ سچ ہی لکھنا خواہ میرے خلاف ہی کیوں نہ ہو''۔ کیا آپ اس بات کو خوشامد کے زمرے میں شمار نہیں کرتے؟

○ میں نے یہ کہا ہی نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا میرا اس پر اداریہ موجود ہے۔ جب اُنھوں نے یہ بات کی تو میں نے کہا اگر آپ نے اس پر عمل کیا تو پھر آپ کو اس حوالے سے یاد رکھا جائے گا۔ اور اگر عمل نہ کیا تو پھر آپ کو پتا ہے کیا صورتحال ہوگی۔

☆ اسلم خاں صاحب خبریں میں آپ کے حوالے سے بہت کالم لکھتے رہے، اُنھیں آپ سے کوئی ذاتی ٹھیس پہنچی تھی؟

○ خیر یہ تو وہی بتا سکتے ہیں (طویل قہقہہ)۔۔۔ میں لوگوں کے بارے میں منفی بات کرنے سے بچتا ہوں۔ کوئی بہت ناراض ہو جائے یا مخالفت میں آ کر کوئی بات کہہ دے تو میں اس کو معاف بھی کر دیتا ہوں۔

☆ لیکن آپ نے 'پاکستان' میں ایک اشتہار چھاپ کر 'خبریں' اور ضیاء شاہد کو رگڑا تو لگایا؟

○ کیا؟ دکھائیں میں نے کیا لکھا ہے؟

(شامی صاحب کو ان کی یہ تحریر دکھائی گئی)۔

☆ ''روزنامہ خبریں نے جس طرح دیکھتے ہی دیکھتے مالی طور پر ترقی کی ہے اس کے متعلق جاننے کا اشتیاق ہر کسی کے دل میں ہے۔ روزنامہ ''خبریں'' کے شیئر ہولڈرز اور ڈائریکٹرز کی تفصیلات، ادارے کے مالکان کے اثاثوں کے متعلق معلومات اور موجودہ بلڈنگ کے حصول کی حیرت انگیز کہانی پر مشتمل ایک اہم دستاویز جلد شائع کی جا رہی ہے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o اصل میں بات یہ ہے کہ ضیا شاہد صاحب میرے ساتھ کچھ معاملات جارحانہ انداز میں کر رہے تھے۔ ان کے ادارے کے ایک صاحب تھے، عظیم عزیز وہ کسی وقت ناراض ہو کر ہمارے پاس آ گئے تھے تو انھوں نے کہا کہ اس طرح کا اشتہار چھاپ دیا جائے تو یہ لڑائی بند ہو جائے گی۔ بہر حال بات یہ ہے کہ اگر میں نے کسی معاملے میں کسی دوست کی دل آزاری کی ہے یا میری طرف سے کسی کو ٹھیس پہنچی ہے تو میں اس پر شرمندہ ہوں۔ مجھے اس پر کبھی بھی فخر نہیں ہو سکتا۔ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ کوئی آپ کو چھیڑتا ہے تو آپ بھی اس کو چھیڑتے ہیں۔ اگرچہ اب تو میں اس کا بھی قائل نہیں رہا۔ کوئی چھیڑے بھی تو میں نظر انداز کر دیتا ہوں۔

☆ بھٹو صاحب کے علاوہ بھی آپ نے کسی حکمران کی مخالفت کی؟

o (ہنستے ہوئے) آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بھٹو صاحب نے ہماری مخالفت کی تو ہم نے ان کی مخالفت کی۔ لیکن میں ہمیشہ اپنے طور پر وہ لکھتا رہا ہوں جو صحیح سمجھتا رہا۔ اور خود جنرل ضیاالحق کے دور میں بھی بار بار میرے ان سے تعلقات خراب ہوئے ہیں اور میری کئی ایسی تحریریں ہیں جیسے قومی ڈائجسٹ، ہمارا ہفتہ وار رسالہ یا میرے کالم جن کو پڑھ کر آپ کو بے شمار ثبوت مل جائیں گے۔

☆ جب بھٹو سول مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے آپ پر ایک کیس بنا تو آپ نے عدالت میں ایک بڑا مدلل اور زوردار بیان دیا۔ بھٹو کے خلاف قلمی طور پر لڑائی لڑی اور جیل بھی کاٹی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو بہت پہلے علم تھا کہ مارشل لاء کیا ہوتا ہے اور اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ذہنی اعتبار سے آپ بہت واضح تھے۔ تو کس ذاتی عناد، جوش یا عداوت کی وجہ سے آپ نے ضیاء کا ساتھ دیا؟

o دیکھیں! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی مطالبہ نہیں کیا ملک میں مارشل لاء لگے اور جب مارشل لاء لگا تو اس سے پہلے پوری کوشش کی کہ نہ لگے۔ لیکن بھٹو صاحب نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیے تھے۔ 1977ء کے الیکشن میں دھاندلی کے بعد بھٹو صاحب کی حکومت کے پاس اخلاقی جواز ختم ہو گیا تھا۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ دھاندلی کر کے اقتدار پر قابض رہیں۔ اور آپ کیسے اخلاقی، آئینی اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قانونی سربراہ ہونگے اور پھر انہوں نے خود دھاندلی کو تسلیم کیا۔ اسی لئے وہ الیکشن دوبارہ کرانے پر متفق ہوئے۔ لہٰذا اس وقت کی صورتحال بہت پیچیدہ تھی۔ ایک تحریک چلی جس کے نتیجے میں حکومت کا تختہ الٹ گیا۔

لیکن میں آپ کو عرض کروں کہ جب ضیاء کے دور میں 1979ء کا الیکشن ملتوی ہوا تو میرا اُن سے شدید جھگڑا ہوا اور میں واپس چلا آیا۔ اس کے بعد ان کی کسی میٹنگ میں مجھے نہیں بلایا گیا۔ 1983ء میں جب دوبارہ انھوں نے الیکشن شیڈول کا اعلان کیا تو میری ان سے دوبارہ ملاقات شروع ہوئی، چار سال میرا اُن سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔

☆ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے بھٹو عہد میں ایک رویے کے خلاف لڑائی لڑی، جب کہ دوسری طرف ضیاء دور میں صحافیوں اور سیاسی کارکنوں پر تشدد ہو رہا تھا اور کوڑے پڑ رہے تھے اور آپ ضیاء الحق کے ساتھ تھے۔

o میں ضیاء الحق کے ساتھ بالکل نہیں تھا۔

☆ آپ ضیاء الحق کی مخالفت تو نہیں کر رہے تھے؟

o میں ضیاء الحق کی پارٹی میں نہیں تھا۔

☆ جس طرح آپ نے بھٹو کی مخالفت کی۔

o اس وقت تو مارشل لاء تھا!

☆ ضیاء الحق کی حکومت جمہوری تھی؟

o نہیں، ضیاء الحق کا مارشل لاء تھا۔ تو جب مارشل لاء آ گیا تو وہ اپنے قوانین کے تحت کام کرے گا وہ جمہوری ضابطے کے تحت تو کام نہیں کرے گا۔ اگرچہ مجھے یہ بات بہت ناپسند ہے کہ کسی کو کوڑا لگے لیکن اگر مارشل لاء میں آپ جلوس نکالیں گے تو کوڑے تو لگیں گے۔۔۔۔

☆ نہیں تو پھر آپ پر جو مقدمہ بھٹو کے مارشل لاء کے زمانے میں بنا وہ بھی تو مارشل لاء کے ضابطے کے تحت۔۔۔

o بھٹو تو ایک جمہوری حکمران تھے۔ جمہوریت کے ذریعے اُنھیں آنا تھا۔ وہ مجیب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

الرحمان کی جگہ آئے تھے۔ مجیب الرحمان کو اس ملک کا وزیراعظم ہونا چاہئے تھا۔۔۔

☆ اگر بھٹو بھی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے، تو فوج کی پشت پناہی کی وجہ سے بنے۔۔۔

o ایک جمہوری حکومت کے طور طریقے اور اُس سے توقعات مختلف ہوتی ہیں۔ جبکہ مارشل لاء کسی سے مینڈیٹ لے کر نہیں آتا۔ ضیاء الحق صاحب کے وہ اقدامات جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں میں نے ان کی کبھی تائید نہیں کی۔

☆ لیکن آپ یہ دیکھیں جنرل ضیاء الحق نے پورے معاشرے کا تار و پود بکھیر دیا۔ سوسائٹی کا مائنڈ سیٹ تبدیل کر دیا؟

o یہ آپ کا خیال ہے۔ یہ ایک بحث طلب موضوع ہے لیکن یہ نہیں کہ میں اس بات پر فخر کا اظہار کر رہا ہوں۔ جو اس وقت صورتحال۔۔۔۔۔

☆ جو آپ کا اپنا نقطہ نظر ہے وہ بھی تو وقت کے ساتھ بدلا ہے اور اس میں توازن آیا ہے مثلاً جیسے آپ کا بیان، کہ ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بھٹو کو پھانسی نہیں لگنی چاہئے تھی''۔

o یہ اور گفتگو ہے۔ پہلے ضیاء الحق سے تو نپٹ لیں۔ دیکھیں، ضیا الحق کا دور مارشل لاء کا دور ہے اور جب مارشل لاء آجاتا ہے تو پھر آپ کس طرح اس سے عہدہ برآں ہونگے۔

☆ جس طرح بھٹو کے خلاف آپ نے لڑائی کی۔۔۔۔۔

o وہ تو ایک جمہوری حکمران تھا۔۔۔۔۔

☆ اس کا مطلب تو یہ کہ ضیاء بھی اگر ایک کمزور جمہوری حکمران ہوتا تو آپ اس کے خلاف بھی لڑتے۔

o نہیں نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ دیکھیں فوج کی طاقت سے آپ کیسے مقابلہ (Confront) کریں گے؟

☆ جیسے بھٹو کے خلاف آپ نے جیلیں بھگتیں۔

o نہیں نہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ شامی صاحب آپ نے ایک اصول کی بنیاد پر جیلیں بھگتیں؟ بھٹو کے خلاف ذاتی لڑائی تو نہیں کی تھی؟

○ جس طریقے سے بھٹو صاحب کی حکومت چلی اس کے نتیجے میں ایک ہنگامہ برپا ہوا اور مارشل لاء لگا۔ مارشل لاء کو ہٹانا تھا اور جمہوری نظام کو واپس لانا تھا۔ یہ ایک ٹارگٹ تھا اور اس کا حصول مارشل لاء کی تائید کر کے نہیں بلکہ جمہوریت پر زور دے کر ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہم نے ہمیشہ مطالبہ کیا کہ الیکشن کرائے جائیں اور مارشل لاء اٹھایا جائے۔ کبھی نہیں کہا کہ الیکشن نہ کرائے جائیں۔

☆ لیکن آپ تو ضیاء الحق کے زمانے میں وزیر بنواتے رہے، جاوید ہاشمی اور مصطفیٰ صادق کو آپ نے وزیر بنوایا جب کہ حسین حقانی کو وزیر بنوانا چاہتے تھے؟

○ دیکھیں یہ تو۔۔۔۔۔ جب آپ۔۔۔۔

☆ نہیں سر یہ آپ کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔

○ میں عرض کروں، میرے ضیاء الحق سے اچھے اور قریبی تعلقات بھی رہے اور ایسا دور بھی گزرا جس میں ہمارے درمیان فاصلے بھی رہے اور ملنا جلنا نہیں رہا۔ چار سال یہی معاملہ رہا لیکن جب میرے ان کے ساتھ تعلقات تھے یہ ساری باتیں ہوئیں، درست ہے۔ ان کی تردید کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن ایک طرح سے یہ ایک غیر صحافیانہ سرگرمی ہے مگر میرا خیال ہے اس سے گریز ہی کرنا چاہئے۔ یہی بہتر ہے کہ آپ حکومتی معاملات میں دخیل نہ ہوں۔ بات یہ ہے کہ بعض اوقات آدمی کو احساس نہیں ہوتا۔

☆ آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت آپ کو احساس نہیں تھا؟

○ بڑی سیدھی بات تھی جب ملک پر وبھٹو اور اینٹی بھٹو میں بٹ گیا اور اینٹی بھٹو ہونے کی پاداش میں ایک صورتحال سے دوچار ہو گئے۔

☆ ایک دانشور یا صحافی کو ذاتی سطح سے بلند نہیں ہونا چاہئے؟

○ ہاں آپ کہہ سکتے ہیں۔ اصولی طور پر تو آپ کی بات درست ہے۔

☆ یہ تو نہیں کہ نوجوانی کے جوش میں۔۔۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o نہیں نہیں، جب آپ ایک صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں تو پھر اس وقت اتنی احتیاط نہیں ہوتی جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔ ویسے یہ درست بات ہے میں اصولی طور پر اس سے متفق ہوں۔ لیکن جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو اس وقت میرا اور ضیاء صاحب کا تعلق یا حکومت سے میری قربت کسی ذاتی مفاد کیلئے نہیں تھی۔ میرا اپنا ایک فلسفہ تھا کہ بھٹو صاحب جیسی حکومت اس ملک میں دوبارہ نہ آنے پائے۔

☆ یہ تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بھٹو صاحب کو پھانسی نہیں لگنی چاہئے تھی، چاہے ہم لوگ جو اپوزیشن میں تھے ان کو کتنی ہی کربلا سے کیوں نہ گزرنا پڑتا۔ بلاشبہ ایک زمانے میں بھٹو صاحب کے بارے میں میری سوچ انتہا پسندانہ تھی''؟

o اب میرا یہی خیال ہے۔ دیکھیں انسان مشین تو نہیں ہے۔ وہ سوچتا ہے، وہ چیزوں کو دیکھتا ہے اپنی غلطیوں کا احساس کرتا ہے۔ اللہ کو بھی پتا ہے بندے نے یہ کام کب کرنے ہیں۔ اپنی غلطیوں کا اندازہ کرنا، اُن کا احتساب کرنا، یہ سارا سسٹم انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ میں تو چونکہ ان سب مراحل سے گزرا ہوں، میں نے مختلف معاملات اور ان کے اثرات دیکھے ہیں۔ لہٰذا اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملک میں جو سیاسی عمل اور جماعتیں ہیں وہ سب سے زیادہ بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، ہمارے ملک میں تجربے نے یہ بتایا ہے۔ اسی لیے جب پرویز مشرف صاحب نے احتساب کا نعرہ لگایا تو میں نے کہا ضیاء الحق کے دور میں ہم یہ نعرہ لگا بھی چکے ہیں اور بھگت بھی چکے ہیں۔ لہٰذا اب ہم اس فریب میں نہیں آئیں گے۔

☆ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ تسلیم کر رہے ہیں کہ ضیاء الحق کا ساتھ دینا آپ کی غلطی تھی اور دوسرا یہ کہ ضیاء کا فریب آپ بھگت چکے ہیں؟

o میں ذاتی بات نہیں کر رہا۔

☆ میں قومی سطح کی بات کر رہا ہوں۔

o میں کوئی شخصی بات نہیں کر رہا۔ اس طرح کے جو نعرے ہیں۔ نظام کو مضبوط کیے بغیر ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح نواز شریف کے دور میں لوگوں کے احتساب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی بہت تحریک چلی۔ بڑے بڑے لوگ کرپشن کے خلاف جہاد کرنے آگئے۔ میں نے ان کو سپورٹ نہیں کیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملک جمہوری دستور کے مطابق چلنا چاہئے۔ بھٹو صاحب کے جو منفی پہلو ہیں میں آج بھی ان پر تنقید کرتا ہوں۔ لیکن اُن کے مثبت کاموں کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ اور آج بھٹو صاحب کی شخصیت اور اُن کی پارٹی ملک کو متحد رکھنے والی قوت (Uniting Factor) ہے۔ پیپلز پارٹی فیڈریشن کی پارٹی ہے۔ میں کیسے اس کو نظر انداز کر سکتا ہوں۔ جب تک سیاسی جماعتیں توانا نہیں ہونگی، ہم اپنے ملک کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ ہمارا دستور ایک بات کر رہا ہے اور ہم دوسری طرف چل رہے ہیں۔ یہ تضاد ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔

مزید یہ کہ میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا کہ مجھ سے زندگی میں غلطی نہیں ہوئی، میرے تجزیے بھی غلط ہوئے ہیں۔ میرے احساسات بھی مخصوص رہے ہیں چونکہ ہر آدمی اپنے پس منظر میں رہ کر سوچتا ہے۔ ہم کوئی جزیرے میں نہیں رہ رہے ہوتے، ہم جن حالات میں رہ رہے ہوتے یا حالات کی سختیاں برداشت کر رہے ہوتے ہیں اس کے اثرات ہمارے اوپر مرتب ہوتے ہیں۔ بعض اوقات آپ کے اندر منفیت بھی آجاتی ہے۔ یہ ساری چیزیں کہیں نہ کہیں مجھ میں بھی ضرور آئی ہیں۔ لیکن میں نے ان پر قابو پایا ہے اور سمجھتا ہوں کہ ہمیں معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے، کیونکہ ہم نے اس ملک میں رہنا ہے۔ تمام سیاسی جماعتیں اور رہنما اس ملک کا اثاثہ ہیں۔ ان کی خامیوں کا احتساب ہونا چاہئے مگر طریقہ کار سے، اور جو خوبیاں ہیں ان کا بھی ہمیں معترف ہونا چاہئے تاکہ ہم اِس ملک کو جوڑے رکھیں۔

☆ آپ کے نقطۂ نظر میں خوبصورت اعتدال کی وجہ ایک اِدارے کا سربراہ ہونا یا کوئی کاروباری مجبوریاں تو نہیں؟

○ کاروباری مجبوری میری کیا ہو سکتی ہے؟ ویسے آج حالات بھی بدلے ہیں۔ آج

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیپلز پارٹی بھی وہ نہیں جو آج سے بیس یا تیس سال پہلے تھی۔ اور آج دوسری جماعتیں بھی وہ نہیں۔ لیکن بہرحال کاروبار کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں، وہ میرے بیٹوں کے سپرد ہے۔ لیکن جب آپ اعتدال کی بات کرتے ہیں تو اس کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ جو جذباتیت کا شکار ہوتے ہیں ان کو آپ سے مایوسی بھی ہوتی ہے۔ لوگ مجھ سے بحث مباحثہ بھی کرتے ہیں۔ پھر میں ان کو سمجھاتا ہوں۔ میں اب ساٹھ سال سے اوپر کا ہو چکا ہوں۔ شاید پینسٹھ سے بھی اوپر ہو رہا ہوں۔ لہٰذا مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اس عمر میں میرا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''قابل رحمت ہے وہ جوان جس میں بڑھاپے کا رنگ ہو اور اس بڑھاپے سے برأت کا اظہار کیا جس میں جوانی کا رنگ ہو۔'' آج جو تجربہ میرے پاس ہے وہ پہلے نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اعتدال سے معاملات کو دیکھنا چاہئے اور لفظوں کو تولنا چاہئے اور کسی قیمت پر دستوری راستہ سے انحراف نہیں کرنا چاہئے۔

☆ آپ نے عمر بڑھنے کے ساتھ سنجیدگی کا ذکر کیا جبکہ ہمارے ہاں صحافتی میدان میں بعض لوگ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ زیادہ جذباتی ہوتے جا رہے ہیں!

o اُن میں جوش و جذبہ زیادہ ہوتا ہوگا۔ وٹامن زیادہ کھاتے ہوں گے۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) البتہ میں اُن میں سے نہیں۔

☆ کیا آج مجیب الرحمن شامی یہ حوصلہ کریں گے کہ ڈکٹیٹر ضیاء الحق کا ساتھ دینے پر قوم سے معافی مانگیں؟

o نہیں۔ میں ان کا کوئی وزیر نہیں رہا، نہ میں ان کی پارٹی میں رہا نہ ہی ان کی مجلس شوریٰ کا ممبر۔۔۔۔

☆ ان کی حکومت میں وزیر تو بنوائے آپ نے۔۔۔۔

o مجھے اس بات پر پشیمانی تو نہیں ہے کیونکہ میں ان کی کچن کیبنٹ میں نہیں تھا۔ میں ان سے ڈیل کر رہا تھا جس طرح ایک حکمران سے ڈیل کیا جاتا ہے۔ کبھی ان کے ساتھ تعلقات اچھے اور کبھی خراب ہو جاتے تھے۔ میں عدم توازن کا شکار نہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوسکتا۔ جو ضیاء الحق کی خوبیاں ہیں ان کا اعتراف بھی کرنا چاہئے۔ ضیاء الحق کے دو بڑے کارنامے ہیں، پہلا یہ کہ اُنھوں نے افغانستان کی جنگ میں حصہ لیا اور سوویت یونین کی فوجوں کو وہاں سے نکالا۔

☆ اس کا پھل تو ابھی تک ہم بھگت بھی رہے ہیں۔ خودکش حملوں کی شکل میں مسجدیں بھی نہیں ہیں۔

o وہ تو بھگتیں گے۔ ہر کامیابی کی کوئی نہ کوئی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

☆ یہ کیسی کامیابی تھی جس میں امریکی ڈالر آرہے تھے۔ مدرسوں کو ایندھن بنایا جارہا تھا۔

o آپ تو اصل میں بڑی جزوی باتیں کررہے ہیں۔ دنیا کی اتنی بڑی سپر پاور سے جنگ کی بات کرنا اور پھر خفیہ جنگ کرنا۔ اس وقت بھی لوگوں کو پسینہ آتا تھا اور آج بھی آجاتا ہے۔ دیکھیں جب پاکستان بنا تو کیا ہمیں قربانی نہیں دینی پڑی؟ وہاں ہماری کتنی جائیدادیں اور لڑکیاں رہ گئیں۔ ہمارے کتنے لوگ شہید ہوگئے؟ ہر کامیابی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، لہٰذا ضیاء الحق نے جہاد افغانستان میں جو تاریخ ساز کردار ادا کیا، اس کا میں آج بھی معترف ہوں۔ دوسرا اُنھوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور اس کو مکمل کیا۔ اگر وہ اس راستے سے ہٹ جاتے تو پاکستان کبھی ایٹم بم نہ بنا پاتا۔ انہوں نے ایٹمی پروگرام مکمل کیا۔ چاغی کا انتخاب کیا، وہاں وائرنگ کروائی سرنگ بنوائی اور طے کیا کہ یہاں دھماکہ ہوگا۔

☆ شامی صاحب یہ کیسی کامیابی ہے کہ جو بم ہم نے اپنی حفاظت کیلئے بنایا، ہم اس کی حفاظت پر جُٹے ہوئے ہیں۔

o میں ہر بات کا جواب پیش کروں گا۔ آپ جذباتی نہ ہوں۔ ہم اسکی حفاظت نہیں کررہے بلکہ آج بھی اللہ کے بعد ہماری حفاظت ایٹم بم ہی کررہا ہے اور اسی کی وجہ سے کوئی فوج آپ کی سرحدوں پر دستک نہیں دے سکتی۔۔۔

☆ یہ ایٹم بم ہماری کونسی حفاظت کررہا ہے؟ امریکی آئے اُسامہ کو مار کر چلے گئے، نہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہماری فوج کو پتا چلا نہ حکومت کو۔۔۔

o نائن الیون امریکہ میں ہوا تھا۔ اتنی بڑی طاقت ہے کتنے ایٹم بم ہیں ان کے پاس لیکن کیا وہ بم اُن کی حفاظت کر سکے؟

☆ انہوں نے پوری دنیا کو تہس نہس بھی تو کر دیا۔

o یہ الگ الگ پہلو ہیں۔ اِن کو آپ یکجا نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کے پاس ایٹمی صلاحیت نہ ہوتی اور آپ کا دنیا کے نقشے پر ممتاز ایٹمی تشخص نہ ہوتا، یہ مسائل تو تب بھی پیدا ہو سکتے تھے۔ یہ الگ مسائل ہیں اور یہ ایٹم بم سے منسلک نہیں ہیں۔ اگر آپ کے گھر کی چھت ٹپک رہی ہے تو آپ کے زکام یا بھوک سے اس بات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسری نشست

☆ کیا آپ ایماندارانہ طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ بھٹو کی پھانسی جوڈیشل مرڈر تھا؟

o نہیں۔۔۔ میں اُسے جوڈیشل مرڈر نہیں سمجھتا۔ میں اُسے ایک عدالتی فیصلے کے نتیجے میں دی گئی سزا سمجھتا ہوں۔ اگرچہ اُس فیصلے پر تنقید ہو سکتی ہے۔ اور اُس سے آپ اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن عدالتوں کے جو فیصلے ہوتے ہیں اُن کے بارے میں دو رائے رہتی ہیں۔ کیونکہ متاثرہ فریقین کی رائے الگ الگ ہوگی۔ اور یہ تو عجیب مقدمہ ہے جس میں سپریم کورٹ کے تین جج یہ کہہ رہے ہیں کہ اُن کو بری کر دیا جائے۔ اُن پر کوئی الزام ثابت نہیں ہو رہا۔ کیونکہ مسعود محمود نے قتل کروایا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ایف ایس ایف ہی ملوث تھی لیکن آگے اختلاف پیدا ہوتا ہے کہ یہ آرڈر بھٹو صاحب نے دیا تھا یا نہیں۔ اب چار جج کہتے ہیں کہ اِن کو پھانسی دی جائے اور تین جج کہتے ہیں کہ اِن کو بری کر دیا جائے۔ تو مقدمہ جب اِس طرح کا ہو تو اُنھیں پھانسی کی سزا نہیں دینی چاہیے تھی اور یہ چونکہ انتظامی فیصلہ تھا۔ صدرِ مملکت معاف کر سکتے تھے لیکن اُنھوں نے نہیں کیا کیونکہ اُن کی اپنی جان خطرے میں تھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ آپ نے اِس موضوع پر ضیاء الحق سے بات کی؟ یا آپ نے کہا کہ بھٹو کو چھوڑ دیں؟

○ اُس وقت جذبات مختلف تھے اور ایک جذباتی فضا تھی۔ ہم لوگ بھٹو صاحب کے زخم خوردہ اور مخالف بھی تھے، لہٰذا اُس ماحول میں ہم ٹھنڈے دل سے ایسے گفتگو نہیں کر سکتے تھے، جیسے آج کر رہے ہیں۔ اور ایک اور بات میں عرض کرتا چلوں کہ جس فضا میں وہ رخصت ہوئے تھے اُس کا آپ اِس بات سے تصور کریں کہ جب انہیں پھانسی لگی ہے تو اُن کے کسی سیاسی مخالف نے نصرت بھٹو صاحبہ سے تعزیت کی نہ اُن کے حق میں کوئی کلمہ خیر کہا۔

☆ ظاہر ہے، پی این اے کے لوگ تو ضیاء کابینہ میں تھے۔

○ بھئی، جذبات بہت شدید تھے اور بھٹو صاحب سے شکایات بہت زیادہ۔ اپوزیشن اور پیپلز پارٹی کے درمیان بڑی خلیج حائل ہو چکی تھی۔ آج میں اُس صورتحال کو دیکھتا ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔

☆ ہم فرض کرتے ہیں کہ آج کا مجیب الرحمن شامی ہو۔ آج ہی ضیاء الحق کا مارشل لاء لگے اور آج ہی بھٹو کو گرفتار کیا گیا ہو اور وہی صورتحال ہو جو 1977ء میں تھی تو کیا آج آپ ضیاء الحق سے بات کرتے کہ بھٹو کو چھوڑ دیں؟

○ ہاں آج ہوتا تو ضرور کرتا۔

☆ اُس کی کیا وجہ ہے؟

○ وجہ یہ ہے کہ تجربے اور مشاہدے سے پتا چلا کہ اگر جمہوریت چلتی رہتی، خواہ کیسی بھی ہوتی، تو زیادہ بہتر ہوتا۔

☆ گویا کہ بھٹو کو کھو کر ہم نے ملک کا نقصان کیا؟

○ بالکل، نقصان کیا۔ لیکن اب ہمیں پیپلز پارٹی کے جو دوست ملتے ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اُنھوں نے اپوزیشن کے ساتھ جارحانہ روّیے سے اپنا اور ملک کا نقصان کیا۔

☆ آپ نے تسلیم کیا کہ بھٹو کو کھو کر ہم نے اپنا نقصان کیا، کیسے؟

○ اس لئے کہ لیڈر قوم کو اکٹھا کرنے والی ایک Binding force ہوتی ہے۔ لیڈر سیاسی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عمل کو آگے بڑھاتا ہے اور قوموں میں یکجہتی پیدا کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے سانحے کے بعد پشاور سے لیکر کراچی تک بھٹو صاحب ایک پُل کی طرح تھے اور اُن کے مخالف بھی ایک پُل تھے۔ قوم دو دھاروں میں بہہ رہی تھی۔ اور تمام چھوٹی چھوٹی باتیں اور اختلافات نیچے دب چکے تھے۔ پھر بھٹو صاحب نے اتفاق رائے سے ایک دستور دیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کے علاوہ ایٹمی پروگرام شروع کیا۔ تو یہ اُن کی خوبیاں ہیں جس کی وجہ سے ہم اُنھیں یاد کرتے ہیں۔ لیکن نیشنلائز کر کے انہوں نے ملک کی اکانومی کے ساتھ جو کچھ کیا اُس سے ہم آج تک عہدہ برا نہیں ہو سکے اور اُس کے نقصانات آج تک بھگت رہے ہیں۔ پھر اُنھوں نے اپوزیشن کے ساتھ جو روّیہ اختیار کیا، خود پیپلز پارٹی اُن کی اُس پالیسی کو ختم کر چکی ہے۔ نیشنلائزیشن اور اپوزیشن کے ساتھ محاذ آرائی بھی ترک کر چکی ہے بلکہ اب تو پیپلز پارٹی مفاہمت میں ہی اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ لوگ اُس مفاہمت کا مذاق اُڑانے لگ گئے ہیں۔ لہٰذا وقت سکھاتا ہے۔ اگر آپ درخت ہیں تو اُس پر نئے پتے اُگتے ہیں، نئے پھول اور پھل بھی لگتے ہیں۔ لیکن اگر لکڑی کاٹ کر رکھ دی گئی ہے اُس پر پھل لگیں گے نہ پھول۔ تو انسان بھی درخت سے کٹی ہوئی لکڑی نہیں ہوتا۔ وہ ایک درخت کی طرح ہوتا ہے۔ انسان کی سوچ کا عمل جاری رہتا ہے۔ لہٰذا ہم لوگ جو کچھ بھگتتے ہیں، مشاہدہ اور تجربہ کرتے ہیں وہ ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور پھر ہم اپنے معاملات اور خیالات پر نظر ثانی کرتے ہیں۔ انسان فرشتہ نہیں ہوتا، غلطیاں سب سے ہوتی ہیں اور اُن غلطیوں کا احساس بھی کرنا چاہیے تا کہ آپ صحیح صورت میں مستقبل کا انداز کر سکیں۔

☆ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پی این اے کی تحریک کے پسِ پردہ کچھ بیرونی محرکات بھی تھے؟

○ اگر آپ واقعات کی تہہ میں جائیں تو اِس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مارچ 1977ء کے انتخابات میں دھاندلی باقاعدہ منصوبہ بنا کر ہوئی۔ یہ سارے ڈاکومنٹس ریکارڈ پر ہیں اور لکھی ہوئی ایک ایک چیز موجود ہے۔ کیا ایک جمہوری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حکومت کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ با قاعدہ منصوبہ بندی سے دھاندلی کرے اور پھر دستور بننے کے دوسرے دن بنیادی انسانی حقوق معطل کر دے۔ پھر کیا کسی جمہوری حکومت کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ کسی اخبار کو آزادی نہ دے۔ کسی کو ڈیکلریشن نہ لینے دے تو کسی کو اشتہار۔ اور نیوز پرنٹ کو ایک سوغات بنا دے۔ لہٰذا بھٹو صاحب کے دور میں جو کچھ ہوا ہے اُس کی بھی تو مثال نہیں ملتی۔ انتخابات میں دھاندلی کے بعد پی این اے ایک فطری تحریک تھی۔ ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ پیپلز پارٹی کبھی بھی معاشرے میں 51 فیصد نہیں رہی۔ اُسکی عددی یا سیاسی حیثیت اِس لیے بہتر رہی کہ ملک میں اُس کے مقابلے میں کوئی بڑی پارٹی نہیں رہی۔ جب چھوٹی چھوٹی پارٹیاں اکٹھی ہوئیں تو وہ مقابلے کی طاقت بن گئیں۔ بعد میں جو مسلم لیگ (ن) کی شکل بنی وہ اِسی طرح بنی۔ پیپلز پارٹی کے مخالفین نے دیکھا کہ ہم تنہا اور الگ رہ کر نہیں لڑ سکتے تو وہ اکٹھے ہو گئے تو اُن کو طاقت مل گئی اور جب انتخابات میں دھاندلی ہوئی تو انہوں نے تحریک چلائی لہٰذا بھٹو صاحب نے مان لیا کہ میں نئے انتخابات کراؤں گا۔ یہ دنیا کی تاریخ میں ایک عجیب واقعہ ہے کہ آپ انتخابات کروائیں اور پھر چند دن بعد کہیں کہ میں نئے انتخابات کروانے پر تیار ہوں۔ گویا انھوں نے دھاندلی تو مان لی۔ مگر اُس کے بعد وہ فیصلہ نہ کر پائے اور چیزوں کو لٹکاتے رہے اِس طرح وقت اُن کے خلاف چلا گیا۔

☆ آپ سمجھتے ہیں کہ اُس وقت کچھ ایسی طاقتیں اور محرکات تھے جنھوں نے گھیر گھار کے بھٹو صاحب اور ملک کو ایک خاص صورتحال میں لا کھڑا کیا؟

○ وہ طاقتیں، ملک دشمن عناصر تو موجود رہتے ہیں اور پاکستان میں افراتفری کی خواہش رکھنے والے بھی موجود ہیں جب آپ مواقع فراہم کریں گے تو پھر وہ حملہ تو کریں گے۔ مثلاً مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا، اگر وہاں فوجی کارروائی نہ ہوتی اور اگر وہاں ہونے والا اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہ ہوتا تو صورتحال اس طرح نہ ہوتی جس طرح بعد میں ہوئی۔ انسانی جسم کے اندر ایک مدافعتی طاقت ہوتی ہے۔ وہ طاقت اسی وقت بروئے کار آتی ہے جب ہم اسے اندر سے استعمال کرنے کے قابل

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوتے ہیں اگر ہم بد پرہیزی کرتے چلے جائیں گے تو قوتِ مدافعت کم ہوتی چلی جائے گی تو پھر ہم کسی سے شکایت تو نہیں کر سکیں گے۔

☆ مشرقی پاکستان میں جب فوج کشی ہو رہی تھی تو کیا آپ فوج کی حمایت کر رہے تھے؟

○ اصل میں اس وقت معاملات بہت پیچیدہ ہو گئے تھے۔ جب فوج نے وہاں کارروائی کی تو سوائے چند لوگوں کے سبھی اس کی حمایت کر رہے تھے اور سب سمجھ رہے تھے کہ ہم اس پر قابو پا لیں گے اور بھٹو صاحب تو اس صورتحال میں بڑی پارٹی تھے۔ اُنھوں نے بھی فوجی کارروائی کو سپورٹ کیا۔ بات یہ ہے کہ سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور اگر اس وقت فوج کے پاس اقتدار نہ ہوتا تو بار بار ایسے مواقع آئے تھے کہ آپ حالات کو سنبھال سکتے تھے۔

☆ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ فوج ہی ملک ٹوٹنے کی ذمہ دار تھی؟

○ نہیں میں ایسا نہیں سمجھتا، لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ بار بار کی فوجی مداخلت نے سیاسی پارٹیوں اور قانون کی حاکمیت کے تصور کو کمزور کیا اور اسی وجہ سے علیحدگی پسند قوتیں مضبوط ہوئیں۔

☆ آپ تسلیم کر چکے ہیں کہ جاوید ہاشمی کو ضیاالحق کا وزیر بنوانے میں سو فیصد آپ کا ہاتھ تھا۔ بعد میں مصطفی صادق کو بھی آپ نے وزیر بنوایا۔ اس زمانے میں آپ پھانسیوں کی سزا معاف کروانے کے معاملات بھی کرواتے رہے۔ آپ مختلف افسروں کو فون کرتے، کام کہتے اور پھر کہتے یہ میرے پاس مارشل لاء کے وزیر جاوید ہاشمی بیٹھے ہیں۔ ان سے بات کریں، کیا ایسی کوئی بات تھی؟

○ یہ دونوں باتیں ایسے غلط معلوم ہوتی ہیں۔ سونا ہوتا ہے تو زیور اسی کا بنتا ہے، مٹی کا تو نہیں بنتا۔ جاوید ہاشمی صاحب اس وقت بڑے طاقتور سٹوڈنٹ لیڈر تھے تو میں نے ضیاء الحق صاحب کو اگر مشورہ دیا اور جاوید ہاشمی صاحب نے بھی سمجھا کہ اُنھیں آگے آنا چاہئے اور بڑا کردار ادا کرنا چاہئے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ میں نے ایک سفارشی چٹھی لکھ دی اور ان کو وزیر بنا دیا گیا۔ یہ ایک تجویز تھی جو جاوید ہاشمی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صاحب کو اور ان (ضیائ) کو بھی پسند آ گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے کبھی بھی اس طرح کے معاملے میں سفارش نہیں کی۔ جب تک میں یہ نہ سمجھ لوں کہ جس کی سفارش کی جا رہی ہے، اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ میں جا کے کسی کی سفارش نہیں کرتا۔ کوئی ایسا افسر نہیں ہوگا جو یہ کہہ سکے کہ میں نے دباؤ ڈالا ہے۔ یا کسی کے ناجائز کام کے لئے کہا ہے۔ میں جائز کام بھی کہنے سے گریز کرتا ہوں کیونکہ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم اخبار چھاپتے ہیں اور ہمیں اخبار میں ہی لوگوں کی شکایات درج کرنی چاہئیں۔ ہم سیاستدان نہیں ہیں، جن کے یہ کام ہیں۔

دوسری بات آپ نے مصطفی صادق کے حوالے سے کی، وہ تو ہنسی مذاق میں بات ہوئی تھی۔ ہم ضیاء الحق سے ملنے جا رہے تھے۔ ان کا نام آیا تو وہ وزیر ہو گئے۔ یہ تاریخی باتیں ہیں۔

☆ اور وہ وزیر بننے پر بہت فخر بھی کرتے رہے؟

○ ظاہر ہے وزیر ہو گئے تو ان کے لیے یہ ایک اعزاز کی بات تھی۔ میں ذاتی طور پر یہ منصب نہیں چاہتا تھا اور اس سے گریزاں ہی رہا۔ ایک اور بات یہ کہ ضیاالحق سے میرے قریبی تعلقات رہے تو مجھے کیا ضرورت تھی کہ جاوید ہاشمی صاحب کے پاس بیٹھ کر کسی کی سفارش کروں، ان کا نام استعمال کرنے کی ضرورت مجھے کیوں پڑتی، میں ان کا محتاج تو نہیں تھا۔ اگر کوئی اتنی مشکل ہوتی تو میں ضیاالحق سے بات کر لیتا۔

☆ ابھی آپ نے کہا بھٹو نے شخصی آزادیاں، انسانی حقوق، ڈیکلریشن، نیوز پرنٹ کے حوالے سے بہت سختیاں کیں اور اپوزیشن کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ ضیاالحق نے یہ سب کچھ کئی گنا زیادہ کیا۔ آج کے مجیب الرحمن شامی، ضیاء الحق کا اس طرح ساتھ دیتے جس طرح کہ انھوں نے اس وقت دیا؟

○ دیکھیں میں نے ضیاالحق کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس وقت ضیاء الحق کا مارشل لاء ڈیکلیئرڈ تھا کہ کسی کو کوئی آزادی نہیں اور کسی دستور کی حکومت نہیں ہے۔

☆ یہ تو کوئی جواز نہیں ہے۔۔۔ وہ جبر کی حکومت تھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o ٹھیک ہے مگر وہ ڈیکلیئرڈ تھی۔ اس کا یہ دعویٰ تو نہیں تھا کہ یہ جمہوری حکومت ہے۔

☆ فرض کریں، اِس وقت آپ کے آفس میں بیٹھے ہیں، ایک بندہ آ کر قبضہ کر لے تو ہم یہ کہیں گے کہ چونکہ اس نے قبضہ کر لیا ہے لہٰذا اِسی کی بات مانیں؟

o ہاں۔۔ مگر ہم کریں گے کیا؟۔۔۔ قبضہ کر لیا ہے۔ اور اگر میرے دفتر کے لوگ اس کے ساتھ مل جائیں اور قبضہ جما لیں تو میں باہر چلا جاؤں گا۔

☆ آپ اتنے شریف آدمی ہیں؟

o اور کیا کریں گے؟ اگر دفتر کے لوگ بھی ملے ہوں تو پھر میں کیا کروں گا۔

☆ لوگ احتجاج کر رہے تھے۔

o آدھی قوم جو پی این اے کو چاہ رہی تھی اس نے حلوہ پکا پکا کر میدہ، سوجی، گھی، اور چینی ختم کر دی تھی۔

☆ وہ تو جب ضیاء الحق مرے تو بھی لوگوں نے حلوہ اور مٹھائیاں تقسیم کیں۔

o وہ مٹھائی بہت کم لوگوں نے تقسیم کی۔۔۔ ہمیں ایک بات سمجھنی چاہئے کہ کوئی بھی ٹیک اوور خلا میں نہیں ہوتا۔ پاکستان میں کوئی بھی ٹیک اوور ایسا نہیں جو خلا میں ہوا۔

☆ آپ کی اس بات کو اگر آگے بڑھایا جائے تو اس سے تو یہ لگتا ہے کہ آئندہ بھی اگر کوئی مارشل لاء لگے تو آپ قوم کو پیغام دے رہے ہیں کہ وہ مزاحمت نہ کریں۔۔۔ ایک غیر سیاسی حکومت کے خلاف جدوجہد نہ کریں۔۔۔

o اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ لوگ مارشل لاء کو خوش آمدید کہیں تو اس کے خلاف کوئی جدوجہد نہیں ہوگی۔ میں عرض کرتا ہوں، ایوب خاں کا مارشل لاء لگا۔

☆ تو کیا یہ موجودہ چیف صاحب کے لیے گرین سگنل ہے؟

o نہیں، یہ کسی کے لیے بھی گرین سگنل نہیں۔ میں لوگوں کو سمجھاتا ہوں اپنے آپ کو درست رکھیں۔ کسی بھی چیز کا جواز ہے: Legitimacy by performance۔ پاکستان میں یہ مسئلہ رہا ہے۔ ایوب خان کا مارشل لاء لگا تو اسے بہت جوش خروش سے خوش آمدید کہا گیا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے مارشل لاء کو ویلکم کہا اور یحییٰ خان کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مارشل لاء لگا تو ایک آواز اس کے خلاف بلند نہیں ہوئی۔ ساری سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ کوئی ایک ایسا شخص نہیں تھا جس نے کہا ہو کہ یحییٰ خاں کہاں سے آ گیا۔ کوئی ہے تو اس کا نام بتائیں مجھے؟ بھٹو صاحب بھی خوش ہوئے کہ مارشل لاء لگ گیا۔ کیونکہ ایوب خان کوشش کر رہا تھا کہ مجلسِ قانون ساز کا اجلاس بلا کر دستور میں ترامیم کروائیں مگر یحییٰ خاں نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور سیاسی جماعتوں نے وہ طریقہ اختیار نہیں کیا، لہٰذا ایوب کے خلاف بغاوت کیے رکھی اور یحییٰ خاں کو سپورٹ کیا۔ اس کے بعد ضیاالحق کا مارشل لاء آیا تو قوم دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک حصے نے کہا بھٹو سے نجات ملنی چاہئے خواہ جیسے بھی ملے۔ وہ کہتے ہیں کہ بھاڑ میں جائے وہ سونا جس سے پھوٹیں کان۔ اور اسی سپورٹ پر ضیاء الحق نے حکومت کی اور یہی سپورٹ بعد میں مسلم لیگ ن کی صورت میں سامنے آئی۔ پرویز مشرف صاحب آئے تو نواز شریف مخالف جذبات کی وجہ سے انھیں ایک طرح سے پیپلز پارٹی کی سپورٹ حاصل تھی۔ لہٰذا کوئی مارشل لاء اس ملک میں ایسا نہیں تھا جس کو لوگوں کی سپورٹ حاصل نہ رہی ہو۔ ایک اور بات میں عرض کر دوں دنیا میں کوئی بھی حکومت لوگوں کی سپورٹ کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔

☆ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات نے معاشرے اور سیاست میں ذات برادری کی تقسیم پیدا کر دی اور ارکان اسمبلی جن کا کام آئین سازی تھا وہ گلیاں بنانا شروع ہو گئے؟

○ اس وقت آپ ایک صورتحال میں پھنسے ہوئے تھے کہ ملک میں انتخابات ہونے چاہئیں یا نہیں؟ تو ضیاء الحق نے کہا کہ میں غیر جماعتی الیکشن کرواؤں گا۔۔۔۔۔

☆ میں ان انتخابات کے نتائج کی بات کر رہا ہوں۔۔۔

○ میں وہی عرض کر رہا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب آپ کو بھوک لگی ہوئی ہو تو جو بھی کھانا ملے تو آپ کھا لیتے ہیں۔ بعد میں اگر پیٹ میں درد ہو تو آپ کہتے ہیں کہ یہ کھانا نہیں کھانا چاہئے تھا مگر آپ کے پاس چوائس نہیں ہوتی۔ 1985ء میں ہمارے پاس کوئی چوائس تھی؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ آپ سیاسی فیصلوں کو کھانوں سے تشبیہ نہ دیں۔

○ ہر بات ایک خاص پس منظر میں ہوتی ہے نہ کہ خلا میں۔ فوج کے خلاف آپ کیا کریں گے یا تو کسی دوسری فوج سے مدد لیں گے یا اس سے مفاہمت کریں گے اور راستہ نکالیں گے۔ کسی دوسری فوج سے تو ہم مدد نہیں لے سکتے تھے اور نہ ہم لینے کو تیار ہیں۔ میں تو ان لوگوں میں نہیں ہوسکتا جو انڈیا کی فوج سے مل جائیں تا کہ پاکستانی فوج کو شکست دی جاسکے۔ لہٰذا اگر پاکستان کی فوج اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے۔ تو اس سے بات چیت کر کے ہمیں معاملہ آگے چلانا پڑے گا۔ پروفیسر غفور صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر کوئی ہوائی جہاز ہائی جیک کر لے تو اس سے بات چیت کرنی پڑتی ہے نہ کہ آپ جہاز تباہ کر دیتے ہیں۔ فوج جب اقتدار پر قبضہ کرتی ہے تو اس کے خلاف اسی طریقے سے جدوجہد ہوتی ہے اور سیاسی طریقے سے ہی راستہ نکالا جاتا ہے۔ اب ضیاء الحق کے مارشل لاء کا معاملہ تھا کہ جب انہوں نے کہا کہ میں غیر جماعتی الیکشن کراؤں گا۔ اب چوائس کیا تھی الیکشن یا No الیکشن، لہٰذا میں نے خود کہا کہ ٹھیک ہے غیر جماعتی الیکشن منظور ہیں۔ یہ الیکشن، انتخابات نہ ہونے سے بہتر ہیں اور پھر آپ نے دیکھا کہ انھی انتخابات میں سے راستہ نکلا اور سیاسی عمل شروع ہوا اور اسی سیاسی عمل کے نتیجے میں آگے چل کر بے نظیر بھٹو کی حکومت قائم ہوئی۔ راستہ بند کرنا نہیں، راستہ نکالنا سیاست ہے۔

☆ لیکن آپ اس بات سے متفق ہیں کہ غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں سوسائٹی تقسیم ہوئی اور ذات برادری کی بنیاد پر سیاست نے فروغ پایا؟

○ اگر یہ نہ ہوتا تو دوسری تقسیم ہوتی۔ بھٹو صاحب کے دور میں یہ تقسیم ہوئی۔ بھٹو صاحب کے دور میں یہ تقسیم اتنی انتہا پر چلی گئی کہ ایک دوسرے کا خون بہانا بھی جائز ہو گیا۔ ولی خان وغیرہ جیل کی کوٹھڑی میں تھے اور موت کی سزا ان کے سر پر منڈلا رہی تھی اور کتنے سیاسی قتل جن کی تحقیقات ہی نہیں ہوئیں۔ کتنے لوگوں کی فریاد ہی نہیں سنی گئی۔ آپ نے جمہوریت کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے، یہ پھر جمہوریت تو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نہ ہوئی۔ ایسے تو ہٹلر بھی منتخب ہو کر آیا تھا۔ اگر آپ چلا نہیں رہے تو پھر جمہوریت کہنے سے تو قائم نہیں ہو جائے گی۔

☆ میرا سوال ہے کہ غیر جماعتی الیکشن کے باعث سوسائٹی تقسیم تو ہوئی؟

o سوسائٹی تو پہلے ہی تقسیم تھی۔

☆ لیکن وہ تو پولیٹیکل تقسیم تھی۔ ارکانِ اسمبلی کے گلیاں بنانے کا رواج تو اُس کے بعد ہی شروع ہوا۔

o مگر اِن انتخابات سے سیاسی عمل تو شروع ہو گیا اور جمہوریت تو بحال ہو گئی۔۔۔۔

☆ آپ اِس لیے تو بہت زیادہ ڈیفنڈ نہیں کر رہے کہ میں اگلا سوال یہ کروں گا کہ آپ کی تجویز پر ہی غیر جماعتی الیکشن ہوئے؟

o میری تجویز پر نہیں ہوئے لیکن میں نے سپورٹ کیا۔

☆ مظفر محمد علی کی کتاب میں اپنے انٹرویو میں آپ نے کہا ہے کہ:

''میں نے ضیاء الحق کو راستہ دیا کہ آپ ایسے کر لیں۔ کیونکہ وہ پریشان تھے کہ اگر میں جماعتی الیکشن کرواؤں گا تو پیپلز پارٹی دوبارہ آ جائے گی لہٰذا ضیا الحق شش و پنج میں تھے کہ الیکشن کرواؤں یا نہ؟ تو میں نے کہا غیر جماعتی الیکشن کروا لیں''

o نہیں میں نے اُن سے یہ بات نہیں کہی۔ وہ اِس بات پر غور کر رہے تھے کہ غیر جماعتی الیکشن ہو پائیں گے کہ نہیں۔ تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ انتخابات کروائیں، خواہ غیر جماعتی کیوں نہ ہوں۔ ہم نے اُن سے کہا ہم انتخابات کو سپورٹ کریں گے۔ ایک میٹنگ میں مجید نظامی صاحب نے کہا کہ آپ مجھے لکھ کر دیں کہ آپ غیر جماعتی انتخابات کروائیں گے تو پھر میں آپ کو سپورٹ کروں گا۔ کیونکہ میں اگر سپورٹ شروع کر دوں تو آپ جماعتی الیکشن کروا دیں۔ بات پھر وہی کہ ایک خاص فضا ہوتی ہے جس میں آپ پھنسے ہوتے ہیں۔ پھر اُس صورتحال میں آپ کو نکلنے کا راستہ تلاش کرنا ہوتا ہے تو وہ راستہ تلاش کر کے آپ آگے بڑھتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ ایک انٹرویو میں ''آپ نے کہا کہ جب میں کارکن صحافی تھا تو بلا خوف اپنی بات کرتا تھا۔ مالکانہ حقوق میسر آتے ہیں تو مختلف حربے اختیار کرنا پڑتے ہیں'' یہ حربے کیا ہیں؟

○ آپ انٹرویو لینے والے بعض اوقات اپنے الفاظ بھی اُس میں ڈال لیتے ہیں۔

☆ آپ دیکھ لیں، یہ کتاب میں ساتھ لایا ہوں۔۔۔

○ الفاظ تو ڈالے جاسکتے ہیں۔ حربے، طریقے کئی لفظ ایسے ہوتے ہیں جن سے بات میں فرق آجاتا ہے۔ دیکھیں اِدارے کی ذمہ داری ایسی ہوتی ہے کہ تقاضے مختلف ہوجاتے ہیں اور اگر آپ صرف لکھنے والے ہیں یا کالم نگار ہیں تو آپ کی ذمہ داری صرف لکھنا ہوتا ہے۔ البتہ دوسری صورت میں آپ کو بہت ساری چیزیں سوچنی پڑتی ہیں۔

☆ اِسی کتاب میں آپ پرویز مشرف کے حوالے سے بات کررہے ہیں:

''کہ میں نے اصولی طور پر کوشش کی ہے سچ بولنے کی، جتنا میں کرسکتا تھا میں نے کیا ہے، جب کبھی مجھے موقع ملا میں سچ کی آواز اصولی طور پر بلند کرتا رہا۔ لیکن اب محسوس کرتا ہوں کہ جتنی شدت سے اپنی بات مجھے کرنا چاہئے تھی وہ میں نے نہیں کہی''۔

○ یہ ٹھیک بات ہے۔۔۔

☆ اِسی پس منظر میں حربوں والی بات بھی تھی۔۔۔

○ دیکھئے، اگر شدت سے اپنی آواز بلند کرتے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہمارا ادارہ بند ہو جاتا، ڈیکلریشن منسوخ ہوجاتا یا کچھ اور ہوجاتا۔ مخالفانہ کارروائیاں ہوئیں بھی تو ہمارے اپنے سٹاف کے لوگ بار بار آکے مجھ سے کہتے تھے کہ کوئی ایسا کام نہ کردیجئے گا کہ ہم سب بیروزگار ہوجائیں۔ آپ کو کئی چیزیں کرنی پڑتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آدمی ہر وقت ایک اذیت کے مقام پر کھڑا نہیں ہوتا بعض اوقات رخصت بھی طلب کرلیتا ہے۔ علاوہ ازیں میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں ہر وقت امام احمد بن حنبل کے مقام پر کھڑا رہا ہوں۔ (قہقہہ)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ آپ سمجھتے ہیں کہ اخبار کا مالک بن کر آپ نے سمجھوتے کیے ہیں؟

○ نہیں میں سمجھوتا تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ ہے کہ جب آپ ایک بڑے ادارے کو چلا رہے ہوتے ہیں تو آپ کو اُس کی زندگی کی آرزو تو کرنا پڑتی ہے۔ لہٰذا اِس بات کو آپ کوئی بھی نام دے لیں۔ سمجھوتہ کہہ لیجئے۔ حکمت یا مفاہمت کہہ لیجئے، کچھ نہ کچھ معاملہ تو ہوتا ہے۔ اب میں بطور وضاحت آپ کو عرض کروں کہ بھٹو صاحب کے دور میں ایک جلسہ تاج پورہ (لاہور) میں ہوا۔ اس میں لوگ مار دیے گئے اب ڈیفنس آف پاکستان کے رُول (Rule) کے تحت یہ پابندی لگی کہ آپ اِس کی خبر نہیں چھاپ سکتے یعنی جلسے کی خبر ہی نہیں چھاپ سکتے جس میں لوگ مرے ہیں تو نوائے وقت نے یہ خبر چھاپی کہ ''ڈیفنس آف پاکستان کے رُول کے تحت تاج پورہ جلسے کی تفصیلات شائع کرنے پر پابندی لگا دی گئی'' مگر خبر نہیں چھاپی لیکن الطاف حسن قریشی صاحب نے اپنے اردو ڈائجسٹ میں اُس پر پورا مضمون لکھا جس پر انہیں کئی سال قید کی سزا بھگتنی پڑی۔ اُن پر مقدمہ قائم ہوا۔ وہ خود اور اُن کے بڑے بھائی اعجاز حسن قریشی جیل گئے اور اُن کی رہائی بھٹو صاحب کے جانے کے بعد ہوئی۔

تیسرا طریقہ ہمارا تھا۔ میں اپنا ہفت روزہ نکالتا تھا۔ میں نے ایک پمفلٹ بنایا جس میں اُس جلسے کی تصویریں اور رپورٹ تھی۔ اور اُس پمفلٹ پر ہفت روزہ 'اسلامی جمہوریہ' کی پرنٹ لائن نہیں تھی۔ میں نے چار صفحے کا پمفلٹ چھاپ کر رسالے کے اندر رکھ دیا۔ تاکہ قانونی طور پر میرے خلاف کارروائی نہ ہو سکے کہ یہ سب کچھ میں نے اپنے ہفت روزہ میں چھاپا ہے۔ ایک پمفلٹ ہے کسی نے چھاپ دیا۔ اس پر کارروائی ہوتی رہے لہٰذا وہ پمفلٹ ہم نے اپنے ہفت روزہ کے ساتھ تقسیم کر دیا۔ اب تین طریقے سے اس معاملے کو ڈیل کیا گیا۔ ایک میں سخت تنقید کی گئی، ایک میں صرف خبر اور ایک طریقہ بیچ میں ہم نے ڈھونڈ لیا۔ اب آپ اس کو کیا کہیں گے؟ بس اسی طریقے سے راستہ بنانا پڑتا ہے۔

☆ اب تو زیادہ جدید طریقے آ گئے ہونگے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ راستہ بنانا پڑتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایئر مارشل اصغر خاں کی کتاب بین کر دی گئی تھی، لیکن میں نے وہ کتاب چھاپی، اس کا خلاصہ قومی ڈائجسٹ میں چھاپا۔ اصل میں ہوا یہ تھا کہ وہ کہنے لگے کہ کتاب چھاپنی ہے۔ میں نے کہا کہ کتاب میں لندن کا پتہ دے دیں۔ وہ کتاب میرے پریس میں چھپی۔ یہاں اس کی بائنڈنگ ہوئی اور پھر وہ کتاب یہاں تقسیم بھی ہوئی۔ لیکن پتہ انگلینڈ کا تھا کہ جیسے یہ کتاب وہاں سے چھپی ہو۔ تو یہ سارے کام کرنے پڑتے ہیں اور ہم نے کیے بھی۔ مسلح نہیں، لیکن غیر مسلح گوریلا جدوجہد تو ہم کر سکتے ہیں۔ بس ایک طریقہ نکالنا پڑتا ہے اپنی بات کہنے کے لیے۔

☆ یہ 'ایڈوائس' کیا ہوتی ہے؟ کون کہتا ہے کہ فلاں خبر چھاپیں یا نہ چھاپیں؟

○ اب تو یہ ایڈوائس ختم ہوگئی یا بہت کم ہوگئی ہے۔ اب تو الیکٹرانک میڈیا کا اتنا زور ہو گیا ہے۔

☆ یعنی وہ ایڈوائس سے پہلے خبر دے دیتے ہیں۔

○ جی بالکل، لیکن پھر بھی حکومت کے کئی افسر ایسے ہوتے ہیں۔ پنجاب حکومت میں بھی موجود ہیں۔ ٹی وی پر خبر چل رہی ہوتی ہے ہمیں کہتے ہیں یہ خبر ایسے نہ چھاپیں۔ پھر ہم کہتے ہیں حضور آپ ٹی وی تو کھول کر دیکھ لیں۔ افسروں کا تو کام ہے، وہ باز نہیں آسکتے۔ اب اگر وہ ایڈوائس کرتے ہیں کہ آپ یہ کام اس طرح نہ کریں اور آپ وہ ایڈوائس نہیں مانتے تو وہ آپ کے اشتہار بند کر دیتے ہیں۔ اور یہ "کچھی مار" ہے کہ آپ کو اشتہار ملنا تھا مگر انھوں نے نہیں دیا۔ پوچھیں تو یہی کہیں گے۔ "اچھا آپ کو اشتہار نہیں ملا؟ اوہ۔۔۔ جائزہ لیتے ہیں"۔

اس طرح وہ اندر ہی اندر آپ کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں اور پھر آپ کو کئی چیزوں کی طرف توجہ دینی پڑتی ہے کیونکہ ہر چیز اتنی بنیادی تو نہیں ہوتی کہ آپ ان پر سٹینڈ لے لیں۔

☆ عمر شامی صاحب کا این آئی سی ایل کیس سے کیا تعلق تھا؟ سردار خان نیازی کا کہنا ہے کہ اس سکینڈل کا مرکزی کردار عمر شامی تھا مگر اس کا کسی نے نام نہیں لیا؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ چلیں اللہ تعالیٰ انہیں سچ بولنے پر جو سزا دے سکتا ہو دے۔۔۔

☆ یعنی وہ سچ بول رہے ہیں؟

○ یہ سچ ہی ہوگا تبھی وہ کہہ رہے ہیں۔۔۔

یہ اتنی لغو بات ہے کہ میں اس کی تردید کرنا بھی توہین سمجھتا ہوں۔ چودھری مونس الٰہی میرے برخوردار ہیں۔ وہ چودھری پرویز الٰہی کے بیٹے ہیں اور میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ ان کے جو معاملات تھے وہ عدالتوں میں چلے گئے اور ان کو وہاں سے ریلیف ملا۔ ہم ان کے ساتھ نہیں ہیں مگر جس طرح دوسرے لوگ ہیں وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ ہمارا اس قسم کے کسی کام سے تعلق نہیں رہا۔

☆ لبرٹی میں آپ کا کوئی پٹرول پمپ ہے؟

○ ہاں ہے۔ اس کی ڈیلر شپ عمر شامی صاحب کے پاس ہے۔ وہ پمپ شیل والوں کی ملکیت ہے، لیکن چلا اسے عمر شامی رہے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ زمین آپ کی ہوتی ہے اور آپ پمپ لگاتے ہیں جب کہ کمپنی آپ کو سروسز دیتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کمپنی پمپ لگاتی ہے لیکن ڈیلر شپ آپ کے پاس ہوتی ہے۔

☆ کتنے پمپ ہیں آپ کے پاس؟

○ بس ایک، وہی۔

☆ شہباز شریف نے ساری تجاوزات گرائیں۔ آپ کا وہ پمپ بھی شاید تجاوزات میں آتا ہے لیکن وہ نہیں گرایا؟

○ نہیں، ایسی بات نہیں۔ کسی کو اعتراض ہے تو عدالت میں چلا جائے۔ شیل ایک ملٹی نیشنل کمپنی ہے اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ اپنا بزنس لاہور میں بند کر دیں تو اور بات ہے۔

☆ متروکہ وقف املاک سے آپ نے ڈیڑھ سو کنال زمین الاٹ کرائی اور عبدالعلیم خاں کو آٹھ کروڑ میں بیچ دی۔۔۔ یہ کیس نیب میں بھی گیا۔ عبدالعلیم خاں نے یہ زمین ڈی ایچ اے کو بیچ دی اور اسی سلسلے میں آپ نے انھیں ویلیوٹی وی کے شیئرز بھی دیئے۔ اس معاملے میں کہاں تک سچائی ہے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ یہ ساری خبریں میرے لیے نئی ہیں۔ آج تک مجھے کوئی اطلاع نہیں۔ ڈیڑھ سو کنال اگر کہیں ہے تو جو صاحب اطلاع دے رہے ہیں وہ اس پر قبضہ کر لیں۔

☆ ویلیوٹی وی آپ کے پاس کیسے آیا؟

○ وہ عمر شامی صاحب کا معاملہ ہے، ان سے رابطہ کریں۔

☆ لارنس روڈ پر متروکہ وقف املاک نے کچھ فلیٹ بنائے ہیں جو صحافیوں کو الاٹ کئے گئے ہیں۔ سنا ہے آپ نے بھی دو فلیٹ الاٹ کروائے ہیں؟

○ میرے پاس کوئی فلیٹ نہیں ہے۔ انہوں نے درخواستیں مانگی تھیں وہاں شاید ایک کمرے کے فلیٹ ہیں۔ میرے پی اے فاروق نے درخواست دی تھی، اس کے پاس ایک فلیٹ ہوگا۔

☆ آپ کے ایک ایمپلائی کے پاس فلیٹ ہے یا دو کے؟

○ مجھے نہیں معلوم۔ ہوسکتا ہے کسی دوسرے کے پاس بھی ہو۔ لیکن اس میں میرا کوئی کردار نہیں ہے۔

☆ نیشنل بنک سے آپ نے کوئی 6,5 ملین کا قرضہ معاف کروایا ہے اور سپریم کورٹ میں جو قرضہ معاف کرانے والوں کی لسٹ پیش ہوئی ہے۔ صحافیوں میں سے اس لسٹ میں صرف آپ کا نام ہے؟

○ یہ باریکس لمیٹڈ کا قرضہ ہے۔ میں نے نہ کوئی قرضہ لیا نہ معاف کروایا ہے۔ باریکس لمیٹڈ کے جو قرضے ہمارے پاس تھے۔ انھوں نے قانون کے مطابق جس طرح باقی لوگوں سے ڈیل کیا ویسے ہی ہمارے ساتھ کیا۔

☆ آپ نے اپنا کوئی اثر ورسوخ استعمال نہیں کیا؟

○ پرویز مشرف صاحب کے دور میں میرا اثر ورسوخ کیا ہوسکتا تھا؟ جو بھی معاملات دوسروں کے ساتھ ہوئے وہی باریکس لمیٹڈ کے ساتھ ہوئے۔۔۔

☆ بعد میں پرویز مشرف کے ساتھ آپ کی لائن سیدھی نہیں ہوگئی تھی؟ جس کی وجہ سے نواز شریف بھی آپ سے کچھ نالاں تھے؟

○ نواز شریف صاحب اور پرویز مشرف صاحب بھی زندہ موجود ہیں، آپ ان سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پوچھ سکتے ہیں۔

☆ جب آپ نے دوبارہ اخبار چھاپنا شروع کیا تو اس کو ایک نئی زندگی ملی، اس کی سرکولیشن بہت بہتر ہوگئی۔ آج کل بہت کم سرکولیشن ہے اور جو اندر کی بات ہے وہ یہ ہے کہ اشتہارات آپ کو اسی تناسب سے ملتے ہیں جو آپ نے اے بی سی میں بنا رکھی ہے۔ لیکن جو درآمد شدہ سیاہی اور نیوز پرنٹ ہے وہ بہت مہنگے بک جاتے ہیں۔ تو کم اخبار چھاپنا دراصل میں مالک کی لاٹری کے مترادف ہے۔ اس معاملے کی وضاحت فرمادیں؟

○ جو لوگ یہ کام کررہے ہیں آپ ان سے پوچھیں۔۔۔

☆ آپ کو پتا ہے یہاں لاہور کی مارکیٹ میں صرف دو چار بنڈل پاکستان اخبار جاتا ہے؟

○ بات یہ ہے کہ جتنا بھی جاتا ہے وہ مارکیٹ میں جاتا ہے اور میرا نہیں خیال کوئی ایسا ادارہ قائم ہوا ہے جو اخباروں کی اس طرح جانچ پڑتال کرے۔ جو سسٹم موجود ہے اس کے مطابق ہمارا اخبار بھی چل رہا ہے۔ جنگ بھی چھپ رہا ہے۔ نوائے وقت اور خبریں بھی اسی طریقے سے آرہا ہے۔ اسی سسٹم کے تحت اخبار چل رہے ہیں۔ آڈٹ ہورہے ہیں اور معاملات چل رہے ہیں۔

☆ وہ تو کاغذوں کے پیٹ بھرنے۔۔۔

○ میں۔۔۔ روزنامہ پاکستان کے بھی متعلق نہیں اور نہ اس کا پبلشر ہوں۔ پبلشر عمر شامی صاحب ہیں۔۔۔ اور جس طرح کی باتیں آپ کررہے ہیں اس طرح کی باتیں ہر اخبار کے بارے میں اس کے حریف اڑاتے ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا اور نہ میں کسی اور پر الزام تراشی کرنا چاہتا ہوں۔ اور نہ میں اس طرح کے سوالات۔۔۔

☆ شامی صاحب یہ تو سچ ہے کہ جس طرح آپ نے اخبار اٹھایا تھا۔ کالم بڑے اچھے ہوتے تھے۔

○ میں اس غیر متعلقہ بحث میں جانا ہی نہیں چاہتا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اخبار کا منافع آپ پراپرٹی کے بزنس میں لگا دیتے ہیں اور کارکنوں کو تین تین چار چار ماہ تنخواہ نہیں ملتی؟

○ میں نے کہا کہ اخبار کا عمر شامی صاحب سے تعلق ہے۔۔۔

☆ یعنی میں اخبار سے متعلقہ آپ سے کوئی سوال نہیں کر سکتا؟

○ نہیں۔۔۔

☆ آپ میری بات سنیں۔۔۔ عمر صاحب کے حوالے سے بات کر لیتے ہیں۔ آپ خود ایک کارکن صحافی رہے ہیں۔ تو کیا صحافیوں کو اتنا عرصہ تنخواہ نہ ملنا ظلم نہیں؟

○ نہیں میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے۔۔ جب بھی کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے، کارکن ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ اداروں پر مشکل حالات آتے جاتے رہتے ہیں۔

☆ اس دفعہ مشکلات کچھ لمبی نہیں ہو گئیں؟

○ میرا نہیں خیال کہ آپ کی یہ اطلاع درست ہے۔

☆ نذیر ناجی صاحب کی 'دی نیوز' کے محمد احمد نورانی سے کی گئی ایک گفتگو انٹرنیٹ پر موجود ہے، جس میں اُنھوں نے اُس رپورٹر کو گالیاں بھی دیں، اس گفتگو میں انھوں نے باقاعدہ نام لے کر کہا کہ ''شامی سے کیوں نہیں پوچھتے اس نے بھی تو پلاٹ لیا ہے''۔ اس حوالے سے آپ کیا فرماتے ہیں؟

○ میں نے کوئی پلاٹ الاٹ نہیں کروایا۔

☆ گورنمنٹ نے خود بخود دے دیا؟

○ اسلام آباد میں کچھ پلاٹ ایڈیٹرز کے لئے مختص کئے گئے اور اشتہار دے کر اس کے لیے درخواستیں مانگی گئیں۔ ایڈیٹر کے طور پر میں نے درخواست دی اور مجھے پلاٹ مل گیا۔ وہ الاٹمنٹ نہیں، دوسرے کئی ایڈیٹروں کی طرح میں نے وہ خریدا ہے۔

☆ اور صحافی کالونی میں دوسرے صحافیوں کے ساتھ؟

○ نہیں، کبھی میں پریس کلب کا مستقل ممبر ہوا کرتا تھا۔ مگر اب انھوں نے کہا کہ جی آپ کی تو فائل ہی گم ہو گئی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ عمر شامی صاحب کو ملا؟

○ نہیں وہ تو پبلشر ہیں ان کو کیسے ملتا۔ ہمارے کسی بیٹے کو پلاٹ نہیں ملا نہ ہم نے مانگا۔

☆ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ قائداعظم کے سیکرٹری، کے ایچ خورشید کی بیوہ کے پلاٹ پر بھی آپ نے قبضہ کرلیا؟

○ بیگم ثریا خورشید میرے لئے بڑی عزیز اور قابل احترام خاتون ہیں۔ ماشاءاللہ ابھی وہ زندہ ہیں، آپ اُنھی سے معلوم کریں۔ ہم تو ان کے معاملات میں جو تعاون بھی کرسکتے ہیں، کرتے ہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ کوئنز روڈ پر انھیں کوئی مکان الاٹ ہوا تھا مگر اس کے کاغذات نہیں مل رہے تھے۔ میں اُن کے ساتھ مل کر وہ کاغذات تلاش کرنے کی حد درجہ کوشش کرتا رہا تاکہ انھیں مکان مل سکے مگر کاغذات ہی نہ ملے۔

☆ ویج بورڈ کے معاملے پر آپ کا موقف کیا ہے؟

○ میرا وہی موقف ہے جو اے پی این ایس کا۔۔۔

☆ کہ کارکنوں کو کچھ نہ دیا جائے؟

○ نہیں کیوں نہیں۔ کارکنوں کو ہر چیز دی جائے۔ دیکھیں یہ تو ایک نعرہ بن چکا ہے۔ کئی اِدارے ایسے ہیں جہاں ویج بورڈ سے کہیں زیادہ تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ ہر ادارہ اپنے حالات کے مطابق تنخواہیں مقرر کرتا ہے۔ بہرحال جب تک وہ قانون موجود ہے اُس کے مطابق عمل ہونا چاہئے۔

☆ پی ایف یو جے کے پرویز شوکت صاحب نے کہا کہ چھوٹے پبلیکیشن سے مجیب الرحمن شامی جتنے فائدے کسی نے نہیں اٹھائے۔

○ اُن کی بڑی مہربانی اور نوازش ہے۔ پتا نہیں، وہ ہمارے ادارے کو چھوٹا کس لیے کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو اس پر بھی اعتراض ہے۔ فائدے کیا اٹھائے ہیں ان کی تفصیل بھی بتادیں۔ میں تو ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔

☆ شامی صاحب آپ کا کہنا ہے کہ ''جماعت اسلامی نے ہمیشہ کوشش کی کہ جمہوریت کا احیاء کیا جائے'' یہ بتایئے کہ یہ کوشش انھوں نے کب اور کہاں کی؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ (ہنستے ہوئے) میں نے کب کہا؟ دیکھئے جماعت اسلامی کی ایوب خاں کے خلاف جدوجہد ہے اور۔۔۔ پھر بھٹو صاحب کے خلاف بھی اُنھوں نے بڑی جدوجہد کی جو آج بھی جاری ہے۔

☆ اور ضیاء الحق کو کھڑا کرنے میں بھی اُن کی بڑی جدوجہد ہے۔

○ دیکھئے! اس وقت مسلم لیگ بھی ان کے ساتھ موجود تھی اور جماعت اسلامی بھی۔۔۔

☆ مسلم لیگ نے تو ہمیشہ حکمرانوں کے لیے 'گھوڑی' کا کردار ادا کیا۔

○ بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کا کردار جمہوریت کے حق میں رہا ہے۔ آپ ان کی کسی بات یا فیصلہ سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن جماعت اسلامی اچھے شریف لوگوں کی جماعت ہے۔ وڈیروں، جاگیرداروں کی نہیں بلکہ کارکنوں کی جماعت ہے۔۔۔۔

☆ آپ کبھی رہے اس میں؟

○ نہیں۔۔۔

☆ آپ کی ہمدردیاں ان کے ساتھ رہی ہیں۔

○ اب بھی ہیں۔۔۔

☆ اب تو کافی لوگوں کے ساتھ آپ کی ہمدردیاں ہیں۔۔۔

○ دیکھئے میری ہمدردیاں تو سب کے ساتھ ہیں۔ میری اپنی پسند ہے۔ مجھے جماعت اسلامی کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔

☆ وہ بھی آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔

(قہقہہ)

☆ مظفر محمد علی والے انٹرویو میں ہی آپ نے کہا کہ ''یہاں نشان حیدر تھوک کے حساب سے بانٹے گئے'' آپ کے خیال میں کس کو نشان حیدر غلط ملا؟

○ بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کا جو واقعہ ہوا۔ جنگ ہم نے ہاردی اور نشان حیدر کتنے دے دیئے؟ جس طرح ہمارے زرداری صاحب نے ہلال امتیاز بانٹ دیئے ہیں۔ میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا۔ سب قابل احترام سپاہی ہیں۔ جو جان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دیتا ہے وہ قابل احترام ہے۔ یہ اتنا بڑا اعزاز ہے اسے دیتے ہوئے سوچنا تو چاہئے۔ ایک ہاری ہوئی جنگ میں آپ نے اتنے نشان حیدر دے دیئے جتنے 65 کی جنگ میں بھی نہیں دیئے۔

☆ آپ کو ہلال امتیاز کیوں نہیں ملا؟ اب زرداری صاحب آپ کے کان میں بھی سرگوشیاں تو کرتے ہیں۔۔۔!

○ یہ آپ انہی سے پوچھیں۔

ہوسکتا ہے وہ مجھ سے پوچھ رہے ہوں لینا ہے؟ میں نے کہا ہو۔۔۔نہیں۔۔۔ یہ کوئی ریوڑیاں تو نہیں کہ آپ جس کو مرضی دے دیں۔

☆ اسی انٹرویو میں آپ نے کہا کہ شیخ رشید Loose Talk کے بادشاہ ہیں۔ نہ تو ان سے بات ہوسکتی ہے نہ ہی مکالمہ، اس لئے کہ وہ صرف اپنی بات سنانے کے عادی ہیں۔

○ بات یہ ہے کہ کسی شخص کے بارے میں وقتی طور پر تو کوئی ریمارکس دیئے جاسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس وقت کوئی ایسا واقعہ ہوا ہو جو میں نے یہ بات کہہ دی۔ شیخ صاحب میرے دوست ہیں اور میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔ ان کی کتنی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ اسی طرح کئی میری باتیں انھیں اچھی نہیں لگتی ہونگی۔

☆ شامی صاحب آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ ''اردو میں ہمارے اکثر لکھنے والے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ تحقیقی تجزیہ نہیں کرتے۔ ایک خلا کا احساس ہوتا ہے۔ بعض اوقات محض جذباتی کیفیات ہوتی ہیں۔ ہمارے بیشتر دوست چیزوں پر غور نہیں کرتے۔ نان ایشوز کو ایشوز بناتے ہیں''۔ آپ کے خیال میں اردو میڈیا میں جذباتیت کی وجہ کیا ہے؟ اور آپ نہیں سمجھتے آپ خود بھی یہی کام کرتے رہے ہیں؟

○ میں نے یہ عمومی بات کی ہوگی، کسی کے اوپر تبصرہ نہیں۔ ہمارے ہاں صحافت اور کالم نگاری میں عمومی طور پر جذبات کا رنگ غالب ہے۔ شروع سے میری یہ کوشش رہی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے کہ تحریر ہو یا تقریر اس میں جاندار مواد ہو۔ جذبات بھی شامل ہو سکتے ہیں لیکن صرف جذبات نہ ہوں۔

☆ اِس جذباتیت کی وجہ کیا ہے؟

○ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ پوری قوم اسے بولتی اور سمجھتی ہے۔ ظاہر ہے بعض اوقات جوش وجذبہ پیدا کرنے کیلئے یہ صورت پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان چیزوں کو درست کرنا چاہئے۔

☆ شامی صاحب مجمع گیری اور دانشوری میں فرق تو ہونا چاہئے؟

○ یہ آپ کا خیال ہے۔ میں تو دانشوروں کیلئے مجمع گیری کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ بات تو آپکی درست ہے۔ لیکن ذرا احتیاط سے کر دینی چاہئے۔ (طویل قہقہہ۔۔۔۔)

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

تو جب ہم لوگوں کو کہہ رہے ہیں کہ مجمع گیری نہ کریں تو ہمیں خود بھی نہیں کرنا چاہئے۔ (قہقہہ۔۔۔)

☆ ہماری صحافت میں ایجنسیوں کے کردار کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ کسی نے کبھی آپ سے رابطہ کیا؟ سیاسی جماعتیں کس طرح صحافت پر اثر انداز ہوتی ہیں؟

○ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں جو اس وقت معاملات ہیں ان میں سب سے کم کرپشن اگر کسی طبقے میں ہے تو وہ اخبار نویس ہیں۔ اور کتنے ایسے اخبار نویس ہونگے جن کی ڈیفنس یا گلبرگ میں کوٹھیاں ہوں۔ کوئی پلازے یا مکانات ہوں۔ بحیثیت مجموعی صحافی کالونی میں بھی جگہ مل جائے تو بڑی غنیمت ہے۔ اور جہاں تک مالکان کا تعلق ہے۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو بہت محنت کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اب بزنس مین بھی ادھر آ رہے ہیں۔ ہمارے پیشے کے بارے میں بہت پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہاں کوئی بہت کالی بھیڑیں رہ رہی ہیں۔ یہ سفید قسم کی بھیڑیں ہیں۔ ان میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے کوئی اکا دکا ہی ایسے معاملات میں ملوث ہونگے۔ میں نے اپنے پیشے کے اندر کوئی قابل ذکر کرپشن نہیں پائی۔ ایجنسیاں وغیرہ سب حکمرانوں کے چونچلے ہیں۔ وہ سیاستدان ہوں یا فوجی حکمران۔ یہ ان کے تابع ہی وہ کام کرتے ہیں۔ لہٰذا جب ملک کا انتظام خراب ہوتا ہے تو ایجنسیوں کا کام بڑھ جاتا ہے۔ بالخصوص جب سیاستدان جمہوری طریقے سے کام نہیں کریں گے۔ بدقسمتی سے آئی ایس آئی کا سیاسی ونگ بھٹو صاحب کے دور میں قائم ہوا۔ چونکہ ان کا انحصار بھی سرکاری افسروں، فیوڈل لارڈز اور ایجنسیوں پر بڑھ گیا تھا۔ اور اگر کھلی آزادی ہو، جمہوریت چل رہی ہو۔ سیاستدان یہ سمجھیں کہ ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ اسے زندگی موت کا مسئلہ نہ بنائیں تو ایجنسیوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور ان کا کردار محدود ہو جاتا ہے۔

اس وقت بھی ہمارے ہاں جو مسائل چل رہے ہیں۔ مسنگ پرسنز ہیں یا دوسرے کئی معاملات، مشرف صاحب کے دور سے جڑے ہوئے ہیں اور اگر ہم روانی سے چل رہے ہوتے تو کسی کو بھی اس قسم کی کاروائیوں کی ضرورت نہ رہتی۔ مناسب ہوگا کہ اب بھی ہمارے سیاستدان ان ایجنسیوں کو قابو کریں اور ان کا اثر و رسوخ کم کرتے جائیں۔ اگر وہ تہیہ کر لیں تو ان ایجنسیوں کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے گا۔ اخبار نویس بیچارے نے کیا کرنا ہے۔ اخبار نویسوں کے رابطے ہوتے ہیں تاکہ کوئی خبر لے لیں۔ اب یہاں بھی آپ کچھ دیتے ہیں اور کچھ لیتے ہیں۔ ایجنسیاں اطلاع کا ذریعہ بھی تو ہیں۔ کسی اطلاع کو کیسے استعمال کرنا ہے۔ اس کی جانچ پڑتال کیسے کرنی ہے یا یہ کہ آپ نے ایجنسی کا آلہ کار بن جانا ہے یہ سب آپ کی ذہانت پر منحصر ہے۔ بحیثیت مجموعی آپ ہمارے پیشے پر اطمینان کا اظہار کر سکتے ہیں۔

☆ کبھی کسی ایجنسی کے بندے نے آپ سے رابطہ کیا۔ خبر لگوانے یا رکوانے کیلئے؟

○ ایجنسیوں سے رابطے تو رہتے ہی ہیں۔ وہاں کئی دوست بھی ہوتے ہیں۔ ان سے تبادلہ خیال بھی ہوتا ہے۔ ملنے بھی آتے ہیں، کئی دعوت بھی دیتے ہیں۔ لیکن مجھ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے کبھی کسی نے ایسے رابطہ نہیں کیا کہ آپ ہمارا یہ کام کر دیجئے تو ہم آپ کو یہ دیں گے۔ البتہ تبادلہ خیال ہوتا رہتا ہے اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے۔

☆ ملک ریاض کے انٹرویو کی ویڈیو لیک ہونے سے کیا لوگوں کا الیکٹرانک میڈیا پر اعتبار کم ہوا ہے۔ اور کیا میڈیا کی ساکھ بھی متاثر ہوئی ہے؟

o ہاں۔۔۔ واقعاتی شہادت ایسی آ گئی اور حالات ایسے تھے کہ اس کا خاص تاثر بن گیا وگرنہ اس طرح کام ہمارے ہاں ہوتے رہتے ہیں۔ آف دی ریکارڈ باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ بے سروپا گفتگو بھی ہو جاتی ہے۔ مگر چونکہ وہ ایک ماحول ایسا تھا کہ جب یہ گفتگو آئی تو لوگوں نے اس بات پر توجہ نہیں دی کہ جو لیک ہوئی ہے یہ آف دی ریکارڈ گفتگو ہے۔ لہٰذا وہ معاملہ خراب ہو گیا۔ یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔ میں تو ویسے اس بات کا قائل ہوں کہ آف دی ریکارڈ گفتگو بھی آدمی کو سوچ سمجھ کے کرنی چاہئے۔

☆ الیکٹرانک میڈیا جس رخ پر جا رہا ہے آپ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

o اصل میں ہمارے ہاں کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں جسے نافذ کیا جا سکے۔ پریس کونسل بنی ہے لیکن ابھی پرنٹ میڈیا میں بھی کوئی کارروائی شروع نہیں ہوئی اور الیکٹرانک میڈیا میں تو لوگ اب Live بولتے ہیں لہٰذا اس میں Loose Talk بھی ہو جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگوں کو اس کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ ایک ڈسپلن ہونا چاہئے، جو بہر حال آہستہ آہستہ آ جائے گا۔ شہرت کو نقصان پہنچانے کے قانون (Law of defamation) کو بھی استعمال ہونا چاہئے۔ عدالتوں کو بھی اس سلسلے میں توجہ دینی چاہئے۔

☆ سب سے زیادہ یہ ذمہ داری مالکان پر نہیں ہے کہ وہ کوئی کوڈ آف کنڈکٹ بنائیں یا بنوائیں؟

o یہ پروفیشنلز، حکومت، سوسائٹی اور عدلیہ سب کی ذمہ داری ہے۔ مالکان آپ کے سامنے ہر وقت تو کھڑے نہیں ہوتے کہ بھئی آپ نے یہ بولنا ہے۔ سب لوگوں کو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مل جل کر ہی اسے ٹھیک کرنا پڑے گا۔

☆ آپ دنیا ٹی وی پر ''نقطہ نظر'' پروگرام کرتے ہیں۔ کبھی کسی پروڈیوسر نے ٹوکا ہے؟ اس طرح کریں یا اس طرح نہ کریں؟ آپ نہیں سمجھتے کہ پروڈیوسر اور ایڈیٹر کا کردار ختم ہو گیا ہے۔ کم از کم الیکٹرانک میڈیا میں؟

○ الیکٹرانک میڈیا میں تو ایڈیٹر نام کی کوئی چیز نہیں۔ جو بڑے بڑے اینکر ہیں وہ پروڈیوسر بھی اپنی مرضی کے رکھتے ہیں۔ یا وہ خود ہی ایگزیکٹو پروڈیوسر بنتے ہیں اور ملازمت کے وقت وہ یہ شرط رکھتے ہیں۔ آج تک میری عادت یہ رہی ہے میں کوئی چیز یا اداریہ لکھتا ہوں تو میں اپنے بیٹوں کو کہتا ہوں کہ اسے پڑھ لیجئے یا ہمارے ہاں قدرت اللہ صاحب ہیں۔ ان کو کہتا ہوں کہ پڑھ لیجئے۔ دوسرے آدمی کو پڑھائے بغیر میں اپنی تحریر آگے نہیں جانے دیتا۔ اگرچہ میرے اندر خود بھی ایک سنسر لگا ہوا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا بات کس طرح کہنی ہے یا نہیں کہنی۔ لیکن پھر بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ وہاں تو پروگرام لائیو چل رہا ہوتا ہے۔ آپ پروڈیوسر کی بات تو سنتے ہی نہیں۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے مجھے اُس وقت بھی پی ٹی وی پر لائیو پروگراموں میں بلاتے تھے جب لائیو پروگرام شاذ و نادر ہی ہوتے تھے کیونکہ میں ہمیشہ گفتگو بڑی احتیاط کے ساتھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے انتظامیہ یا پروڈیوسر نے آج تک نہیں کہا کہ جناب فُلاں بات اس طرح ہونی چاہئے۔

○

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایکسپریس کی بات

''لیکسن گروپ'' (Lakson Group) پاکستان کا بڑا کاروباری گروپ ہے۔ پاکستان میں اس کے زیر اہتمام 15 سے زائد کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ ان کمپنیز میں سے ''کولگیٹ پامولیو، سائبر نیٹ، ٹیٹلی، میکڈونلڈ اور ایکسپریس زیادہ مشہور ہیں۔

یہ گروپ پاکستان میں 410 ملین ڈالر سے زائد منافع کماتا ہے اور ایک بلین ڈالرز سے زائد مالیت کے اثاثہ جات کا مالک ہے۔ گروپ کے کرتا دھرتا چار لاکھانی برادران ہیں جن میں سے سلطان لاکھانی اور امین لاکھانی زیادہ مشہور ہیں۔

پرویز مشرف کے ابتدائی دور میں نیب کی طرف سے بنائے گئے مقدمات کی وجہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے اِنھی دونوں بھائیوں کو جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ بعدازاں 2012ء میں سلطان لاکھانی کو صدر پاکستان نے ہلالِ امتیاز سے بھی نوازا۔ (1)

گروپ ہذا نے 1998ء میں ایکسپریس اخبار کا آغاز ''سینچری پبلیکیشنز'' کے زیر اہتمام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ گروپ سے لاکھانی برادران کی کاروباری رقابت بھی اس اخبار کی پیدائش کا موجب بنی۔ مارچ، اپریل 2011ء میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت اور جنگ گروپ کے درمیان تنازعہ چل رہا تھا، پی ٹی وی اور جیو سپر بھی اس میں فریق تھے۔ دراصل حکومت جنگ اور جیو کو حکومت مخالف رویے کی وجہ سے ''کھینچ'' رہی تھی۔ سندھ حکومت کے اس وقت کے وزیر داخلہ ذوالفقار مرزا نے سندھ اسمبلی میں جنگ گروپ کے خلاف تحریکِ استحقاق بھی پاس کروائی اور جنگ گروپ کے کرتا دھرتا میر شکیل الرحمن کے خلاف نہایت نازیبا طرزِ تکلم اپنایا تو ایکسپریس گروپ نے ان تمام خبروں کو خوب اُچھالا۔ اپریل 2014ء میں حامد میر پر قاتلانہ حملے کے بعد جب جیو اور آئی ایس آئی کے درمیان تنازعہ کھڑا ہوا تو ایکسپریس گروپ جنگ اور جیو گروپ کو خوب لتاڑتا رہا۔ میڈیا انڈسٹری میں لاکھانی برادران کے آنے کی دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ یہ گروپ کثیر کمپنیوں کا مالک ہے لہٰذا اپنی مختلف پراڈکٹس کی تشہیری مد میں خرچ ہونے والے پیسے کو بچانے کی خاطر اُنھوں نے اپنا اخبار شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ تیسری سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میڈیا انڈسٹری میں سرمایہ کاری، بشمول معاشرتی وسیاسی اثر رسوخ ایک منافع بخش کاروبار بن چکا ہے۔

روزنامہ ایکسپریس کا پہلا شمارہ 3 ستمبر 1998ء کو کراچی سے شائع ہوا۔ بعدازاں اگست 2002ء میں یہ پاکستان کے دیگر شہروں سے یکے بعد دیگرے چھپنا شروع ہوگیا۔ یہ پاکستان کا پہلا روزنامہ ہے جو بیک وقت ملک کے 11 شہروں سے شائع ہو رہا ہے۔ اور گزشتہ کئی سالوں سے یہ سرکولیشن کے اعتبار سے ملک بھر میں پہلے نمبر پر ہے۔ ذرائع کے مطابق پاکستان کے تمام اخبارات کی سرکولیشن میں سے 24 فیصد شیئر روزنامہ ایکسپریس کا ہے۔ زیادہ سرکولیشن کی ایک ممکنہ وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ یہ اخبار ملک کے مختلف شہروں سے شائع ہوتا ہے لہٰذا مقامی اور علاقائی خبروں کا تناسب دیگر اخبارات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ فطری طور پر اکثر لوگ اپنے علاقے اور اپنی متعلقہ خبریں پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لاہور میں ایکسپریس کے پہلے ایڈیٹر جواد نظیر تھے۔ قبل ازیں وہ جنگ گروپ کے روزنامہ آواز کے بانی ایڈیٹر تھے۔ ستمبر 2003ء تک وہ ایکسپریس سے وابستہ رہے بعدازاں ایاز خاں ایڈیٹر بن گئے۔ نامور صحافی عباس اطہر نے 2006ء میں ایکسپریس کو بطور گروپ ایڈیٹر جائن کیا۔

نامور صحافی اور انگریزی اخبار روزنامہ پاکستان ٹوڈے کے ایڈیٹر عارف نظامی کہتے ہیں: ''روزنامہ ایکسپریس کی پرنٹنگ خوبصورت، اچھے کالم نگار اور بڑے بڑے نام ہیں مگر آج تک پتہ نہیں چلا کہ ان کی کوئی پالیسی بھی ہے یا نہیں؟ ان کے پاس یا تو کوئی نظریاتی سمت ہے ہی نہیں یا واضح نہیں''۔((2

دراصل لاکھانی برادران اخبار کو خالص کاروباری انداز میں چلا رہے ہیں اور شاید یہی اس روزنامے کی پالیسی ہے۔ پہلے پہل اخبار میں نامور کالم نگاروں حمید اختر اور منو بھائی نے لکھنا شروع کیا۔ حسن نثار بھی تقریباً ایکسپریس میں سوار ہونے والے تھے مگر بعدازاں انھوں نے ایڈوانس میں لیا ہوا چیک واپس کر دیا اور ''جنگ'' ہی میں کالم لکھتے رہے۔ تین چار ماہ بعد منو بھائی بھی واپس جنگ میں آ گئے۔ جبکہ کئی سال بعد عبدالقادر حسن اور جاوید چودھری ایکسپریس میں آ گئے۔

ابتدا میں ادارتی صفحے کا رنگ زیادہ نہ جم سکا مگر آہستہ آہستہ ریڈرشپ بنتی گئی سینئر صحافی حمید اختر آخر عمر میں جب تک صحت اجازت دیتی رہی ایکسپریس ہی میں لکھتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد بعض قارئین نے ان کی بہت کمی محسوس کی۔ اردشیر کاؤس جی کا ترجمہ شدہ ہفتہ وار کالم بھی خوب رنگ جماتا تھا۔ سینئر بھارتی صحافی کلدیپ نیر کا کالم بھی ادارتی صفحے کی زینت ہوتا ہے۔ صاحب طرز کالم نگار عباس اطہر کے کالم کو بھی قارئین مس کرتے ہیں۔ عامر خاکوانی اور طاہر سرور میر کو بطور کالم نگار پہچان ہی ایکسپریس سے ملی مگر بعدازاں اور یا مقبول جان سمیت ایکسپریس کو خیرباد کہہ کر ''دنیا'' میں آ گئے۔ لہٰذا اس تناظر میں اخبار میں کالم نویسی کا حصہ کافی متاثر ہوا ہے۔

آج کل اخبار سے وابستہ کالم نگاروں میں ؛اور یا مقبول جان، ایاز خاں، نصرت جاوید، اسلم خاں، زاہدہ حنا، مقتدا منصور، سعد اللہ جان برق، عبدالقادر حسن، جاوید چودھری اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انتظار حسین شامل ہیں۔ ایاز خاں ہلکے پھلکے انداز میں اچھا کالم لکھتے ہیں۔ انوار احسن صدیقی زبیر رحمن، ظہیر اختر بیدری اور لطیف چودھری کے کالموں سے لیفٹ سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ جبکہ آفتاب خانزادہ کی تحریر فلسفیانہ رنگ لیے ہوتی ہے۔

بعض صحافتی حلقوں میں 'ایکسپریس' کو Stale روزنامہ قرار دیا جاتا ہے جس کی ممکنہ وجہ یہ ہے کہ اس میں تحقیقاتی رپورٹنگ اور خبریت کی کمی ہوتی ہے۔ یعنی جو کچھ ہو رہا ہے اس کی رپورٹنگ تو ہوتی ہے مگر اخبار خود کھوج لگانے کی کوشش نہیں کرتا۔

ایکسپریس سنڈے میگزین کے 15 تا 19 صفحات اشتہارات پر مبنی ہوتے ہیں۔ گو کہ قد بڑھانے اور گنجا پن دور کرنے کے اشتہارات مستقل حصہ ہوتے ہیں۔ البتہ جناتی اور جادوگر عاملوں کے اشتہارات سے اجتناب برتا جاتا ہے۔ انٹرنیشنل حالات پر تجزیے کرتے ہوئے عمومی طور پر غیر ملکی میڈیا پر منظر عام پر آنے والی اطلاعات یا مضامین کے تراجم پر انحصار کیا جاتا ہے۔ کتابوں پر تبصرے، خوابوں کی تعبیر کے سلسلے مستقل جبکہ کبھی کبھی کوئی کلاسک ادب کا شہہ پارہ یا کسی شخصیت کا انٹرویو بھی شائع کر دیا جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ سنڈے میگزین نسبتاً معیاری ہوتا ہے۔

بزنس، سپورٹس، مقامی، قومی اور بین الاقوامی خبروں پر صفحات اور خصوصی کلر ایڈیشن بھی مستقلاً 'ایکسپریس' کا حصہ ہیں۔

اخبار کی ویب سائٹ بھی بہت معیاری ہے۔ ویب سائٹ پر اگست 2006ء تک کے شمارے دستیاب ہیں۔ غرضیکہ عام قاری کے لیے ایکسپریس اخبار میں بہت کچھ ہے۔ لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے محسوس ہوتا ہے کہ معیار کے اعتبار سے اخبار ایک جگہ آ کر رک سا گیا ہے۔

ایکسپریس میڈیا گروپ کے زیر اہتمام، انگریزی اخبار، ڈیلی ایکسپریس ٹریبون، سندھی روزنامہ سندھ ایکسپریس، ٹی وی چینل، ایکسپریس نیوز، ایکسپریس انٹرٹینمنٹ اور ٹائمز ٹی وی بھی کام کر رہے ہیں۔ اسی گروپ کا انگریزی ٹی وی چینل ناکامی کے بعد بند کر دیا گیا۔

عباس اطہر طویل عرصہ روزنامہ ایکسپریس کے گروپ ایڈیٹر رہے، وہ ایسے صحافیوں میں شامل تھے جو اپنی ہمہ جہت شخصیت، قابلیت اور پیشہ ورانہ مہارت کی بنا پر اس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عہدے پر پہنچے۔ اُنھوں نے نمایاں شاعر، منفرد کالم نگار اور ذہین نیوز ایڈیٹر کے طور پر اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر سیدھی بات کرنے کے حوالے سے معروف رہے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے اپنی ذات کے حوالے سے بھی یہی طرزِ عمل اپناتے ہوئے کہا:

''میں نے شاعری کی، لوگ مجھے شاعر سمجھتے ہیں لیکن میں اپنے عہد کا بڑا شاعر تو نہیں تھا۔ میرے عہد کے بڑے شاعر منیر نیازی تھے۔ ان سے کچھ عرصہ پہلے فیض احمد فیض اور مجید امجد تھے۔ میں نے محنت کر کے خبر نگار کے طور پر اپنا امیج بنالیا۔ شوقیہ کالم لکھتا ہوں کہ مجھے تصویر چھپوانے کا شوق ہے۔ لہٰذا کالم نویس بن کر شہسواروں میں شامل ہو گیا۔ شاعری میں ہزار میں سے ایک تھا تو صحافت میں دس ہزار میں سے ایک ہوں''۔ (3)

عباس اطہر روزنامہ ''مساوات''، ''آزاد'' اور ''پاکستان'' کے ایڈیٹر رہے اور نوائے وقت کے چیف نیوز ایڈیٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ ایکسپریس نیوز کے پروگرام ''کالم کار'' میں بطور میزبان بھی فرائض ادا کرتے رہے۔ ان کے تین شعری مجموعے ''دن چڑھے دریا چڑھے''، ''کہا سنا'' اور ''ذکر'' چھپ چکے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''دن چڑھے دریا چڑھے'' 1964 میں شائع ہوئی۔ ''ذکر'' بھٹو کے حوالے سے ان کی جیل میں کہی گئی نظموں پر مشتمل ہے۔ ضیاالحق کے زمانے میں جب وہ جیل کاٹ رہے تھے تو ان کا شعری مجموعہ ''کہا سنا'' فحاشی کے الزام میں ضبط ہو گیا۔ (4) اُنھیں 23 مارچ 2011ء کو حکومت پاکستان کی طرف سے صحافتی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ہلالِ امتیاز عطا کیا گیا۔

زیرِ نظر انٹرویو 9 مارچ 2011ء کی شام عباس اطہر صاحب کے دفتر میں ریکارڈ کیا گیا۔ انٹرویو کے دوران شاہ جی نے دو بار چائے سے تواضع کی اور کھل کر گفتگو کی۔ زیادہ بات چیت پنجابی میں ہی ہوتی رہی۔

(یہ عہد ساز صحافی طویل علالت کے بعد 6 مئی 2013ء کو دُنیا سے رُخصت ہو گئے)

عباس اطہر

سوال: شاہ صاحب 15 مارچ 1971ء کو روزنامہ آزاد میں آپ نے بھٹو کے حوالے سے مشہور عالم سرخی ''اِدھر تم اُدھر ہم'' لگائی۔ لہٰذا جب بھی پاکستان توڑنے کا بھٹو پر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

الزام لگتا ہے تو اس لیڈ کا حوالہ ضرور دیا جاتا ہے۔ گو کہ بعد میں کئی بار آپ نے خود اور 'آزاد' نے بھی تردید شائع کی کہ بھٹو نے ایسا نہیں کہا تھا۔ لیکن کیا ایک صحافی کے طور پر آپ دیکھتے ہیں کہ یہ ایک غیر ذمہ دارانہ طرز عمل تھا یا اس لیڈ کو ایکسپلائٹ کیا گیا؟

عباس اطہر: پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی تردید 'آزاد' نے نہیں چھاپی تھی۔ سرخی کے حوالے سے ایسا ہے کہ یہ سرخی اس سارے تناظر میں بھٹو صاحب کے الفاظ سے اخذ کی گئی تھی۔ یوں سمجھیں مجھے نظر آ رہا تھا کہ یہ دو حصے ایک ساتھ نہیں رہیں گے۔ اس وقت جو مینڈیٹ ملا اس کے مطابق ایک طرف مجیب کو اور دوسری طرف اکثریت بھٹو صاحب کو ملی۔ میں جس طرح دیکھتا ہوں اس میں بھٹو صاحب کو جینوئن سمجھتا ہوں۔ اگر آپ شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات کو پڑھیں اور یہ سوچیں شیخ مجیب کی مرضی کے مطابق چھ نکات کی روشنی میں آئین بن جاتا تو پاکستان کے پانچ حصے ہو جاتے۔ یہ فوج نے کسی صورت قبول ہی کرنا نہیں تھا۔ اس زمانے کے اخبار نکال کر دیکھیں۔ بھٹو صاحب، مجیب کو شروع سے یہ سمجھاتے تھے کہ پاکستان میں تین پارٹیاں ہیں۔ عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور فوج لہٰذا جو کچھ بھی ہو تینوں کے اتفاق سے ہونا چاہئے۔

لیکن شیخ مجیب کو اپنی انتخابی طاقت کا پتہ تھا وہ مشرقی پاکستان میں ایسی فضا پیدا کر چکے تھے کہ انھیں پتہ تھا کہ وہ وہاں سویپ کر جائیں گے۔ یہ بات کہ وہ الگ ہونا چاہتے تھے یہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ مجید نظامی صاحب نے بتایا کہ بہت دیر پہلے وہ حسین شہید سہروردی سے ملنے گئے۔ وہ ان بنگالیوں میں سے تھے جو پاکستان کے حق میں تھے۔ شیخ مجیب ان کے پاؤں دبا رہا تھا اور وہ نظامی صاحب سے باتیں کر رہے تھے تو اچانک شیخ مجیب بولا ہمیں ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے الگ ہو جانا چاہئے تو سہروردی نے وہیں پاؤں مار کر مجیب کو نیچے زمین پر گرا دیا۔ یہ مجید نظامی صاحب کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے جو انھوں نے مجھے خود سنایا۔

بھٹو صاحب کہتے تھے جو بھی آئین بنانا ہے یا چھ نکات ہیں میں اس پر راضی نہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوں اور میں اس میں فریق نہیں بنوں گا۔ لیکن اگر تم نے اسے ٹھونسنا ہے تو ٹھونس دو مگر میں اس حوالے سے پارٹی نہیں بننا چاہتا۔ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ مجیب چھ نکات کو بدل دے مگر وہ اسے بدلنے کو تیار نہیں تھا۔ اب جن باتوں کے لوگ حوالے دیتے ہیں کہ بھٹو نے کہا تھا ''میں ٹانگیں توڑ دوں گا جو وہاں جائے گا'' یہ اس نے لاہور کے جلسے میں کہا تھا۔ اس لیے کہ بھٹو صاحب یہ کہتے تھے کہ حضور جب ہم لوگ وہاں ڈھاکے جا کے بیٹھ جائیں گے اور باہر دس لاکھ بندہ جمع ہوگا۔ کون سا ممبر ہے جو جرأت کرے گا اسمبلی میں پیش ہونے والی کسی بات کی مخالفت کرے۔ اس میں کرنسی کی علیحدگی، صوبوں کی اپنی اپنی نیم فوجی آرگنائزیشن بنانا وغیرہ جیسے معاملات شامل تھے۔ تفصیلات کا سب کو پتہ ہے۔

لہٰذا یہ تنازعہ اس وقت چل رہا تھا۔ 'ادھر تم ادھر ہم والی بات' بھٹو صاحب نے نشتر پارک کراچی والی تقریر کی تھی۔ جس کے جملے کچھ اس طرح کے تھے۔ کہ ''وہاں تم جیتے ہو اور یہاں ہم جیتے ہیں۔ وہاں تمہاری طاقت ہے یہاں ہماری طاقت ہے''۔

تو ایک فارمولہ ٹائپ جیسے فلر (Filler) چھوڑتے ہیں، کہ جناب ٹھیک ہے دونوں الگ الگ حکومتیں بن جاتی ہیں لیکن ایک یونٹ کے طور پر پاکستان ایک ہی رہے۔ جس طرح ایسٹ پاکستان اور ویسٹ پاکستان تھا۔ تو اس طرح کے مفہوم پر مبنی ان کا جملہ تھا جس کی میں نے سرخی لگائی تھی: ''ادھر تم، ادھر ہم''۔

اس کا یہ مطلب تھا ہی نہیں کہ ادھر تم علیحدہ ملک بنالو اور ادھر میں علیحدہ ملک بنالوں یہ تو بنا ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ ادھر تو فوج بیٹھی تھی۔ بھٹو صاحب کی اوقات کیا تھی ادھر ہم کی۔ آپ دیکھ لیں کہ بعد میں فوج آئی تو اس نے بھٹو کو پھانسی لگادی۔ جس سرخی کی ہم بات کر رہے ہیں اس کی تردید اگلے دن بھٹو صاحب نے پریس کانفرنس میں بھی کر دی تھی اور انھوں نے کہا تھا: ''نہ تم نہ میں، ہم دونوں اور ایک پاکستان''۔ مطلب یہ تھا کہ فریق مفاہمت سے کوئی حل نکالیں۔ اب ہوا یہ کہ جب پاکستان ٹوٹ گیا اور اس کے توڑنے میں دائیں بازو کی قوتیں شامل تھیں، جنھوں نے البدر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور الشمس بنائی تھیں، اور جن کے نتیجے میں مکتی باہنی آئی اور انڈیا نے حملہ کیا۔ پہلے ان لوگوں نے پھر اُنھوں نے قتل عام کیا۔ پھر یحییٰ خان آخری دفعہ بھٹو صاحب کو ڈھاکہ لے کر گیا۔ جہاں بھٹو سے کہا کہ مجیب سے بات کرلو۔ مجھے یاد ہے کہ مجیب کے گھر میں ان کی ملاقات ہوئی۔ کمرے سے نکل کر وہ لان میں چلے گئے۔ مجھے ایک انگریزی اخبار کی سرخی یاد ہے کہ وہ "Under a mango tree" باتیں کرتے رہے۔ بھٹو نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر مجیب اڑا رہا کہ میں یہی آئین بناؤں گا جو میں کہتا ہوں۔ اس سارے معاملے میں چھوٹے صوبوں سرحد اور بلوچستان کی پارٹیاں اس کے ساتھ تھیں۔ یعنی ادھر اس نے مسودہ پیش کرنا تھا ادھر اس نے پاس ہوجانا تھا۔ یحییٰ نے بھٹو صاحب کو بتایا ہی نہیں تھا کہ اس کا اپنا لائحہ عمل کیا تھا۔

اب بات چیت ختم ہوگئی۔ بھٹو نے کہہ دیا کہ وہ نہیں مانتا۔ تو اسی رات کو یحییٰ واپس آ گیا اور بھٹو کو انٹر کانٹی نینٹل کے کمرے میں اوپر والی منزل پر چھوڑ آیا۔ جس کی کھڑکیاں دھان منڈی کی طرف کھلتی تھیں۔ ساری رات بھٹو صاحب نے وہ آپریشن دیکھا جس میں ٹینکوں نے بستیوں پر حملہ کیا، توپ خانے سے گولہ باری کی گئی اور مجیب کو گرفتار کرلیا گیا۔ یہ سارا کچھ بھٹو کو دکھا کے اگلے دن کراچی لایا گیا۔ فوج نے اصل میں بھٹو صاحب کو دکھایا کہ ہم یہ کرسکتے ہیں۔ اس وقت یہاں فیصل آباد میں ایک تحریک چل رہی تھی جسے شیخ رشید صاحب کمانڈ کر رہے تھے۔ مختار رانا اور فیصل آباد کے دوسرے لوگ جلسے، جلوس نکال رہے تھے۔ ان کا نعرہ تھا ''زمین کسان کی، کارخانہ مزدور کا''۔

مختار رانا صاحب کا سلوگن تھا ''مختار رانا قبضہ کرانا''۔ جس سے مراد تھی کہ قبضے کرلو اور انقلاب لے آؤ۔

بھٹو صاحب جب کراچی ایئرپورٹ پر اترے تو 'مساوات' کے رپورٹر کے مطابق بھٹو صاحب کی ٹانگوں میں لرزش تھی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہاں کیا صورتحال ہے تو اُنھوں نے کہا کہ ''خدا پاکستان کو بچائے''۔ اس بات کو اے پی پی نے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اخباروں کو یوں جاری کیا: ''خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا''۔ صرف مساوات میں یہ چھپا تھا کہ ''خدا پاکستان کو بچائے'' لہٰذا گھر جاتے ہی بھٹو صاحب نے سب سے پہلے شیخ محمد رشید کو کہا کہ ''میں دیکھ آیا ہوں کہ یہ لوگ (فوج) کیا ہیں۔ تم کسی ایسے خیال میں نہ آؤ کہ عوامی طاقت ہے، لوگ ہمارے پیچھے ہیں اور ہم جیت گئے ہیں، مختار رانا وغیرہ کو کہو کہ چپ چاپ اپنے گھر چلے جائیں۔ وہ (فوجی) کسی کو نہیں چھوڑیں گے''۔

خود بھٹو صاحب کی مجیب سے جو گفتگو ہوتی رہی کسی ایک آدھ انٹرویو میں اُنھوں نے کہا بھی ہے۔ ان کا (فوج) پلان دونوں کو مارنے کا تھا۔ پہلے بھٹو کو پھر مجیب کو۔ مگر بھٹو صاحب اپنی ہوشیاری یا عقل مندی سے بچ گئے۔ اُنھوں نے فوج کے ساتھ اس طرح ٹکر نہیں لی جو مجیب لینا چاہتا تھا۔ جب ملک ٹوٹ گیا اس وقت بھٹو صاحب اقوامِ متحدہ میں موجود تھے۔ آپ ان کی وہ تقریر سن لیں جس کے وہ نوٹس پھاڑ کر وہاں سے اُٹھے۔ جب اُنھوں نے دنیا سے کہا کہ دیکھو۔ ''تم دنیا میں یہ پہلی مرتبہ کرنے لگے ہو۔ پہلے دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوا، تم قبضے کو جائز قرار دینے لگے ہو۔ تم جارحیت کی حمایت کرنے لگے ہو۔ ہمارا ملک توڑنے لگے ہو۔ تم چار دن سے لٹکا رہے ہو، کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہے، تم ادھر قبضے کا انتظار کر رہے ہو کہ جب وہاں قبضہ ہو جائے تو اس وقت تم فیصلہ کرو گے تو میں اس میں پارٹی نہیں بننا چاہتا، میں اپنے ملک واپس جا رہا ہوں۔ وہاں جا کے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل کے لڑوں گا''۔ وہ اٹھے کاغذ پھاڑے اور نکل آئے۔

اس کے بعد وہ نکسن سے ملے۔ اس وقت تک قبضہ ہو چکا تھا۔ ایسٹ پاکستان میں سرنڈر کیا جا چکا تھا۔ اور اندرا گاندھی نے اپنی آرمی سے کہا تھا کہ پاکستان کا قصہ اسی دفعہ ختم کرنا ہے۔ اس وقت ہماری ایئر فورس فضاؤں میں نہیں تھی۔ ادھر لاہور میں انڈین طیارے ایسے پھرتے تھے جیسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ کبھی ادھر بم مار دیتے کبھی ادھر۔ فوج ہماری پیچھے ہٹ رہی تھی۔ انڈین آرمی دو تین حصوں میں کر کے ہماری فوج کو ختم کرنے کا پلان رکھتی تھی۔ نکسن سے بھٹو نے کہا کہ جناب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اگر ہمارے ملک کے کسی حصہ کا وجود ختم ہوا تو تم لوگوں کو نقصان ہوگا لہٰذا کسی طریقے سے اس کو بچاؤ۔ نکسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''میں نے دو دفعہ بڑے سخت (Drastic) فیصلے کیے ان میں سے ایک تھا کہ جنگ کے وقت میں نے اپنے وزیر دفاع یا خارجہ کے ذریعے ''اندرا گاندھی کو بہت خوفناک وارننگ دی'' ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے کہا کہ یہ جنگ بند کردو ورنہ میں تم پر ایٹم بم مار دوں گا۔ پھر ساتواں بحری بیڑہ اس نے روانہ کیا۔

یہ لوگ بھٹو پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے ملک توڑ دیا اور وہ محب وطن نہیں تھا۔ اصل میں یہ تھا کہ جب ملک ٹوٹ گیا اور اس شخص نے بچا کھچا پاکستان سنبھال لیا تو دائیں بازو کی قوتوں نے یہ سارا تنازعہ پیدا کیا۔ فوج کا نام تو وہ لے نہیں سکتے تھے جس نے وہاں ان کی عورتیں اٹھائیں، ریپ (Rape) کیے، قتل عام کیا اور ان کے بچے مارے۔ ساری دنیا کا پریس یہ چھاپ رہا تھا۔ ان لوگوں میں اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ یہ کہہ سکتے کہ فوج نے ملک توڑا ہے۔ اُنھوں نے کہا جی کہ ایک سرخی نے ملک توڑا ہے۔ بھٹو نے ملک توڑا ہے۔

بھئی بھٹو صاحب نے کیوں اور کیسے ملک توڑ دیا؟ ایک اخبار کی سرخی کے ذریعے؟ اس زمانے میں میرا خیال ہے ہماری سرکولیشن پچاس ساٹھ ہزار ہوگی، ساٹھ ہزار سرکولیشن والے اخبار نے ملک توڑ دیا؟ جو ایسٹ پاکستان میں جاتا ہی نہیں تھا۔

☆ یہ 'آزاد' اخبار کس کا تھا؟

O ہم نے 1970ء میں ویج بورڈ پر ہڑتال کی تھی۔ جس کی قیادت پی پی ایل (Progressive Paper Limitd) کر رہا تھا۔ میں یونین کا سیکرٹری جنرل اور اے ٹی چودھری صدر تھے۔ پی ایف یو جے (PFUJ) کی ساری لیڈرشپ بھی پی پی ایل میں شامل تھی۔ جن میں منہاج برنا، آئی اے رحمان، عبداللہ ملک اور حمید اختر صاحب جیسے لوگ بھی تھے۔ ہم لوگوں نے ہڑتال کروائی تو ہمارے مطالبات تو اُنھوں نے مان لیے لیکن نوائے وقت ویج بورڈ نہیں دے رہا تھا۔ پہلے مشرق بھی نہیں دے رہا تھا۔ پھر مشرق والے مان گئے تو ہم نے وہ Soliderity قائم رکھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بہر حال ہماری ہڑتال بعد میں مینجمنٹ نے تڑوادی۔ نوائے وقت تو بالکل مانا ہی نہیں۔ نوائے وقت اور جنگ نے اپنے وہ سارے آدمی نکال دیئے جو ہڑتال پر تھے۔ 'امروز' اور 'پاکستان ٹائمز' سے بھی پندرہ آدمی نکال دیئے گئے جن میں اے ٹی چودھری صاحب، حمید اختر، عبداللہ ملک، آئی اے رحمان، منہاج برنا صاحب، محمود بٹ کارٹونسٹ اور میں بھی تھا۔ لہٰذا ہم نے سوچا ایک اخبار ہی نکال لیا جائے۔ شیخ حسام الدین ایک پرانے احراری تھے ان کے پاس آزاد کا ڈیکلریشن تھا چنانچہ ہم نے اُن سے ڈیکلریشن لیا اور اِدھر اُدھر سے پیسے۔ یوں ایک طرح سے یہ ہمارا اپنا ہی اخبار تھا۔

آپ نے 'اِدھر تم اِدھر ہم' کی بات کی تو ان ہی دنوں بھٹو صاحب لاہور آئے تو ان کی ایک تقریر سے میں نے ایک ہیڈ لائن نکالی تھی۔ ''ہم بنگلہ دیش کی غلامی قبول نہیں کریں گے''۔ اُنھوں نے یہ کہا تھا کہ اگر ایسٹ پاکستان کا ویسٹ پاکستان نے استحصال کیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جو چاہیں ہم قبول کرلیں۔ اصل میں بھٹو کا خیال تھا کہ برابری کی سطح پر چلیں۔ ٹھیک ہے آپ جیسے بھی ہیں لیکن اس طرح نہ کریں کہ ہمیں بالکل ہی نیچے گرادیں۔

☆ کیا بنگلہ دیش کی بنیاد اسی وقت نہیں پڑ گئی تھی جب ڈھاکہ یونیورسٹی میں تین طالب علموں کو فورسز نے زبان کے مسئلے پر مارا تھا۔ پھر قائداعظم پہلے وہاں جا کر کہہ چکے تھے کہ ''ہماری قومی یا سرکاری زبان اردو ہوگی''۔ کیا یہ معیشت اور زبان کا حق ہی نہیں تھا جو بنگالی مانگ رہے تھے، اور آج بھی وہی حق صوبے مانگ رہے ہیں؟ اُس صورتحال کا موازنہ آپ آج کے حالات سے کس طرح کریں گے؟

○ بنگالی اکثریت میں تھے اور ان کی اپنی زبان تھی۔ قائداعظم نے یہ کہا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔ جس پر بنگالی سڑکوں پر نکلے اور ان پر گولی چلائی گئی۔ اور وہاں لوگ مر گئے اور یوں وہاں پہلا شہید مینار بن گیا۔ اسی شہید مینار کے گرد پاکستان ٹوٹا ہے۔ بیوروکریسی اور بااثر طبقوں (جیسا کہ کراچی میں اردو بولنے والوں کی غالب اکثریت تھی) نے قائداعظم کو ڈھاکہ بھیجا اور اُنھوں نے وہاں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جا کر یہ اعلان کر دیا جو بنگالیوں کو منظور نہیں تھا۔ پھر ہم وہاں کی ہر کلیدی آسامی پر اپنے لوگ تعینات کر لیتے تھے، یعنی پنجابی اور مہاجر۔ یہ بیوروکریسی، خیبر پختونخواہ، سندھ سب سے مختلف ہے۔ یہ "انگریز" وہاں حکمرانی کرنے جاتے تھے، جس سے مزاحمت بڑھتی رہی۔ اب ویسی صورتحال نہیں ہے۔ صوبوں کی اپنی زبان ہے، ہم ان پر زبان مسلط نہیں کر رہے۔ البتہ حقوق کا مسئلہ رہ گیا ہے۔ ہم ان کو وسائل میں مناسب حصہ نہیں دیتے تھے۔ گو کہ موجودہ حکومت نے آئین میں ترمیم کروا کے صوبائی خودمختاری اور وسائل میں سے مناسب حصہ دینے کے مثبت اقدامات اٹھائے ہیں۔ بلوچستان میں اب بھی مسئلہ ہے، لیکن سندھ میں صورتِ حال اور ہے، کیونکہ وہاں بھٹوازم کی وجہ سے Integration ہے۔ بلکہ پیپلز پارٹی ہی کہ وجہ سے وفاق تشکیل پاتا ہے۔ کیونکہ اس کی جڑیں پورے ملک میں ہیں یہ کسی ایک صوبے کی پارٹی نہیں ہے۔ اب بلوچستان میں بھی زبان کا مسئلہ نہیں، وہاں معدنیات ہیں۔ ایک دفعہ آصف علی زرداری صاحب سے بلوچستان کے حوالے سے بات ہو رہی تھی تو وہ کہنے لگے کہ ہمیں بلوچستان کو حقوق دینے پڑیں گے۔ ان کی باتیں ماننی پڑیں گی۔ اُنھوں نے کہا کہ لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ بلوچستان پاکستان کا مستقبل ہے۔

وہاں زیرِ زمین اتنی دولت ہے کہ اگر ہم وہ دریافت (Explore) کر لیں تو ہمیں کسی بیرونی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ یا جیسے ہمارا تھر کا کوئلہ ہے وہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے لیکن جو بیرونی طاقتیں ہیں جنھوں نے ہماری گوادر پورٹ بھی نہیں چلنے دی ان کے اپنے مفادات ہیں۔ مسقط، دبئی وغیرہ کو یہ بندرگاہ قبول نہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ یہاں اتنا کچھ نکل آئے، یا یہ لوگ اس میں اپنا میجر شیئر چاہتے ہیں۔ جن علاقوں میں معدنی دولت ہے وہاں اُنھوں نے کوئی نہ کوئی تنازعہ کھڑا کیا ہوا ہے۔ تحریکیں چل رہی ہیں، لڑائیاں کر رہے ہیں۔ ہم پنجابی اکثریت میں ہیں، فوج بھی ہماری ہے لہٰذا اس نکتے پر آ کر ذمہ داری بھی ہماری بنتی ہے۔ لہٰذا اگر سیاسی حکومتیں رہتی ہیں تو پاکستان کے یہ مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ گویا کہ بھٹو کو مروانے کا پلان فوج کا تھا۔ فوج پیپلز پارٹی کے اتنا خلاف کیوں رہی؟

○ مجیب کے جانے کے بعد پیپلز پارٹی واحد سیاسی جماعت تھی جس کو مان تھا کہ ہمارے پاس عوامی طاقت ہے اور ہم فیصلے کریں گے۔ اُنھوں نے فیصلے کیے بھی۔ مثلاً ہاری ہوئی فوج کو بھٹو صاحب نے کھڑا کر دیا۔ جنگی قیدی واپس لے آئے، مقبوضہ علاقے خالی کرا لیے اور مسلمانوں کا ایک بلاک بنا کر امریکیوں کے لیے مسائل پیدا کر دیئے۔ اسلامی کانفرنس منعقد کروائی۔ عربوں کو کہا کہ تیل کا ہتھیار استعمال کرو۔ اس دور کے لیڈروں کا ایک گروپ بنا تھا، اس میں شاہ فیصل، جمال عبدالناصر، ذوالفقار علی بھٹو، کرنل معمر قذافی اور صدر سوئیکارنو تھے۔ میرا خیال ہے کہ فوج پر ہمیشہ امریکہ کا اثر و رسوخ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب نے ان لوگوں کو قائل کیا کہ ہم ایٹم بم بنا لیں تو دنیا میں ہم ایک تیسرا بڑا بلاک بن سکتے ہیں۔

اس معاملے میں شاہ فیصل اور کرنل قذافی ان کے ساتھ تھے۔ قذافی نے تو جہازوں میں بھر کے ان گنت ڈالر بھجوائے، بھٹو صاحب نے سائنسدانوں کو بلایا ڈاکٹر قدیر اور دوسروں کے اکاؤنٹس میں پیسے جمع کروائے اور کہا کہ روپے کی چیز سو روپے میں بھی ملے تو خرید لو۔ بلیک مارکیٹ یا جہاں سے جو ملے خرید لو۔ جس وقت 4 جولائی 1977ء کو فوج نے بھٹو کا تختہ الٹا تو اس وقت یہ سارے کام یعنی سمگلنگ وغیرہ مکمل ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے ہی امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر انھیں (بھٹو کو) دھمکی دے چکا تھا کہ ''ہم تمہیں عبرت کی مثال بنا دیں گے''۔

بھٹو کے ایٹم بم کی ایک اقتصادی بیس (Base) بھی بن رہی تھی۔ اس نے لیبر باہر بھیجی، انڈسٹری لگائی، سٹیل مل لگائی اور بہت سے منصوبوں پر بھٹو صاحب بہت آگے جا رہے تھے۔ اقتصادی بیس (Base) ہو گی تو ایٹم بم ہو گا۔ جب بھٹو صاحب کے خلاف پی این اے کی تحریک چلی تو ڈالر سستا ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے بہت پیسہ لگایا جیلوں میں لوگوں کو پیسہ پہنچایا گیا۔ گھروں پر پیسے دیے گئے، اسلحہ دیا گیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ان کے پیچھے امریکی تھے۔ بھٹو کو کسنجر نے دھمکی دی تھی کہ تمہیں عبرت کی مثال بنادیں گے۔ اُنھوں نے ضیاء الحق کو استعمال کر کے تختہ اُلٹایا تو وہ پاکستان جو لبرل، پروگریسو (Progrssive) رستے پر جارہا تھا وہ سارا ہی الٹ ہوگیا۔ ضیاء الحق نے جا کے اسلام کے نام پر ملک کو افغان جہاد میں پھنسا دیا اور بھٹو کو مار دیا۔

بھٹو نے اس ملک کو نئی راہیں دیں۔ باہر سے پیسہ آنا شروع ہوا۔ بھٹو سے پہلے تو یہاں پاسپورٹ نہیں بنتا تھا۔ اگر کوئی بنواتا بھی تو اپنے اثر ورسوخ سے۔ ویسے پاسپورٹ بنوانے میں کئی سال لگ جاتے تھے۔ بھٹو نے کھول دیا کہ بنواؤ، جہاں دل چاہے جاؤ اور کماؤ۔

ضیاء الحق کے آنے سے پاکستان کا رستہ ہی بدل گیا۔ اس نے سمت ہی تبدیل کردی۔ یہ ہے بھٹو کے بعد کا پاکستان جس میں آج ہم بیٹھے ہیں۔

☆ بے نظیر کے مروانے کے پیچھے آپ کس کا ہاتھ یا سوچ دیکھتے ہیں؟

○ سوال یہ ہے کہ بھٹو کے ساتھ ان کا کیا تنازعہ تھا؟ وہ تو امریکیوں کی مرضی سے اقتدار میں آئے تھے۔ بھٹو صاحب کے کہنے پر اُنھوں نے ملک کا یہ حصہ بھی بچایا تھا اور امداد بھی دی تھی۔ لیکن جب بھٹو نے ایٹم بم کے معاملے پر اُن کی حکم عدولی کی تو اُسے ہٹا دیا گیا۔ بے نظیر صاحبہ نے انھی حالات سے مفاہمت کی سیاست سیکھی۔ وہ بہت احتیاط سے چلتی تھیں۔ پہلی دفعہ بھی 1986ء میں وہ ان سے پوچھ کر آئی تھیں۔ گارنٹی دی گئی تھی کہ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ گو کہ بعد میں ضیاء الحق کی پروردہ طاقتوں، اسٹیبلشمنٹ، دائیں بازو یا اسلام پسند قوتوں نے اُنھیں حکومت نہیں کرنے دی۔ اسلم بیگ، بریگیڈیئر امتیاز اور حمید گل وغیرہ خود کہتے ہیں کہ 1988ء کے الیکشن میں ہم نے مینڈیٹ چرا لیا تھا۔ انھوں نے سیٹیں چھین لی تھیں۔ کٹ ٹو سائز کر دیا تھا۔ جتنا سائز یہ دینا چاہتے تھے اتنا ہی دیا۔ پہلے بے نظیر کو نکال دیا پھر نواز شریف کو لائے، پھر نکال دیا۔ پھر نواز شریف کو لائے۔ جب نواز شریف نے آ کر بھٹو کی طرح وزیر اعظم بننے کی کوشش کی تو اُنھوں نے ان کو بھی نکال دیا۔ کیونکہ پس پردہ بیٹھ کر فوج خود حکومت کرتی ہے۔ خارجہ پالیسی ہماری فوج بناتی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے اور داخلی معاملات میں دخل دیتی ہے۔ انڈیا کے ساتھ تنازعہ کے حل کی طرف کسی کو بڑھنے نہیں دیتی۔

پچھلے دنوں ہیلری کلنٹن جب یہاں آئیں تو اوریا مقبول جان جو اُن دنوں والڈسٹی پراجیکٹ میں تھے، ان کے ساتھ پروٹوکول دے رہے تھے۔ ہیلری نے ساتھیوں کے ساتھ کسی جگہ تصویر بنوانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اسی موقع پر اوریا کی کسی بات کے جواب میں ہیلری نے کہا کہ مجھے اور میری ایک ایک موومنٹ کو سیٹلائٹ کور کر رہا ہے۔

بے نظیر اس دفعہ بھی امریکیوں کے ساتھ طے کر کے آئیں تھیں کہ مشرف کے ساتھ چلنا ہے اور ق لیگ سے مل کر حکومت بنانا ہے۔ اس طرح بے نظیر نے ایک راہ نکالی اور ان کو قائل کیا کہ کسی طرح مشرف کی وردی اُتروالو۔ کیونکہ وہ اس کام کے لیے تیار نہیں تھا۔ بینظیر کو بھی پتہ تھا کہ جب تک اس کی وردی ہے اس سے لڑائی نہیں لڑی جاسکتی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ عوام تو اس کے باپ کو بھی نہیں بچا سکے تھے۔ بے نظیر کے آتے ہی بلاسٹ ہوا۔ لیکن کراچی میں اپنا اتنا بڑا استقبال دیکھ کر کہہ لیں کہ وہ مکر گئی۔ پھر بینظیر کی وجہ سے ہی نواز شریف اور شہباز شریف بھی آ گئے۔ دھماکے کے بعد جب وہ دوبئی گئیں تو اُنھیں منع کیا گیا کہ واپس نہ آؤ۔ مشرف نے بھی کہا کہ یہ تمہاری جان کے دشمن ہیں۔ بے نظیر نے پروٹیکشن مانگی۔ انھوں نے گاڑی دے دی۔ یہ کر دیا وہ کر دیا۔ بینظیر نے آکے طے شدہ فارمولے سے ہٹ کر یہ مطالبہ کر دیا کہ اگر پہلے نمبر پر میری پارٹی اور اور دوسرے پر ن لیگ نہ آئی تو ہم رزلٹ نہیں مانیں گے۔

لوگ تو ایسے ہی بونگیاں مارتے ہیں۔ این آر او فلاں ڈھمکاں۔ بینظیر نے دو مطالبے کیے تھے کہ یا میرے کیسز ختم کر دیں۔ کیونکہ ان کے خلاف ایک تین سال کی سزا تھی۔ اچھا اگر وہ تین سال کی سزا میں آتیں تو مشرف نے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ الیکشن کے بعد آئے گی۔ ایک تو اس نے یہ وعدہ توڑا کہ الیکشن سے پہلے آ گئی اور اوپر سے اس کا استقبال توقعات سے کہیں بڑھ کر ہوا۔ اسی موقع پر بلاسٹ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوا لیکن وہ بچ گئیں۔ لیکن میرا خیال ہے وہ خاتون مرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ زرداری صاحب اور ان کے بچے انھیں سمجھاتے رہے کہ آپ گڑھی خدا بخش بیٹھ جائیں یا دوبئی سے ٹیلی فونک خطاب کرتی رہیں۔ مگر بینظیر صاحبہ کا خیال تھا کہ جب تک میں خود عوام کے ساتھ کھڑی نہیں ہوں گی عوام صحیح طرح متحرک (Motivate) نہیں ہونگے۔

اس سے پہلے خالد حسن مرحوم کی ایک خبر میں نے ڈیلی ٹائمز میں پڑھی تھی کہ جب بے نظیر واشنگٹن سے کراچی آنے کے لیے چلیں تو اُنھوں نے کہا تھا کہ جیسے حالات ہیں، شاید یہ میرا آخری دورہ ہو، ہوسکتا ہے مجھے مار دیا جائے۔ لہٰذا پنڈی آنے سے پہلے اپنے والد کی قبر پر قرآن خوانی کی، ساتھ ہی ساتھ اپنی قبر کے لیے بھی جگہ کی نشان دہی کی۔ جن حالات میں بے نظیر بھٹو صاحبہ کو شہید کیا گیا ہے، مشرف حکومت چاہتی تو انھیں بچایا بھی جاسکتا تھا۔ بعد میں سامنے آیا ہے کہ کچھ سیکورٹی بھیج دی گئی تھی۔ امریکن بھی چاہتے تو انھیں بچایا جاسکتا تھا، اسی سٹیلائٹ سے جو ہیلری کی حفاظت کر رہا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اصل پارٹی تو طالبان تھے، اُن کے بھی کچھ اِدھر اُدھر رابطے تھے اور مشرف صاحب کے اپنے تعلقات بھی تھے۔ یہاں ایک سوچ تو ہے ہمارے طالبان اور دوسروں کے طالبان یعنی دو قسم کے طالبان ہیں۔ اسی طرح ہم ان کی تقسیم کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے سازش سے اِسے قتل کروادیا یا پھر قتل ہونے دیا گیا کیونکہ کوئی بات سامنے تو آئی نہیں اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کیا ہوا۔

بے نظیر قتل منصوبہ کے پیچھے یہ سوچ بھی تھی کہ اگر یہ ملک ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ جائے اور ملک کی جو دو تین دن حالت ہوئی تھی وہ سب کے سامنے ہے، سندھ تو تقریباً علیحدہ ہو ہی گیا تھا۔ آصف علی زرداری کھڑا ہوا تو لوگوں کو بات ماننی پڑی۔ میرے خیال میں اس منصوبے کے پیچھے امریکی بھی تھے۔ جس کسی نے بھی Betray کیا ہے اس کو اُنھوں نے بخشا نہیں۔ اُنھوں نے ہی بھٹو، ضیاء الحق اور بینظیر کو مروایا۔

☆ شاہ صاحب ڈی جی پی آر کے باہر جو بابا غیب علی شاہ کی قبر ہے۔ سنا ہے آپ اس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے موجد ہیں یا وہ آپ کا ذہنی شاخسانہ ہے؟

○ دراصل لوگ حقائق کو بدلتے ہیں۔ کہانی یہ ہے کہ یہاں پر پریس کلب کے لیے جگہ لی گئی تھی۔ بھٹو صاحب نے اس کلب کیلئے کچھ خود اور کچھ صوبوں سے لیکر پیسے دیئے تھے۔ بہر حال کوئی چودہ پندرہ سولہ لاکھ روپیہ بنتا تھا۔ اس وقت پریس کلب کے الیکشن ہوئے جس میں میرا اور حسین نقی کا مقابلہ تھا، جو کہ میں جیت گیا۔ میرے جیتنے کے بعد بھٹو صاحب آئے مجھ سے پہلے اس بلڈنگ کیلئے ایک آرکیٹکٹ کمپنی ''الیری اینڈ مراد خان ایسوسی ایٹس'' کو یہ ٹھیکہ مل چکا تھا۔ اُسی نقشے کی بنیاد پر پیسے ملے تھے۔ ہمارا منصوبہ تھا کہ چار منزلہ بلڈنگ بنائیں۔ میرا اور ہماری ایگزیکٹو کمیٹی کا یہ خیال تھا کہ تین پورشن ہم کرائے پر دیں گے ایک ویلفیئر سنٹر بنائیں گے۔ نیچے کارپٹس کی دکانیں ہوں گی اور درمیان میں پریس کلب رکھیں گے۔ اوپر والے دو فلور بھی کرائے پر دیں گے، جس سے اس زمانے کے چار سے چھ لاکھ تک آمدنی کا اندازہ تھا۔ ہمارا ارادہ اس آمدنی سے ویلفیئر فنڈ بنانے کا تھا۔ ہم نے یہ سوچا تھا کہ جو بندہ نوکری سے نکال دیا جائے گا، ہم اس کی کفالت تب تک کریں گے جب تک وہ دوبارہ کسی نوکری پر بحال نہیں ہوگا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ پراجیکٹ الیدی اینڈ مراد نے شروع کیا تھا۔ اگر کوئی بندہ جا کر اسے کھول کر دیکھنا چاہے تو اس کا پہلا پورشن دیکھے جو اَب قبر بن گیا ہے۔ اس پر ٹھیکیدار نے بہت بھاری سریا لگایا ہوا تھا تاکہ زلزلے سے بھی کوئی نقصان نہ ہو اور اوپر والی منزلوں کے لیے بھی مضبوط بنیاد بن سکے۔ ابتدائی منصوبے کے بعد ہمیں مزید پیسے ملنے تھے۔ لیکن انھی دنوں میں بھٹو کا تختہ الٹ گیا۔ ٹھیکیدار اِس کے بل آرکیٹکٹ کو Submit کرتا تھا اور آرکیٹکٹ پریس کلب کی ایگزیکٹو باڈی کو بھیجتا تھا۔ باڈی بل پاس کرتی تھی تو ٹھیکیدار کا چیک پاس ہوتا تھا۔

مارشل لاء آنے کے بعد ضیاء الاسلام انصاری اور ان سب لوگوں نے جنرل ضیاء الحق کے ساتھ بھی تعلقات استوار کر لیے۔ اس وقت میں پریس کلب کا صدر تھا۔ پہلا مسئلہ یہ ہوا کہ میں گرفتار ہو کر جیل چلا گیا اور مساوات بند ہو گیا۔ میں نے ان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لوگوں سے کہا کہ ضیاء الحق سے پیسے لے کر پریس کلب مکمل کروا لیتے ہیں۔ جیل سے نکل کر میں ڈی جی پی آر سے بھی ملا۔ اُس نے کہا "ہم اجازت نہیں دے سکتے کیونکہ یہ کمرشل بلڈنگ ہے اور آپ نے ہمیں اس حوالے سے بتایا بھی نہیں تھا"۔ میں نے جواب دیا کہ ہم نے نقشہ Submit کروا کے بھٹو صاحب کی حکومت سے منظوری لی تھی اور یہ بتایا تھا کہ آمدنی کو ویلفیئر فنڈ کے لیے ذریعہ بنانا ہے۔ یہ ایک خواب تھا جو میں نے دیکھا۔ اس حوالے سے بعد ازاں ضیا انصاری صاحب نے بھی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی دوران میں دوسری دفعہ جیل چلا گیا چنانچہ بلڈنگ کا کام رک گیا، پیسے ختم ہو گئے۔ جیل میں میرے ساتھیوں نے مجھے کہا کہ اگر تم اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دو، تو پریس کلب کی تعمیر دوبارہ شروع ہو سکتی ہے۔ مساوات میں نے چھوڑا ہوا تھا اور کسی دوسرے اخبار میں بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ اُنھوں نے مجھے قلعے میں قید کیا ہوا ہے۔ میرے پاس اس وقت واحد پروٹیکشن صرف پریس کلب کی صدارت ہے۔ میں جیل سے نکل آؤں تو کوئی حل نکالتے ہیں۔ جب میں جیل سے نکلا تو ضیا انصاری مرحوم اس وقت ایگزیکٹو باڈی کے ممبر تھے۔ امریکن قونصل جنرل اُنھی دنوں مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے روٹین میں ویزہ اپلائی کیا، اُنھوں نے مجھے ویزہ دے دیا، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں، وہ اصل میں مجھے Help-out کرنا چاہتے تھے۔ امریکی سمجھتے تھے کہ ضیاء الحق کوڑے مار رہا ہے تو لوگوں کو بچنے کا کوئی رستہ تو دیں اور اُنھیں پناہ دیں۔ میں نے ضیا انصاری صاحب سے کہا کہ جس وقت میں جہاز پر چڑھ جاؤں، اس وقت سے میرا استعفیٰ ہوگا۔ آپ ایگزیکٹو ممبر ہیں، آئین کے مطابق ایگزیکٹو باڈی آپ کو صدر چن لے گی، اس طرح ہم دونوں کی جان چھوٹ جائے گی۔ میں نے کشور ناہید سے کہہ کر سٹیٹ بینک سے اجازت لی۔ ایک ایس پی چودھری مشتاق حسین میرا دوست تھا، ایک امیگریشن آفیسر اس کا واقف تھا۔ اس نے کہا کہ میں تمہیں اسلام آباد سے چڑھا سکتا ہوں۔ امیگریشن والے سے پوچھا تو اس نے کہا میں انگلینڈ والی فلائٹ پر نہیں چڑھا سکتا،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

البتہ دوبئی کی مزدوروں والی فلائٹ پر چڑھادوں گا۔

جانے سے پہلے میں نے بل، چیک، اکاؤنٹ کی تفصیل اور پورے حساب کتاب کی دو فائلیں بنائیں۔ ایک فائل ضیاالاسلام انصاری اور دوسری حسین نقی کو دی اور کہا نقی صاحب یہ ایک ایک پیسے کی تفصیل ہے، جتنے پیسے آئے، جتنے لگے ہیں، بل ہیں، چیک ہیں۔ آرکیٹکٹ کے حوالے سے کاغذات ہیں۔ میرے جانے پر یہاں سیکنڈل بننے ہیں۔ میں اسلام آباد جانے لگا تو میں نے ہارون الرشید کو فون کیا اور کہا کہ سعود ساحر کو ایئرپورٹ لے آنا تاکہ وہاں اِدھر اُدھر سے میں نکل سکوں اور دوسرا اگر مجھے یہ روکتے ہیں تو روک لیں، گرفتار کرنا ہے تو کرلیں لیکن وہاں میرے بیگ سے راکٹ لانچر برآمد نہیں ہونا چاہئے۔ یہ لوگ آئے، میں امیگریشن سے نکلا اور چلا گیا۔ میرے جانے کے بعد ضیا انصاری صاحب، لاہور پریس کلب کے صدر بن گئے۔

پہلے اُنھوں نے راجہ ظفرالحق کو بھی بلایا تھا۔ میں یہیں انڈر گراؤنڈ موجود تھا۔ مگر اُنھوں نے بتایا کہ میں ملک سے باہر چلا گیا ہوں۔ فنکشن وغیرہ کی صدارت بھی ان لوگوں نے خود ہی کی اور اس سے پیسے بھی لیے کوئی ڈیڑھ لاکھ یا پتا نہیں کتنا؟ جب میں جیل تھا تو ایک نوجوان شاہد محمود زمان کا مجھے خط آیا کہ وہ کہتے ہیں کہ پیسے کھالیے ہیں۔ میں نے اس کا تو جواب نہیں دیا کیونکہ مجھے یہ پورا یقین تھا کہ جو فائل میں حسین نقی کو دے گیا ہوں جب کوئی ایسی بات ہوگی وہ ضرور سامنے لائے گا۔ چلیں دوسروں کا تو کوئی مفاد ہوسکتا ہے کہ یہ بندہ چلا جائے۔ میں آٹھ سال کے بعد آیا تو وہاں ساری بربادی ہوچکی تھی۔ قبر کی کہانی یہ ہے کہ سامنے جو کارپٹس والے ہیں، اُنھوں نے پہلے راتوں رات یہاں ایک چھوٹی سی قبر بنائی۔ اس وقت میں جیل میں تھا۔ مجھے پتا چلا تو میں نے ضیا انصاری صاحب سے کہا کہ راتوں رات اس قبر کو تو اٹھوا کر پھینکیں، پتا نہیں وہاں گدھا دبا ہے یا کچھ بھی نہیں۔ یہ قبر بنوائی گئی تھی۔ پھر یہ قبر Develop ہوتی گئی، لوگوں نے اس پر پھول چڑھانے شروع کردیے۔ اس وقت یہ اس طرح مزار کی شکل نہیں بنی تھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بعد ازاں میں وفاقی سیکرٹری انفارمیشن جنرل مجیب الرحمان کے پاس گیا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے بات شروع رکھی تھی کہ پریس کلب اور اس کا پیسہ کدھر گیا؟ میں نے جنرل مجیب کو سارے حساب کتاب سے آگاہ کیا اور کہا کہ آپ اس کی مارشل لاء انکوائری کروائیں۔ پھر ایک فائل PID اور ایک DGPR کے پاس لے کر گیا۔ اس معاملے میں میرا عمل دخل صرف یہ تھا کہ میرا سیکرٹری یا خزانچی چیک کاٹتے رہے، جب کہ چیک پاس کرنے والی کمیٹی پہلے سے موجود تھی۔

یونین لیڈر اور وکیل آفتاب ربانی اِس وقت ضیاانصاری صاحب کا اتحادی تھا۔ مشرق اِس وقت سب سے بڑا اخبار تھا اور ضیاالاسلام انصاری اس کے چیف ایڈیٹر تھے، اور ان کے ضیاء الحق سے بھی تعلقات تھے۔ میں نے جیل سے نکلتے ہی آفتاب ربانی سے کہا یار تم تو اصلی مزار اڑا دیتے ہو اور یہ تو ہے ہی جعلی۔ یہ چھوٹی سی قبر کارپٹس والوں نے بنائی ہے کیونکہ ہم بھی تو کارپٹ سنٹر بنانے لگے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ بلڈنگ نہ بنے۔ گو کہ ربانی اینڈ کمپنی طاقتور لوگ تھے مگر اس کام میں اِن کی دلچسپی نہیں تھی۔

قبر والے مسئلے پر ہمارے آرکیٹکٹ نے کہا کہ ایک دوکان، قربان کردو، قبر کے اوپر چھت ڈال کر ہم اسے مزار کی شکل دے دیتے ہیں، ایسے ہماری بلڈنگ بچ جائے گی۔ جب یہ بلڈنگ شروع ہوئی تو اس کا تخمینہ چالیس پنتالیس لاکھ تھا اور بھٹو صاحب سے ہم نے جو پیسے لیے وہ 12 یا 14 لاکھ تھے، باقی وہ کہہ کر گئے تھے جتنے اور چاہئیں وہ بھی میں دونگا۔ پریس کلب کا نام ''ذوالفقار علی بھٹو نیشنل پریس سینٹر'' رکھا گیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے آنے پر میں نے کہا: 'نام بدل لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں'۔ بعد میں ایگزیکٹو باڈی نے اس کا نام تبدیل کر بھی دیا مگر ہوا کچھ بھی نہیں۔ میں واحد آدمی تھا جو اسے بنانا چاہتا تھا۔ مگر جب میں باہر چلا گیا، ضیاء انصاری صاحب صدر بن گئے اور الیکشن ہوتے رہے لیکن یہ پریس کلب کے کام کو لٹکاتے گئے۔ انفارمیشن یا ڈی جی پی آر والے تو پہلے ہی چاہتے تھے کہ یہ پریس کلب نہ بنے کیونکہ اُنھی کی جگہ لی ہوئی تھی۔ جب میں باہر سے واپس آیا تو نیچے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

والی تعمیر جس میں اُنھوں نے کچھ اضافہ بھی کیا تھا مگر پھر اس پر مٹی ڈال کر اُنھوں نے اسے بند کر دیا۔

مجھے سب سے زیادہ افسوس اپنے پرانے دوست حسین نقی پر ہے۔ جب مجھ پر الزامات لگ رہے تھے، تو اُسے وہ سارا حساب کتاب سامنے رکھ دینا چاہیے تھا جو میں اس کے حوالے کر کے گیا تھا۔ لیکن نقی وہ سب کچھ پی گیا۔ گو کہ وہ مجھ سے الیکشن ہارا تھا مگر دوست تو تھا۔ میں اس کی جگہ پر ہوتا تو سب کچھ سامنے لے آتا اور کہتا اب جو کرتا دھرتا بن بیٹھے ہیں، ان سے پوچھو کہ یہ پریس کلب کیوں نہیں بنا؟ اور یہ قبر کیا ہے؟ نہ وہ فائل ضیاالاسلام انصاری نے نکالی اور نہ ہی حسین نقی نے۔ جب میں واپس آیا تو میں نے حسین نقی سے پوچھا۔ یار میری فائل کدھر ہے مگر یہ بندہ وہ فائل پی گیا۔ حالانکہ حسین نقی کو فائل دینے کے بعد مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ بندہ تو سچ کی بات کرتا ہے۔ کم از کم یہ تو سچ سامنے لائے گا۔ لیکن بدمزگی اس سے پہلے یہ ہو چکی تھی کہ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے پریس کلب کا الیکشن ہار جائے گا۔ یہ لوگ پاپولیرٹی پر الیکشن لڑ رہے تھے اور میں اپنے تعلق پر۔ اچھا اب میرے الیکشن لڑنے کی کہانی یہ ہے کہ میں خود کبھی الیکشن نہیں لڑا تھا بلکہ دوسروں کو لڑواتا تھا۔ میری برنا صاحب سے نہیں بنتی تھی۔ میں ان کے بندے ہروا دیتا تھا۔ میں چونکہ لوگوں کو نوکریاں، ترقیاں دلواتا تھا اور لوگوں کے کام کرواتا تھا۔ بدلے میں سال بعد ایک ووٹ ان سے لیتا تھا۔ یہ والا الیکشن اصل میں ضیاالاسلام اور حسین نقی کے مابین تھا میں ضیاالاسلام کا Covering امیدوار تھا۔ میں اس وقت مساوات چھوڑ چکا تھا۔ اس سے پہلے یونین کا ایک تنازعہ ہوا تھا۔ میرے خلاف ایجی ٹیشن ہوا کہ میں نے بندے نکالے ہیں۔ پریس کلب کی دیواروں پر نعرے لکھے تھے کہ ''مساوات کے کارکنوں کے خون کا حساب دو'' اچانک یہ ہوا کہ ضیا انصاری صاحب مشرق کے چیف ایڈیٹر بن گئے۔ کہنے لگے کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں ایڈیٹر بنے ہوئے۔ میرے لیے مصیبت بن جائے گی۔ میں نے الیکشن نہیں لڑنا۔ میں نے کہا کہ سیٹ کو ہم خالی نہیں چھوڑیں گے۔ جواباً اُنھوں نے کہا تم الیکشن لڑلو۔ میں مان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گیا۔

اس سے پہلے میں چھوٹا موٹا بی ڈی ایم نمائندگی والے الیکشن میں حصہ لیتا تھا۔ صحافتی حلقوں میں ہم ان سے ہمیشہ ہر وہ الیکشن اکثریت سے جیتے جس میں ضیاء صاحب اور میں حصہ لیتے یا کوئی اپنا نمائندہ کھڑا کرتے اور اس کی وجہ میرے ذاتی تعلقات تھے۔ ضیا صاحب کے ہٹنے سے میں اور حسین نقی ون ٹو ون ہو گئے۔ دوسرے دن میں دیال سنگھ مینشن پریس کلب کی سیڑیاں چڑھ رہا تھا تو حسین نقی مجھ سے ملا اور کہا ''بڑا افسوس ہے یار تمہاری تو ضمانت ہی ضبط ہو جانی ہے، چھوڑ دینا تھا پرے'' میں نے کہا ''حسین نقی میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں کہ جب حضرت علیؓ نے امیر معاویہ کے پاس ایک وفد بھیجا جس نے جا کے حضرت علیؓ کے فضائل بیان کیے اور کہا کہ تم ان کی اطاعت قبول کر لو۔ اس نے غصے میں جواب دیا جا کر علیؓ کو بتا دینا کہ میں تمہارے سامنے ایسے بدّ ولاؤں گا جن کو اونٹ اور اونٹنی کے درمیان بھی تمیز نہیں ہے'' پھر میں بولا ''تمہیں پتا نہیں ڈھائی سو ووٹ میں سے ڈیڑھ سو ووٹ ایسا ہے جس کو میں نے نوکری دلوائی ہے، ترقی دلوائی ہے ان کی نوکری بچائی ہے یا میں نے انھیں کوئی اور فیور دیا ہے۔ تم اس (ضیا) سے شاید جیت جاتے، مجھ سے نہیں جیت سکو گے۔ تم ہٹ جاؤ ورنہ تمہاری بے عزتی ہو جائے گی۔ تم انقلابی رہنما ہو اور تمہارا بڑا نام ہے۔ مجھے تم نے ویسے ہی وِلن بنایا ہوا ہے۔ لیکن الیکشن نہ لڑو تو بہتر ہے۔

ایف ای چودھری ایگزیکٹو باڈی کیلئے ان کی طرف سے الیکشن میں حصہ لے رہا تھا، بڑا پاپولر آدمی تھا۔ مجھے مساوات کے دفتر میں ملا، کہنے لگا: ''مجھے ووٹ دے دینا''۔ میں نے کہا ''چاچا، تم نے ہار جانا ہے۔ میں تمہیں کس بات کا ووٹ دوں؟''۔

وہ ابھی تک اس بات کا حوالہ دیتا ہے۔ الیکشن والے دن میں نے ان سے کہا کہ صدر اور سیکرٹری کا فیصلہ تو گھر سے ہو کر آنا ہے۔ میرا سیکرٹری نوائے وقت والا طارق وارثی تھا، اُن کا ممتاز گیلانی تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ ایگزیکٹو کے چار ممبر ہیں تم اپنا اپنا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ممبر چن لو، مگر میری بات ہوا میں اڑا دی گئی۔ لیکن جب رزلٹ نکلا تو یہ مکمل ہار گئے۔ اس کے بعد پھر میں نے نقی سے کہا کہ میں نے تمہیں پہلے ہی نتیجے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ یہ لوگوں کو اصول بتاتا تھا کہ "یہ قاتل ہے اس نے کارکن نکالے"۔ اُردو سپیکنگ ہونے کے ناطے بھی اس نے اُردو سپیکنگ کلاس سے بھی فیور لینے کی کوشش کی۔ اُن میں سے کسی نے اس سے کہا کہ "عباس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو آپ کو ووٹ دے دیتے، اس کے خلاف میں اپنے باپ کو بھی ووٹ نہ دیتا، ہم تمہیں بتا نہیں سکتے کہ اس نے ہمارے لیے کیا کچھ کیا ہے"۔

اس کے باوجود میرا خیال یہ تھا کہ حسین نقی واحد آدمی ہے جو پریس کلب والے معاملے میں سٹینڈ لے گا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ بعد میں کہانیاں بنیں، فائلیں دفن ہو گئیں، سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب لوگ جو مرضی کہیں کہ میں نے قبر بنائی تھی، یہ کیا تھا وہ کیا تھا۔ آئی ڈونٹ کیئر!

(اس حوالے سے حسین نقی صاحب سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے کہا "مرحوم میرے دوست تھے۔ آپ کو آدابِ صحافت کے مطابق عباس اطہر کی زندگی میں میرا موقف لینا چاہیے تھا۔ چونکہ اب وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دے سکتے، لہٰذا اس بابت میں کوئی وضاحت نہیں دوں گا۔)

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی زیرِ سرپرستی تاج پورہ میں جوا ہوتا ہے؟

○ میرے دو بیٹے ہیں۔ ایک امریکہ میں ہے اور ایک ادھر رہتا ہے۔ جس وقت میں جیل میں تھا میرے بڑے بیٹے نے ریس کھیلنی شروع کی۔ ایک مرحوم انسپکٹر وحید ریس کورس کا ایس ایچ او تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹے نے بھی ریس کھیلنی شروع کر دی۔ ان کے خیال میں بھی لوگ جوا، شوا کھیلتے تھے۔ میں ذاتی طور پر کرکٹ کا جوا جیتنے کیلئے کھیل لیتا ہوں۔ میرے پاس تکنیک ہے لیکن اس کیلئے ٹائم چاہئے، اس لیے آج کل نہیں کھیل رہا (ان دنوں کرکٹ کا عالمی کپ انڈیا میں ہو رہا تھا، انٹرویو کے وقت بھی کوئی میچ چل رہا تھا)۔ میں جوئے کو برا نہیں سمجھتا۔ شراب میں آج سے آٹھ سال پہلے تک پیتا رہا اور شاید تا مرگ پیتا رہتا۔ میں اَمریکہ گیا تو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میرے دونوں بیٹے بھی وہیں آ گئے۔ انھیں گرین کارڈ بھی مل گئے۔ انھوں نے وہاں ٹیکسی چلائی اور بہت پیسے کمائے۔ 1990ء میں میرا بڑا بیٹا لاہور آیا ہوا تھا۔ مجھے یہ نوائے وقت کے دفتر چھوڑنے آیا۔ میں 1988ء میں واپس آ گیا تھا اور اپنے بیٹوں کو ادھر ہی چھوڑ آیا تھا کہ اپنی زندگی خود گزارو۔ ان کی شادیاں اور بچے ہو چکے تھے۔ گھر ان کے پاس تھا۔

اچھا تو میں بتا رہا تھا کہ یہ مجھے دفتر چھوڑنے آ رہا تھا۔ فلیٹیز ہوٹل کے پاس اس نے ریڈ لائٹ کراس کی۔ بعض اوقات انسان کے منہ سے نکلی بری بات اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کو کہا کہ گاڑی روکو۔ اس نے گاڑی روکی اور میں نیچے اتر گیا۔ میں نے کہا میں پیدل چلا جاتا ہوں۔ آپس میں بے تکلفی تھی۔ میں نے کہا میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا تم نے اشارہ توڑا ہے۔ طارق، یہ غلطی کسی دن تمہیں بھگتنی پڑے گی۔

دو دن کے بعد میں نے اسے روانہ کیا۔ وہاں پہنچتے ہی اگلے دن یہ دوستوں کی محفل میں کسی جگہ شراب پینے جا رہا تھا۔ ایک جگہ ریڈ لائٹ پر یہ ایک ٹرک کے پیچھے جا کر فل سپیڈ میں لگا، گاڑی کا اوپر والا سارا حصہ کٹ گیا اور گاڑی ٹرک کے نیچے گھس گئی۔ ٹرک کے نچلے پائیدان نے پوری گاڑی کو کاٹ دیا۔ میرے بیٹے کی گردن کٹتے کٹتے بچی اور یہ کومے میں چلا گیا۔ انسان کا دل بند ہو جائے تو اس کے بعد وہ کچھ سیکنڈ زندہ رہتا ہے۔ ایمبولینس وہاں فوری طور پر پہنچ گئی۔ انھوں نے دل کو پمپ کیا، جھٹکے لگائے تو اس کے دل نے کام کرنا شروع کر دیا اور اسے ہسپتال شفٹ کر دیا گیا۔

لاہور میں مجھے پہلی اطلاع یہی ملی کہ اس کے بچنے کے کوئی چانس نہیں۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میری بیوی کا برا حال تھا، جلد از جلد بیٹے کے پاس جانا چاہتی تھی۔ وہاں میرے دوست جو اسے دیکھنے گئے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اس کے بچنے کا کوئی چانس نہیں۔ اس کا بہت کچھ ناکارہ ہو چکا ہے اور ویسے بھی وہ کومے میں ہے۔ بیوی نے بہت زور لگایا تو میں نے کہا کہ میں نہیں جاؤں گا، وہاں جاؤں اور واپسی جہاز پر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لاش لٹکا کر لے آؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ اس زمانے میں رانا مقبول ڈی آئی جی تھا اور میرا بہت قریبی دوست تھا۔ اُس نے مجھے فون کیا کہ یار تم جاتے کیوں نہیں ہو؟ اس کی ماں کو لے جاؤ۔ میں نے کہا میرا پاسپورٹ ایکسپائرڈ ہے۔ اگلے دن اُس نے میرا پاسپورٹ بنوا کر بھیج دیا اور میں بادلِ نخواستہ چلا گیا۔ میں اور بیگم وہاں پہنچے، وہ بدستور کومے میں تھا۔ چند دنوں میں اُمید کے برعکس اس کی ریکوری ہوگئی اور یہ بچ گیا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہ نابینا ہوجائے گا، وہ بھی نہ ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ساری عمر کومے میں رہے گا مگر وہ ٹھیک ہوگیا۔ البتہ دِماغی اعتبار سے وہ 95 فیصد پر آکر اڑ گیا۔ اُنھوں نے مجھے کہا کہ اسے Rehablitation Home میں داخل کروادیں۔ وہ تقریباً پاگل خانے ہوتے ہیں۔ وہاں سے ایک سوشل ورکر آئی اور مجھے کہنے لگی تم محبت میں اپنے بیٹے کو ضائع کرنے لگے ہو۔ وہاں Rehablitation Home والوں کو انشورنس کے بہت پیسے ملتے ہیں لیکن میں نے کہا کہ میں اپنے بیٹے کو نہیں دونگا۔ میں اسے ڈسچارج کروا کے گھر لے آیا۔ میں نے کہا کہ اسے پرانی فلمیں دِکھائیں۔ وہ کچھ بہتر ہونا شروع ہوگیا۔ اس نے مجھے اور اپنی ماں کو کچھ پہچاننا شروع کردیا۔ وہاں اس کی بیوی اور اس کی ماں کو اس کے پاس چھوڑ کر تین مہینے کیلئے میں واپس آگیا۔ کچھ عرصے بعد میں دوبارہ گیا اور اسے ساتھ لے آیا۔ اس کے بعد میں نے اسے واپس نہیں جانے دیا۔ اَمریکہ میں یہ جوئے خانوں پر بیٹھتا تھا، ایک گرین کلب تھا وہاں جوا کھیلتا بھی تھا۔ وہاں سے چلتے وقت ڈاکٹر نے مجھے کہا کہ یہ گیارہ سال کا بچہ ہے۔ اس کے ساتھ آپ نے گیارہ سال کے بچے والا ہی سلوک کرنا ہے۔ اگر آپ نے اس کے ساتھ یہ رویہ نہ رکھا یا اِس کے سر پر دوبارہ چوٹ لگ گئی تو یہ مکمل پاگل ہوجائے گا۔

یہاں میرے اس بیٹے کا بڑا ایشو چلتا رہا کہ وہ جوا کھیلتا ہے جوا کراتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہاں وہ شراب پیتا ہے۔ چوکوں میں بیٹھ کر پیتا ہے اور پولیس کو گالیاں بھی نکالتا ہے۔ میں اسے پروٹیکٹ کرتا ہوں۔ وہ پوتیلی کے جوئے پر بھی چلا جاتا تھا۔ پھیکے پٹھان کے جوئے اور دوسرے کلبوں پر بھی۔ ایک دفعہ مجھ سے مجید نظامی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صاحب نے بھی اس حوالے سے بات کی تھی۔ میں نے کہا اگر یہ چوائس میرے بیٹے اور نوکری کے درمیان ہے تو نوکری نہیں کروں گا۔ مجھے اس بات کی تردید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور میں بدنامی سے بھی نہیں ڈرتا۔ وہ جوا کرواتا بھی ہو تو میں اسے منع نہیں کروں گا۔ میں 12 گھنٹے کی نوکری اپنے اس پتر کی خاطر کرتا ہوں۔ اس کی پروٹیکشن کے لیے۔ ویسے وہ جوا چھوڑ چکا ہے۔ چھوٹا بیٹا جو امریکہ میں ہے وہ ابھی بھی کھیلتا ہے اس کا خیال ہے کہ وہ کروڑ پتی بن سکتا ہے۔

پانچ سال پہلے جب فیصلہ ہو گیا کہ میں ایکسپریس اخبار جائن کروں گا۔ اس وقت عابد عبداللہ یہاں کرتا دھرتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ سلطان لاکھانی کو بتا دینا کہ میرے پتر کے جوئے کے سکینڈل ہیں۔ میں نے شراب چھوڑ دی ہے پھر بھی میرے سکینڈل ہیں۔ آٹھ سال پہلے میں نے شراب چھوڑ دی تھی۔ میں نے بہانہ بنایا ہوا ہے کہ میرا جگر بیٹھ گیا ہے۔ میرے دوست کہتے ہیں ایک پیگ لگا لو، دو لگا لو۔ میں انھیں کہتا ہوں کہ مجھے ایک قطرہ دے دو میں اسے زبان کو لگا لیتا ہوں تا کہ تم یہ سمجھو کہ میں اِسے حرام نہیں سمجھتا۔

صرف یہ کہ میں اپنے بیٹے کا پتا رکھتا ہوں کہ وہ کہاں جا کے جواء کھیلتا ہے۔ میں نے اس کی نگرانی کے لئے بندے رکھے ہوئے ہیں تا کہ کوئی اس کے سر پر چوٹ نہ لگا دے۔ علاقے کی پولیس کو بھی پتا ہے کہ یہ عباس اطہر کا بیٹا ہے۔

☆ شاہ صاحب یہ تو آپ نے categorically بتا دیا کہ کوئی جوا خانہ آپ کی زیر سرپرستی نہیں چلتا؟

○ میرا پتر جوا کھیلتا ہے، گزشتہ ڈربی پر بھی وہ گیا ہوا تھا۔ ہمارے نزدیک پھیکے پٹھان کا جوا ہے اور بھی کئی جوا خانے ہیں۔ اس کا ایک دوست سعید تھا جس کی وجہ سے یہ بدنام ہوا۔ اس کا رجسٹرڈ کلب ہے جس طرح مشرق کلب ہے۔ مشرق کلب ریاض قریشی کا تھا۔ یہ رجسٹرڈ کلب ہوتے ہیں جہاں تاش کھیلا جاتا ہے اور یہ باقاعدہ گورنمنٹ کو ٹیکس دیتے ہیں۔ اس کے دوست سعید کا تاج پورہ میں گرین کلب کے نام سے رجسٹرڈ کلب تھا۔ یہ وہاں جا کر بیٹھتا تھا۔ وہاں دو دفعہ چھاپا پڑا۔ تھانیدار

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نے اس کا نام بھی دو پرچوں میں لکھ دیا۔ ایک بار اس کو لے بھی گئے۔ خیر میں اسے چھڑا کر لے آیا۔ غازی آباد کے تھانیدار کو بھی پتا ہے کہ یہ عباس اطہر کا پتر ہے۔ وہاں وہ کسی بھی جوئے خانے میں جا سکتا ہے اور جوا کھیل سکتا ہے۔ میں اسے منع نہیں کرتا۔ میں نے اپنے بندے اس کے ساتھ لگائے ہوتے ہیں کہ یہ کدھر بیٹھا ہے۔ میں اسے باہر نہیں جانے دیتا۔ پہلے وہ بیڈن روڈ پر پوتلی کے جوئے پر آیا کرتا تھا۔ وہاں سے اسے میں نے منع کیا ہوا ہے۔ تاکہ یہ کسی ایسی پولیس کے ہتھے نہ چڑھے جو اسے مارے اور یہ پاگل ہو جائے۔ باقی جو مرضی کوئی کہانی بنا لے بات تو صرف اتنی سی ہے۔

☆ 7 جون 2009ء کو گوجرانوالہ کے کسی گاؤں میں ایک آدمی کو گاؤں کے کچھ تگڑے لوگوں نے ننگا کیا، زنجیریں پہنا کر گاؤں میں پھرایا۔ واقع سے اگلے دن 'ایکسپریس' گوجرانوالہ کا رپورٹر حافظ شاہد منیر وہاں جاتا ہے۔ انھیں کہتا ہے کہ اسے ننگا کرو، زنجیریں پہناؤ اور گاؤں میں چکر لگواؤ میں اس کی فوٹیج بنا لیتا ہوں۔ انھوں نے ویسا ہی کیا اور رپورٹر نے فوٹیج بنا لی۔ پھر وہ فوٹیج مسلسل ایکسپریس ٹی وی پر چلتی رہی۔ پولیس کا کوئی موقف نہیں دیا جا رہا تھا۔ پولیس والے اس رپورٹر کے گھر پہنچے اور پوچھا کہ شاہد منیر کدھر ہے۔ ایکسپریس پر بار بار یہ ٹکر (Ticker) اور فوٹیج چل رہی ہے کہ حافظ شاہد منیر اور اس کے بچوں کو ہراساں کیا جا رہا ہے۔ آپ نے ایک کالم بھی لکھا "گوجرانوالہ میں چیمہ گردی"۔ اس زمانے میں گوجرانوالہ کے آر پی او ذوالفقار چیمہ کے ایک انتہائی قریبی عزیز نے مجھے بتایا کہ جب ذوالفقار چیمہ ایس ایس پی لاہور تھے تو انھوں نے آپ کے مبینہ جوا خانوں کے خلاف کارروائی کی تھی۔ اس لیے عباس اطہر انتقامی رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ اس میں کیا سچائی ہے؟

○ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ کالم میں نے نہیں، ایاز خان نے لکھا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ چیمہ صاحب سے میرے بڑے اچھے تعلقات تھے جب وہ ایس ایس پی لاہور تھے۔ البتہ جب وہ ایس پی سٹی تھے تب ایک خبر پر میرا اور ان کا جھگڑا بھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوا۔ وہ خبر میں نے نہیں بلکہ حسنین نے چھاپی تھی، میری اس دن چھٹی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نوائے وقت میں تھا۔ اس نے تھانیدار کی طرف سے مجھ پر پرچہ کروادیا کہ میں نے اس سے شراب کی بوتل مانگی ہے۔ اس وقت رانا مقبول ڈی آئی جی تھا۔ ذوالفقار چیمہ نے پرچہ کروا کر عدالت میں بھیج دیا تاکہ مجھے اشتہاری قرار دلوا سکے۔ جب چار دن بعد رپورٹ ڈی آئی جی آفس آئی تو رانا مقبول نے پڑھ کر مجھے فون کیا کہ ''حاضر ہو جائیں جناب''۔ میں گیا تو اس نے کہا تمہیں گرفتار کروں یا کیا کروں۔ میں نے کہا کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے ایف آئی آر میرے سامنے رکھ دی۔ میں سوچنے لگا بھئی اس نے کمال کر دیا ہے۔ میں وہ ایف آئی آر لے کر نظامی صاحب کے پاس آ گیا۔ اُنھوں نے اسی وقت آئی جی کو فون کیا۔ وہ پرچہ تو فوری طور پر خارج ہو گیا مگر مجید نظامی صاحب نے کہا کہ میں اسے (ذوالفقار چیمہ) نہیں رہنے دوں گا۔ لہٰذا انھوں نے اِسے تبدیل کروادیا۔ اس وقت آئی جی چودھری سردار تھا۔ دوسری دفعہ جب یہ (ذوالفقار چیمہ) لاہور آیا تو یہ نظامی صاحب کے آفس آ گیا، اُنھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ چیمہ صاحب کو آپ جانتے ہیں؟ میں نے کہا ہاں جانتا ہوں میرا ان کے ساتھ معاملہ ہوا تھا وہ ختم ہو گیا اور ویسے بھی میں ایسی چیزیں نہیں لکھتا۔ مگر یہ لوگوں کو چھتر مرواتے ہیں۔ لوگوں کے منہ کالے کرواتے ہیں، یہ غیر قانونی ہے۔

یہ تب کی بات ہے جب چیمہ ایس ایس پی لاہور بنا ہے۔ نظامی صاحب کہنے لگے میں تو منہ کالے کرنے اور چھترول کرنے کو پسند کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کی مرضی ہے۔ بہرحال اُنھوں نے مجھے کہا کہ آپ ان باتوں کو جانے دیں۔ یہ (ذوالفقار چیمہ) اٹھ کر گیا تو نظامی صاحب مجھے کہنے لگے کہ ''یہ مر بھی جائے تو اس کی خبر تم نے مجھے پوچھے بغیر نہیں چھاپنی''۔ آج کل یہ مجھے بہت تنگ کر رہا ہے، میرے گھر آ جاتا ہے۔ مجھے فون کر کے میری مت مار دیتا ہے۔ اس طرح میرے اور چیمہ کے تعلقات ٹھیک ہو گئے، لہٰذا جب تک یہ ایس ایس پی لاہور رہا میرے اس کے ساتھ بہترین تعلقات رہے۔ پھر یہ تبدیل ہو کر ڈی آئی جی کو ہاٹ لگ گیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس دوران بھی میرے اور اس کے بہترین تعلقات رہے حتیٰ کہ میں نے ایکسپریس لاہور میں اس کے حوالے سے کوہاٹ کی خبریں بھی شائع کیں کہ یہ پاکستان کا رول ماڈل افسر ہے۔ ملک کا واحد پولیس افسر ہے جس نے اہلکاروں کو الیکشن سے پہلے بلا کر کہا کہ جس نے دھاندلی کی میں اسے عبرت کی مثال بنا دوں گا۔ یہ مشرف دور کی بات ہے۔ میرا اور اس کا مسلسل رابطہ تھا۔ میں نے اسے کوہاٹ کے ایک دو دوستوں کے جو کام کہے وہ بھی اس نے کیے۔ جب یہ وہاں سے ٹرانسفر ہوا تو میری خواہش تھی کہ یہ لاہور آئے مگر یہ گوجرانوالہ میں لگ گیا۔

جس واقعے کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ ہمارا ایکسپریس اخبار اور ٹی وی دونوں الگ الگ ہیں۔ حافظ شاہد منیر نے Re-enactment کی یہ ٹی وی والے اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ایکسپریس ٹی وی والوں نے Re-enactment چلائی تو چیمہ نے حافظ پر پرچہ کاٹ دیا۔ سلطان لاکھانی صاحب اس پر سٹینڈ لے گئے۔

☆ یعنی وہ آپ کا نہیں بلکہ اخبار یا مالک کا سٹینڈ تھا۔

○ ٹی وی والوں کا سٹینڈ تھا۔ میرے اخبار میں تو وہ خبر چھپی ہی نہیں تھی۔ اس بات پر جب لڑائی شروع ہوئی تو میں مالک کو نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں یہ خبر نہیں چھاپوں گا۔ اس ایشو کے بعد کبھی چیف منسٹر، کبھی آئی جی اور کبھی کسی کے پاس جو مذاکرات ہوئے وہ بھی میرے اور چیمہ صاحب کے درمیان ہی ہوتے رہے۔ اس واقعہ کے بعد بھی میرے اور چیمہ صاحب کے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔ آپ ان کا مؤقف بھی لے سکتے ہیں۔ (ذوالفقار چیمہ سے ان کا مؤقف لینے کیلئے رابطہ کیا گیا مگر انھوں نے ٹال مٹول سے کام لیا)۔ بہرحال جھگڑا یہ تھا کہ میں اس سے کہتا تھا کہ پرچہ واپس لے لیں۔ قصے کو ختم کر دیتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے اوپر دو مقدمے کیے تو ہم نے پھر چیف منسٹر کو زچ کرنا شروع کر دیا۔ پھر انھوں نے پرچے واپس لیے اور صلح ہو گئی لہٰذا کیس بھی ختم ہو گئے۔

☆ ذوالفقار چیمہ نے بھی ایکسپریس گروپ پر کیس کیے تھے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ ہمارے لڑکوں پر کیس قائم کرتے رہے۔

☆ عدالت میں بھی کوئی کیس تھے؟

○ عدالت میں اس نے Defamation کے دو کیس کیے تھے۔ میرے اور اس کے تعلقات کا اندازہ کریں کہ ان مقدمات میں اس نے ریذیڈنٹ ایڈیٹر، رپورٹر اور دیگر لوگوں کے علاوہ سلطان لاکھانی کو بھی فریق بنایا مگر مجھے فریق نہیں بنایا۔ لوگ ایسے ہی کہانیاں بناتے ہیں۔ میں کہتا ہوں بناتے جاؤ۔

☆ آپ نے حافظ شاہد منیر کی بنائی ہوئی فوٹیج کو Re-inactment قرار دیا۔ حالانکہ Re-inactment کا مطلب ہوتا ہے آپ اس میں ایکٹر ڈالیں۔ اسے ڈاکیو ڈرامہ کہتے ہیں۔ نہ کہ جو اصلی متاثرہ لوگ ہیں ان کو زنجیریں پہنا کر گاؤں میں ننگا پھرائیں۔ اس کو آپ زرد صحافت نہیں سمجھتے؟

○ سر جی بات یہ ہے فہد حسین ڈائریکٹر نیوز تھا اور سلطان لاکھانی مالک۔ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر انھوں نے کچھ کر دیا ہے اور میرا ادارہ پھنس گیا ہے تو میں نے اپنے ادارے کو تو سپورٹ کرنا ہے۔ میں یہ کر سکتا تھا کہ ایاز خاں کا ''چیمہ گردی'' والا کالم روک دیتا۔ میں ذوالفقار چیمہ کے خلاف خبریں رکوا دیتا۔ جب ہم پر پرچہ ہو گیا تو ہم اپنے ادارے کو ڈیفنڈ کر رہے تھے۔ اس میں جوئے کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ باقی لوگ باتیں کرتے رہتے ہیں میں کہتا ہوں کرتے رہیں۔

☆ شاہ صاحب آج ایک صحافی کو میں نے جب یہ بتایا کہ میں آپ کا انٹرویو کرنے جا رہا ہوں تو اس نے کہا کہ ''وہ تو پیپلز پارٹی کے میڈیا مینجر ہیں''۔ جاوید چودھری کے کئی کالم جو حکومت یا پیپلز پارٹی کے خلاف ہوتے ہیں وہ انھوں نے چھپنے سے روکے ہیں اور عباس اطہر نے کچھ پیسے بھی صحافیوں میں حج یا کسی اور حوالے سے تقسیم کیے ہیں۔ آپ نہیں سمجھتے کہ آپ پیپلز پارٹی کی بہت زیادہ سائیڈ لیتے ہیں؟

○ 4 اپریل 1979ء کو میں کیمپ جیل میں تھا جب بھٹو کو پھانسی لگی۔ ذاتی حیثیت میں میری بھٹو خاندان سے ایک وابستگی ہے۔ میں نے ان کے لیے جلاوطنی بھی کاٹی ہے اور جیلیں بھی۔ میری پیپلز پارٹی سے ہمدردیاں اس لیے ہیں کہ یہ ایک لبرل پارٹی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے۔لیکن آپ اخبار نکلوا کر دیکھ لیں جب نواز شریف اکتوبر 1999ء میں پکڑا گیا، آٹھ سال صرف میں نے اس کے حق میں لکھا ہے۔

☆ اب تو کئی لوگ (صحافی) نواز شریف کے بہت قریب ہو گئے ہیں۔ اور بڑی وفاداریاں جتا رہے ہیں؟

○ ایک میں تھا اور ایک عطاء الحق قاسمی باقی کسی کو جرأت ہی نہیں ہوئی۔

☆ کیا عرفان صدیقی بھی اس دور میں نواز شریف کے حق میں نہیں لکھتے رہے؟

○ وہ لکھتے رہے ہیں مگر بعد میں۔ نظامی صاحب سے پوچھ لینا جب نواز شریف کا تختہ اُلٹا گیا میں اس وقت بھی پیپلز پارٹی کا حامی تھا۔ نظامی صاحب کو اس بات کا پتہ تھا۔ میں نواز شریف کے خلاف لکھتا تھا۔ جب نواز شریف کا تختہ الٹا گیا، رات 9 بجے عارف نظامی صاحب سے روٹین کی میٹنگ ہوا کرتی تھی۔ عارف صاحب نے مجھے اوپر اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ کیا کرنا ہے تو میں نے کہا کہ میری تجویز ہے کہ ایک ڈیڈ (Dead) اخبار چھاپ دیتے ہیں۔ یہ جو باہر آتش بازی وغیرہ ہو رہی ہے، اس کو نہیں چھاپتے۔ کیونکہ ہمارے اخبار کی بیس (Base) پر نواز شریف ہے اور مارشل لاء کو ویسے بھی ہمیں سپورٹ نہیں کرنا چاہئے۔ پھر مجید نظامی سے بات ہوئی تو اُنھوں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا اور کہا جو تمہاری مرضی ہے کر لو۔ میں اس وقت نوائے وقت میں چیف نیوز ایڈیٹر تھا۔ اگلے دن میں نے ڈیڈ اخبار نکالا جس سے کوئی ایسا پہلو نہیں نکلتا تھا کہ ہم خوش ہیں۔ پھر میں نظامی صاحب کے پاس گیا اور انھیں کہا کہ میں شریف برادران کے خلاف لکھتا رہا ہوں، اب میں مشرف کے حق میں نہیں لکھ سکتا۔ لہٰذا میں کالم نہیں لکھوں گا۔ نظامی صاحب کہنے لگے اخبار نویس کو لکھنا ہی پڑتا ہے۔ تم آہستہ آہستہ نواز شریف کی مخالفت Withdraw کرو اور اپنا کوئی نیا لائحہ عمل بنا کر رستہ نکال لو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ نواز شریف اس وقت سچا ہے اور مشرف جھوٹا، تو تم اس پر لکھو۔ ان آٹھ سالوں کے دوران مشرف کے اقتدار میں آنے کے بعد آپ کسی سے پوچھ لیں۔ جدہ میں شام کی محفلوں میں نواز شریف صاحب میرے کالم کی تلاوت کرایا کرتے تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں اب بھی نواز شریف لوگوں کے خلاف نہیں لکھتا۔ میری یہاں ایک پوزیشن ہے۔ میں گروپ ایڈیٹر ہوں۔ یہاں سلطان لاکھانی ایک منٹ کے لیے نہیں آتا۔ میں اخبار کو کمرشل Proposition سمجھتا ہوں۔ بطور اخبار نویس مجھے اپنے آپ پر فخر ہے اور میں اتنا پروفیشنل ہوں کہ میں پیپلز پارٹی کے اخبار کا ایڈیٹر بن سکتا ہوں اور جماعت اسلامی کے اخبار کا بھی۔ میں جب کسی کی جاب قبول کرتا ہوں تو پھر میں اس کی پالیسی قبول کرتا ہوں۔ میں اپنا ''لچ'' نہیں تلتا۔ اخبار کے لیے میں نے نہ صرف سنٹر بلکہ صوبے کے بھی اشتہار لینے ہوتے ہیں۔ یہاں دو انتہائیں ہیں۔ ایک انتہا ہے اینٹی نواز شریف، جس میں اسد اللہ غالب، ہمارا تنویر قیصر شاہد۔ ان کے کالم میں اگر آپ کو دکھاؤں۔ ایسی ایسی گالی نواز شریف کو لکھتے ہیں! میں یہ کاٹ دیتا ہوں یا روک دیتا ہوں۔ جاوید چودھری کبھی کبھی اپنی اوقات سے بڑھ کر ان پر اٹیک کرتا ہے، اس کے بھی دو تین کالم میں نے روکے ہیں۔ اس کے ایسے کالموں کو میں بدل دیتا ہوں، رد کر دیتا ہوں یا سلطان لاکھانی سے کہتا ہوں کہ اِس مواد کو آپ کلیئر کر سکتے ہیں میں نہیں۔ چونکہ ہم اشتہار بند کروانا افورڈ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ سنٹر میں بزنس کے اعتبار سے ہم نمبر ون ہیں۔ اور پنجاب میں ہم برابر ہیں۔

آپ سمجھ لیں کہ میں نے دونوں طرف Tactfully بیلنس رکھا ہوا ہے۔ میں ایڈیٹر ہوں کالمسٹ نہیں۔ جاوید چودھری نے جب بھی اوقات سے بڑھ کر لکھا ہے میں نے روک دیا ہے۔ جیسے طالبان کے حق میں۔ یہ ہماری پالیسی ہے کہ ہم طالبان کو سپورٹ نہیں کرتے۔ ہم نے سلمان تاثیر کے قتل کو سپورٹ نہیں کیا۔ میں نے اپنی جان پر کھیل کر اس قتل کی مخالفت کی ہے۔ میں نے اِسے 'شہید' لکھا۔ اس پر یہ لوگ جو مرضی کہتے رہیں۔ یہ پیسے تقسیم کرتے ہیں، یہ فلاں کرتے ہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے پیسے تقسیم کرنے کی، کیا وہ خود یہ کام نہیں کر سکتے؟ میں کن کو پیسے تقسیم کرتا ہوں؟ میں اپنے دفتر میں آل اِن آل ہوں۔ وہ سارے پیسے خود میں ہی کیوں نہ رکھ لوں؟ بھٹو صاحب کے دور میں سب نے، شاید منو بھائی نے بھی پلاٹ لیا تھا۔ میں نے تو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وہ بھی نہیں لیا۔ میں نے زندگی میں صرف ایک پلاٹ لیا ہے اور وہ بھی لاہور کی صحافی کالونی میں جہاں سب دوسرے صحافیوں کو پلاٹ بھی ملے ہیں۔ میرے اوپر چونکہ کوئی چیز ثابت نہیں ہو سکتی لہٰذا ادھر ادھر کی مارتے ہیں، کہ پیسے لیتے ہیں فلاں کرتے ہیں یہ کرتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ جب وہ صدر نہیں بنے تھے، میری زرداری کے ساتھ پہلی ملاقات ہی میں لڑائی ہو گئی تھی۔ ایک مہینہ بول چال بند رہی۔ بعد میں اس نے خود ہی صلح کر لی۔ میں واحد آدمی ہوں جو اس کے منہ پر کہہ دیتا ہے کہ یہ تم غلط کر رہے ہو۔

☆ حافظ شفیق الرحمن دن اخبار کے ایک کالمسٹ ہیں اور دن ٹی وی پر پروگرام بھی کرتے ہیں۔ 10 جون 2009ء کو ریحان اظہر کے ساتھ مارننگ ٹرانسمیشن کرتے ہوئے شفیق الرحمن نے کہا کہ حسن نثار اور عباس اطہر ٹائپ لوگ بوتل اور بلیک لیبل گروپ ہیں۔ یہ ٹرپل ایجنٹ ہیں۔ یہ پلاٹو کریسی ہیں۔ آپ کیا کہیں گے کہ کسی چینل پر ایسی گفتگو کرنا مناسب ہے؟

○ میں نے یہ گفتگو نہیں سنی۔ اگر انھوں نے ایسا کہا ہے تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جیسے یہ لوگوں پر کرپشن ڈالتے ہیں، میں اسے بے ہودگی ہی سمجھتا ہوں۔

☆ اس نے پلاٹو کریسی یا ٹرپل ایجنٹ کہا ہے، اس میں کتنی صداقت ہے؟

○ کوئی پلاٹ ہے تو نکالیں۔ ٹرپل ایجنٹ کس کے؟ ایسے ہی کوئی نام لے لے یہ تو کوئی بات نہیں۔ جو لوگ خود اتنے چھوٹے ہیں ان کا کیا نوٹس لیا جائے۔ ایسے ہی گلی میں جاتے ہوئے کوئی بچہ بات کر دے تو میں اسے لٹھ مار دوں؟

☆ 16 جون 2001ء کو بزنس پلس کے ایک پروگرام ''چودھری غلام حسین کے ساتھ'' میں آپ نے مولانا فضل الرحمان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ پہلے وہ کہتے تھے کہ طالبان اسلام آباد سے 20 کلومیٹر دور رہ گئے ہیں۔ جب آپریشن ہونے لگا تو اُنھوں نے مخالفت کر دی۔ آپ نے کہا کہ میں مولانا فضل الرحمان کے حوالے سے سافٹ کارنر رکھتا تھا لیکن وہ تو بہت ہی منافق آدمی ہے۔۔۔؟

○ لفظ: 'منافق' میں نے استعمال نہیں کیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ میں نے یہ پروگرام خود سنا۔ آپ نہیں سمجھتے کہ یہ بات ذرا زیادہ سخت تھی؟

○ یہ لفظ مجھے استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا اور ویسے عموماً میں یہ لفظ استعمال نہیں کرتا۔

☆ میڈیا جس ٹریک پر جا رہا ہے۔ کیا آپ اسے درست سمجھتے ہیں؟ کیا اردو میڈیا معاشرے میں بہت جذباتیت پیدا نہیں کر رہا؟

○ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میڈیا کسی حکومت کو نہیں چلنے دے گا۔ اگر اس کو کنٹرول نہ کیا گیا تو یہ اس ملک کو تباہ کر دے گا۔

☆ نوائے وقت مشرقی پاکستان میں الشمس اور البدر کی حمایت کرتا رہا گذشتہ سالوں میں 'افغان باقی کہسار باقی' جیسے نعرے چھپتے رہے اور اب بھی چھوٹے سے سائز میں یہی نعرہ چھپ رہا ہے۔ آپ ملکی تاریخ میں نوائے وقت کا رول کیا دیکھتے ہیں؟

○ مجید نظامی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں، میں اس پر تبصرہ (Comment) نہیں کروں گا۔

☆ ایک طرف میڈیا میں بڑے بڑے پیکجز پر لوگ کام کر رہے ہیں اور دوسری طرف ایسے صحافی بھی ہیں جو کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ یہ کیا چکر چل گیا ہے؟

○ یہ ایک وباء ہے۔ میں اس معاملے میں کیا کہوں اینکر پرسن ایکٹر بن گئے ہیں۔ جیو ٹی وی نے ایک مقابلے کی فضا پیدا کی ہوئی ہے۔ ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں؟ یہ مالکان کی صوابدید ہے۔ میں اور آپ تو تنخواہیں نہیں دیتے۔

☆ کیا میڈیا میں ایجنسیوں کا کوئی رول ہے؟

○ میں نے سنا ہے ایجنسیوں کا رول ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ نہیں، نہ میں کسی پر الزام لگانا چاہتا ہوں۔

○

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خبریں کی خبر

ضیا شاہد موجودہ دور کے نامی گرامی صحافی ہیں۔ صحافتی حلقوں میں ایک دنیا ان کے تخلیقی آئیڈیاز کی معترف ہے۔ جمعہ بخیر اور دیگر عنوانات کے تحت کالم نگاری میں بھی اُنھوں نے اپنا لوہا منوایا۔ صحافتی میدان میں بہت بڑی کامیابیاں سمیٹنا اُنھی کا خاصہ ہے، عام صحافی صرف ان کامیابیوں کی خواہش ہی کر سکتا ہے۔

ضیا شاہد روزنامہ ''پاکستان'' کے بانی ایڈیٹر ہیں۔ 26 ستمبر 1992ء کو اُنھوں نے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روزنامہ خبریں نکالا۔ وہ خبریں گروپ آف نیوز پیپرز کے چیئرمین ہیں۔ ادارے کا دعویٰ ہے کہ روزنامہ خبریں لاہور، کراچی، اسلام آباد، حیدرآباد، ملتان، پشاور، سکھر اور مظفرآباد سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ یہی گروپ دوپہر کا اخبار ''نیا اخبار'' بھی شائع کرتا ہے۔ اسی کے تحت سندھی اخبار ''خبرون'' بھی سندھ کے چار بڑے شہروں سے نکلتا ہے۔ ایک زمانے میں پنجابی روزنامہ ''خبراں'' بھی نکلتا رہا۔ اگرچہ خبریں کے ایڈیٹوریل صفحے پر تعارفی کارنر میں اب بھی یہی لکھا ہوتا ہے کہ ''خبریں گروپ تین شہروں سے پنجابی زبان کا اخبار ''خبراں'' بھی شائع کرتا ہے''۔ مگر عملاً یہ اخبار وفات پا چکا ہے۔

خبریں گروپ پشتو اور دیگر قومی زبانوں میں بھی اخبار چھاپنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ضیا شاہد کے بڑے بیٹے عدنان شاہد کی اچانک موت نہ صرف ان کے انگریزی روزنامے ''دی پوسٹ'' کی بندش کا باعث بنی بلکہ ضیا فیملی اور خبریں گروپ کو بھی ناقابل تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا جس کے اثرات سے وہ تاحال نہیں نکل سکے۔ جہاں ایک طرف خبریں گروپ کی کارکردگی کو عدنان شاہد کی جواں مرگ نے متاثر کیا وہیں دوسری طرف ضیا شاہد کی طویل بیماری نے بھی ادارے کو نقصان پہنچایا۔ پاکستان کے اردو اخبارات میں جیسی تیسی بھی تحقیقاتی صحافت ہو رہی ہے، حالیہ دور میں اسکا باقاعدہ رواج ''خبریں'' نے ہی ڈالا۔ اور عمومی طور پر معاملے کو ٹھکانے لگا کر ہی چھوڑا، خواہ پس منظر کچھ بھی ہو۔

''خبریں'' نے اپنا ماٹو ''جہاں ظلم وہاں خبریں'' لکھا اور ضیا شاہد نے روایت پسندی کو توڑتے ہوئے صحافت کی نئی طرح ڈالی۔ ایڈیٹر کی تصویریں اور بیانات چھاپنے کا رواج بھی ''خبریں'' نے ہی شروع کیا۔ زرعی صفحہ بھی اسی اخبار نے چھاپنا شروع کیا۔

آج کل ''خبریں'' کی پرنٹنگ اور کاغذ کافی بہتر ہو چکا ہے۔ خبریں اخبار ویب سائٹ پر بھی موجود ہے تاہم اسے مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

''خبریں'' سنڈے میگزین بھی چھاپتا ہے۔ جو کہ معمول کی ایک کاروائی لگتی ہے۔ میگزین میں نو، دس صفحے تو مکمل اشتہارات کے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر اشتہارات طاقت، موٹاپا ختم کرنے، جنتاتی عاملوں اور کالے جادو سے تمام مسائل کا حل کرنے والے جادوگروں کے ہوتے ہیں۔ حسب رواج ٹائٹل اور درمیانی صفحات پر کسی ایکٹر، ماڈل کا شوٹ بھی شامل اشاعت ہوتا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے۔

''خبریں'' سرکولیشن کے اعتبار سے جنوبی پنجاب اور آزاد کشمیر میں پہلے نمبر پر جبکہ لاہور میں پانچویں نمبر پر ہے۔ ''خبریں'' نے پاکستان میڈیا کو درجنوں نامی گرامی صحافی اور کالم نگار دیئے، جن میں مشتاق منہاس اور جاوید چودھری بالخصوص نمایاں ہیں۔ ایک زمانے میں بڑے نامور کالم نویس ''خبریں'' میں لکھتے رہے ہیں۔ جن میں ہارون الرشید، حسن نثار اور راجہ انور جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ جاوید چودھری نے تو بطور کالم نگار اپنی پہچان ہی ''خبریں'' سے بنائی۔

نوے کی دہائی کے وسط میں خبریں گروپ تیزی سے کامیابی کی طرف گامزن تھا اور موجودہ صدی کے آغاز میں خبریں گروپ نے اپنے عروج کو پالیا۔

''چینل فائیو'' بدقسمتی سے الیکٹرانک میڈیا میں کبھی پانچویں درجے کو بھی نہ چھو سکا البتہ ''خبریں'' کافی بلندی سے واپس آیا۔ ''خبریں'' اخبار پر لاہور کے ایک بڑے روزنامے کے ایڈیٹر کا یہ تبصرہ بہت برجستہ اور حسب حال ہے جو انھوں نے حالیہ دنوں میں اخبار کو دیکھ کر کیا:

''آج کے دن کے تمام اردو اخبارات میں سے خبروں اور پیش کش (Presentation) کے اعتبار سے ''خبریں'' سب سے بہتر تھا، مگر بدقسمتی سے اب اسے سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا''۔

عوامی اور صحافتی حلقوں میں خبریں گروپ کے حوالے سے بہت جھوٹے، سچے، قصے، کہانیاں مشہور ہیں۔ آپ خبریں گروپ میں کام کرنے والے کسی بھی سابقہ یا موجودہ کارکن سے پوچھیں وہ آپ کو عموماً کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور سنائے گا۔ ویسے تو کسی نہ کسی حوالے سے ''خبریں گروپ'' سے وابستہ رہنے والے کارکنوں سے کوئی نہ کوئی سوال بھی ضرور ہی کیا جاتا ہے اور وہ اسی خشوع و خضوع سے جواب دینا بھی اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ ضیا شاہد یا خبریں گروپ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ان کو جاننے والے عموماً ان کے پروفیشنل ازم اور تخلیقی صلاحیتوں کی حد درجہ تعریف کرتے ہیں مگر اس سے آگے بہت بڑی ''لیکن'' بھی لگا دیتے ہیں۔ زیر نظر انٹرویو میں اس ''لیکن'' سے آگے گفتگو کی گئی ہے۔ انٹرویو کے سلسلے میں بہت آسانی کے ساتھ ان سے وقت طے پا گیا اور 6 جولائی 2011ء کو ''خبریں'' لاہور کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آفس میں ریکارڈ کیا گیا۔ انٹرویو سے پہلے ضیا شاہد کوئی انگریزی کتاب پڑھ رہے تھے۔ کمزور اور لاغر نظر آرہے تھے اور ان کی شخصیت کا روایتی دبدبہ اور طنطنہ بھی مفقود تھا مگر ذہنی طور وہ پر پوری طرح چست تھے۔

ضیا شاہد

☆ اخبار شروع کرنے کے لیے آپ کے پاس سرمایہ کہاں سے آیا؟

o میں نے ''پاکستان'' اخبار کیلئے بہت محنت کی تھی لیکن جب وہ چل نکلا تو مالکان سے اختلافات کے باعث جلد ہی فارغ ہو گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں آیا کہ جب بھی کسی فنانسر کی مدد سے اخبار نکالا جائے گا تو یہی حشر ہوگا۔ وہاں سے پھر کسی طرح سے نکالے جائیں گے۔ مختلف چیزوں کے بارے میں میرے اپنے خیالات ہیں۔ اور اُن پر سمجھوتہ کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور جو بندہ اخبار کو فنانس کرتا ہے وہ اِسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ پیشہ ورانہ طور پر ایڈیٹر کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ فنانسر کی بات مانے یا اپنی سوچ کے مطابق اخبار کو چلائے۔ لہٰذا جب میں نے سوچا کہ اخبار شروع کیا جائے تو دِقت یہ تھی کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ پاکستان اخبار سے مجھے بطور ایڈیٹر شاید تیس ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی۔ وہاں سے چند دنوں کی تنخواہ کے ساڑھے چھ ہزار روپے میری جیب میں تھے اور کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ پہلے میں ہفت روزہ ''صحافت'' نکالتا رہا تھا، سوچا کوئی ویکلی پرچہ ہی شروع کروں۔ جب اندازہ ہوا کہ شاید ہفت روزہ نکالنے کے لیے بھی سرمائے کا بندوبست میں خود نہ کر سکوں تو پھر ذہن میں یہی آیا کہ سرمایہ جمع کیا جائے۔ چنانچہ میں نے کچھ دوستوں سے پوچھا کہ کمپنی کس طرح بنائی جاتی ہے۔

اِس طرح ہم نے ''لبرٹی پیپرز لمیٹڈ'' کی بنیاد رکھی۔ ہم نے یہ سوچا کہ ہر شہر میں جو ہمارا نمائندہ ہوگا وہ ساتھ کمپنی کا شیئر ہولڈر بھی ہوگا۔ اور ہم خود بھی کمپنی کے شیئرز خریدیں گے۔ کچھ دوستوں سے بھی کہیں گے کہ وہ اِس کمپنی کے ڈائریکٹر بنیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اِس طرح ہم اجتماعی طور پر سرمایہ اکٹھا کریں گے۔ ابتداء میں ہم نے صرف 34 لاکھ جمع کیے اور اُن سے کمپنی رجسٹرڈ کروائی۔ جب اخبار شروع کیا تو نیوز ایجنٹس سے سکیورٹی کی مد میں جو پیسے اکٹھے ہوئے وہ شاید 74 لاکھ تھے۔ اِس طرح کم و بیش 1 کروڑ دس لاکھ روپے کے سرمائے سے ''خبریں'' اخبار شروع کیا گیا تھا۔ بعد میں آہستہ آہستہ شیئر ہولڈر بھی آتے گئے اور کچھ پیسے بھی آنے لگے۔

☆ ایجنٹس سے سکیورٹی کی مد میں پیسے لینے کا طریقہ بھی شاید پہلی دفعہ آپ ہی نے استعمال کیا؟

o ایجنسیوں سے تو سبھی پیسے لیتے ہیں۔ اس لیے کہ اُن کو اخبار سپلائی کیا جاتا ہے۔ روٹین یہ ہوتی ہے کہ وہ زرِ ضمانت دیتے ہیں۔ تقریباً ایک مہینہ دس دن کے بعد بل ملتا ہے تو ایجنٹس ایک مہینے کے پیسے سکیورٹی کے طور پر جمع کراتے ہیں۔ ہم نے شاید نئی بات یہ کی تھی کہ جس شہر میں بھی جو کوئی نمائندہ مقرر کیا جائے گا وہ دس سے پچاس ہزار، یا جتنی اُس کی توفیق ہو، دے اور اس کے بدلے میں اُس کو کمپنی کا شیئر ہولڈر بنایا جائے۔ یہ ایک نیا کام تھا۔

☆ آپ نے جو نمائندے یا ڈائریکٹر بنائے تھے اُن کے پیسے کبھی واپس بھی کیے؟

o اُنھوں نے پیسے واپس لینے کیلئے دیئے ہی نہیں تھے۔ اُنھوں نے پیسے تو اخبار نکالنے کیلئے دیئے تھے اور اگر اخبار نکل رہا ہے۔ اور ترقی بھی کر رہا ہے تو وہ پیسے واپس کیوں لیتے؟

☆ فرض کریں اگر کوئی علیحدہ ہونا چاہتا ہے؟

o ہاں اگر کوئی علیحدہ ہونا چاہتا ہے تو اور بات ہے مثلاً ہمارے کچھ ڈائریکٹر علیحدہ ہونا چاہتے تھے تو اُن کے شیئرز ہم نے آہستہ آہستہ تین، چار، پانچ سال میں خرید لیے۔ لیکن تھوڑے تھوڑے کر کے خریدے چونکہ اتنے پیسے نہیں ہوتے۔

☆ یہ بات بھی مشہور ہے کہ ''خبریں'' میں یہ کہا جاتا ہے کہ ''خود بھی کماؤ اور ہمارے لئے بھی لے کر آؤ'' اِس میں کہاں تک صداقت ہے؟

o (ہلکا سا مسکراتے ہوئے) نہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ اتفاق ایسا ہے کہ بعض تصور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

Perceptions ایسے بن جاتے ہیں کہ پھر اُن کی تردید بہت مشکل ہوتی ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ "اپنے لیے بھی کماؤ اور ہمیں بھی لا کر دو"۔ لطیفہ ہے کہ کسی نے ملازم رکھا اور کہا کہ اپنا کھانا داتا صاحب جا کر کھا آیا کرو اور ہمارے لیے لے آیا کرو۔ ایسا ممکن نہیں ہوتا۔

☆ آپ نے یہ فرمایا کہ کچھ تصورات (Perceptions) بن جاتے ہیں اس میں یہ وجہ تو نہیں کہ جو پرانی طرز کے مالکان تھے وہ شعوری یا لاشعوری طور پر یہ برداشت نہیں کر رہے تھے کہ عام اخباری کارکن خود اخبار کا مالک بن جائے؟

o میں سبھی کی عزت کرتا ہوں۔ کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ عام طور پر یہ برداشت نہیں کیا جاتا، اور یہ پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا کہ ایک سب ایڈیٹر اُٹھ کر کل کو اخبار نکال لے تو بہت سے لوگ بہت دیر تک یہ دیکھتے رہے کہ پیسے کہاں سے لیے۔ میں ہر آدمی کو سمجھاتا تھا پھر کاغذ دکھاتا تھا کہ دیکھو یار ہم نے ایک کمپنی بنائی ہے میرے تو اِس میں تھوڑے سے شیئرز ہیں۔ جو پیسے میں نے انویسٹ کیے ہیں وہ بھی بہاولنگر میں اپنی زمین بیچ کر لگائے ہیں۔ عام طور پر لوگ کم ہی یقین کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اصل میں اعتماد نہیں ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب تک کسی کے پاس بہت سے پیسے نہ ہوں اُس وقت تک کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

☆ اپنے ابتدائی سالوں میں "خبریں" بہت پاپولر ہوا۔ بڑے بڑے کالم نگار خبریں میں لکھتے تھے۔ جاوید چودھری نے یہاں سے نام کمایا۔ ہارون الرشید، راجہ انور اور انور سدید بھی خبریں میں لکھتے رہے۔ آج کل کوئی بڑا لکھنے والا آپ کے اخبار میں نظر نہیں آتا؟

o حسن نثار بھی یہیں تھے۔ خالد مسعود خاں نے بھی یہیں سے شروع کیا تھا۔ بہت لوگ تھے لیکن یہ کوئی بیک وقت نہیں تھے۔ بس لوگ آتے گئے اور جب اُنھیں کسی دوسری جگہ زیادہ معاوضہ ملا تو وہ وہاں چلے گئے۔ ہم خود کما کر کھانے والے لوگ ہیں۔ اس طرح بھی نہیں ہے کہ ہمارے اور کوئی کاروبار ہوں یا بہت سا پیسہ ہو کہ ہم

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ڈیڑھ، دو یا تین لاکھ کالم نگاروں کو دے سکیں۔ ہمارے پاس جو لوگ کالم لکھتے تھے ان کی دل آزاری ہوگی اس لیے میں بتانا نہیں چاہتا اور نہ ہی بتاؤں گا کہ وہ کتنے پیسے لیتے تھے۔ میرے خیال میں اب انھیں بیس تیس گنا زیادہ معاوضہ ملا تو وہ چلے گئے۔ میں نے کسی کو روکا نہیں۔

☆ کیا یہ لوگ خبریں کو لانچنگ پیڈ کے طور پر استعمال کرتے رہے؟

○ یہ تو نہیں کہنا چاہئے البتہ یہ ہے کہ جب وہ مقبول ہوئے تو اپنی مقبولیت کو اُنھوں نے خوب کیش کیا۔ اچھی بات ہے۔ ان کا حق ہے۔

☆ ایک زمانے میں آپ، طاہر القادری، عمران خان، نواز شریف کے بہت قریب رہے۔ پھر آپ ان کے خلاف ہو گئے اور ان کے خلاف چھاپنا شروع کر دیا۔ میں نے کئی ایسی تصویریں دیکھیں کہ آپ عمران خان یا نواز شریف کے کان میں کوئی بات کر رہے ہیں۔۔۔

○ طاہر القادری صاحب کے زیادہ قریب تو میں کبھی نہیں ہوا۔ نواز شریف صاحب کے قریب تھا بلکہ میں تو ان کی پارٹی میں شامل ہوا تھا اور ان کی سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی میں بھی تھا۔ لیکن میں دو ذمہ داریاں بیک وقت نبھا نہیں سکا۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی کسی کی سیاسی پارٹی میں شامل ہو تو پھر تصور کیا جاتا ہے کہ ساری دنیا میں کوئی خبر چھپے لیکن اپنے اخبار میں نہ چھپے۔ لہٰذا روزانہ میری لڑائیاں ہوتی تھیں کہ یہ خبر ہمارے خلاف کیوں چھپی تو میں یہ کہتا تھا کہ یہ آپ کے بارے میں کسی کی سٹیٹمنٹ ہے اور باقی اخباروں نے بھی چھاپی ہے۔ لیکن وہ بہت برا مناتے تھے۔ چنانچہ میں دونوں ذمہ داریوں کو نبھا نہیں سکا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صحافی کو صحافی ہی رہنا چاہئے۔

☆ اس بات میں کہاں تک سچائی ہے کہ نواز شریف نے اپنے کارکنوں یا ممبران کو ایک لیٹر جاری کیا جس میں کہا گیا کہ آپ دس برس کے لیے 'خبریں' کے خریدار بن جائیں۔ لیکن پھر مجید نظامی صاحب کو کسی طرح پتہ چل گیا اور ان کی مداخلت سے یہ خط رُکا۔ اس بات سے آپ ناراض ہو گئے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o یہ بات نہیں ہے۔ خط ضرور اُنھوں نے دیا تھا۔ اصل میں اس وقت کی حکومت نے ہمارے اشتہارات بند کر دیئے تھے۔ خود مجید نظامی صاحب نے ہمارے اشتہارات جاری کروانے کیلئے وزیر اطلاعات خالد خاں کھرل اور اے پی این ایس میں بھی بہت دفعہ بات کی۔ لیکن پونے دو سال کے قریب ہمارے سرکاری اشتہارات بند رہے۔ ہمارا بہت نقصان ہوا تھا اور ہم نے اخبار کے صفحات بھی بارہ سے دس کر دیئے تھے۔ رنگین صفحات بھی چھاپنے روک دیئے تھے۔ اس وقت نواز شریف لیڈر آف دی اپوزیشن ہوتے تھے۔ لہٰذا جب ہمیں بہت زیادہ نقصان ہوا تو لیٹر کا آئیڈیا خود اُنھوں نے ہی دیا۔ خود ہی انھوں نے وہ خط لکھوایا اور اس پر اپنے دستخط کیے اور کہا کہ آپ مسلم لیگ کے ورکرز کو پانچ، دس سال کیلئے خریدار بنالیں تو آپ کو کچھ سرمایہ مل جائے گا تاکہ جو آپ کو نقصان ہو رہا ہے وہ اس سے پورا ہو جائے۔ کس وجہ سے، کس کے کہنے پر وہ خط نواز شریف نے واپس لیا اور انھیں محسوس ہوا کہ یہ انھوں نے غلط کیا ہے؟ کس نے ان سے شکایت کی؟ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

☆ ویسے آپ کے علم میں ہے؟

o ہاں میرے علم میں ہے۔ بہر حال ایک دن اُنھوں نے مجھے بُلا کر کہا کہ آپ کے پاس اُس لیٹر کی کاپی ہے؟ میں نے کہا ابھی تو میں نے چند خط ہی استعمال کیے ہیں۔ بائیس لوگ ابھی خریدار بنے تھے۔ نواز شریف کہنے لگے کہ وہ خط مجھے واپس کر دیں اور اِسے مزید نہ پھیلائیں۔ اِس معاملے پر باقی اخبارات نے اعتراض کیا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ لہٰذا اُس لیٹر کی چھپی ہوئی کاپیاں اُن کو واپس کر دی گئیں۔ میں اُس واقعے کے بعد بھی سال ڈیڑھ سال اُن کی حمایت کرتا رہا۔ چنانچہ اگر اُس وجہ سے میں ناراض ہو گیا ہوتا تو پھر اگلے دن سے مجھے اُن سے خفا ہو جانا چاہیے تھا۔

☆ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ چاہتے تھے کہ نواز شریف، عمران خان، یا طاہر القادری خبریں گروپ کے ڈائریکٹر بن جائیں۔ ظاہر ہے اُس کے لیے پانچ دس لاکھ روپیہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دینا پڑتا تھا۔ جب وہ ڈائریکٹر نہیں بنے تو پھر آپ اُن کے خلاف ہو گئے؟

o میں نے کبھی عمران خان یا نواز شریف کو ڈائریکٹر بننے کیلئے نہیں کہا۔ سیاست دان ویسے بھی اخبارات میں سرمایہ کاری نہیں کرتے چونکہ ایک اخبار سے کوئی تعلق پیدا ہو جائے تو باقی اخبار پھر مخالف ہو جاتے ہیں۔ نہ میں نے کبھی کسی کو کہا، نہ مجھے کسی نے انکار کیا۔

☆ شیخ افتخار عادل، ملک ریاض اور ریما کے خلاف بھی آپ چھاپتے رہے۔ پھر ریما خبریں کی کالم نگار بن گئیں۔ اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے شوبز رپورٹر کامران گورائیہ اُن کا کالم لکھتے تھے اِس میں کہاں تک سچائی ہے؟

o ریما اپنا کالم خود لکھتی تھی۔ (مسکراتے ہوئے) جیسا کالم ہوتا تھا ایسا تو وہ لکھ سکتی تھی۔ میں نے ریما کے خلاف ایک اصولی سٹینڈ لیا تھا کہ اُنھیں ''جیوے جیوے ہندوستان'' نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہ ایک اصولی بات تھی۔ اِس پر اُنھوں نے میرے خلاف پریس کانفرنس بھی کی اور بہت خوفناک الزام بھی لگایا کہ ایک اخبار کا ایڈیٹر مجھے بلاتا تھا۔ میں نہیں گئی اِس لیے میرے خلاف لکھا جا رہا ہے۔ یہ بہت توہین آمیز الفاظ تھے۔ وہ یہ کہتی ہیں کہ میں نے یہ باتیں عاشق چودھری کے کہنے پر کیں جو جنگ اور جیو کے سینئر رپورٹر ہیں۔ وہ میرے بھی کولیگ رہے ہیں اور شوبز کے بہت پرانے رپورٹر ہیں۔ راڈو والے سہیل بٹ ہمارے مشترکہ دوست تھے اور وہ ہمارے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ میں نے اُن سے کہا ریما نے بہت بیہودہ بات کی ہے۔ میں اِس مزاج کا آدمی ہوں اور نہ میں نے کسی خاتون کو بلایا۔ میں نے کہا یہ تو بالکل صحیح ہے کہ وہ نیویارک گئیں اور وہاں اُنھوں نے یہ خامہ فرسائی فرمائی۔ ہم نے رپورٹ چھاپی تو اُنھوں نے کہا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا۔ ہم نے اُس مجلس میں جتنے لوگ موجود تھے اُن کے بیانات چھاپ دیے کہ اُنھوں نے یہ گایا تھا۔ لہٰذا سہیل بٹ صاحب نے اُن سے بات کی اور کہا جی کہ وہ قسم کھاتی ہیں کہ میں نے یہ الفاظ نہیں کہے۔ مجھے سے منسوب کر کے ایک اخبار نے چھاپ دیے یہ تو اخباروں کی آپس میں لڑائی ہے، میں تو اِس میں ویسے ہی ماری گئی ہوں۔ پھر سہیل بٹ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صاحب ایک دن اُن کو لے کر میرے پاس آئے۔ ریما نے اپنی صفائی دی اور یہ بھی کہا کہ ٹھیک ہے مجھ سے غلطی ہوگئی تھی اور میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ آپ کی خبر صحیح تھی اور میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ جو خبر آپ کے بارے میں چھپی وہ درست نہیں تھی اور آپ نے مجھے کبھی اِس طرح نہیں بلایا بلکہ اُسی موقع پر اُنھوں نے کہا کہ مجھے خود لکھنے لکھانے کا بہت شوق رہا ہے اور اگر آپ تھوڑی سی سرپرستی کریں تو میں لکھوں۔ اتنی سی بات تھی۔ ویسے ہم اُن کو لکھنے کے پیسے دیتے رہے ہیں۔ اور ہم سارے کالم نویسوں کو پیسے دیتے ہیں لیکن ہمارے پیسے بس اعزازیہ ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ کسی کالم نگار کو تیس چالیس ہزار ملتے ہونگے۔

☆ شیخ افتخار عادل اور ملک ریاض کا کیا قصہ تھا؟

o شیخ افتخار عادل کے خلاف میں نے کبھی کچھ نہیں لکھا۔

☆ پنڈی میں آپکا بیورو شاید چھاپتا رہا؟

o پنڈی کے اخبار میں اُن کے خلاف کچھ چھپا ہوگا۔ اُس وقت خوشنود علی خاں صاحب پنڈی کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ اُن کی کوئی لڑائی تھی۔ اُس لڑائی میں بابر اعوان صاحب تھے۔ بابر اعوان صاحب خوشنود صاحب کے ساتھ تھے۔ شیخ صاحب کے بیٹے کا کوئی کیس آجکل بھی چل رہا ہے۔ پچھلے دنوں اُس کیس کی دوبارہ تاریخ نکلی تھی۔ بابر اعوان صاحب کی آواز کو اُنھوں نے ٹیپ کرلیا تھا کہ جی مجھے اتنے پلاٹ چاہئیں وگرنہ آپ کے خلاف لکھیں گے۔ افتخار عادل صاحب نے یہ گفتگو ٹیپ کرنے کے بعد پریس کلب راولپنڈی میں سنادی۔ میری تو اُس معاملے میں بہت برأت ہوگئی اِس لیے کہ اُس گفتگو میں ایک سوال ہے ''کہ کیا ضیا شاہد کو اِس ڈیل کا پتہ ہے؟'' تو جواب میں اُنھوں نے کہا اِس میں اُن کا کوئی تعلق نہیں یہ راولپنڈی کی ڈیل ہے۔ لہٰذا میں نے اُن سے کبھی پلاٹ نہیں مانگے۔ افتخار عادل صاحب سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایڈیٹرز کونسل بنائی تھی تو اُس میں وہ ہمارے نائب صدر ہوتے تھے۔ انھیں مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوئی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ ملک ریاض کا مسئلہ بھی کیا پنڈی بیورو سے ہی تھا؟

o ملک ریاض کی ساری لڑائیاں خوشنود صاحب سے تھیں بعد میں اُن کی صلح ہوگئی اور خوشنود صاحب آجکل اُن کے اخبار 'جناح' کے ایڈیٹر ہیں۔ میں مزاجاً کسی کے خلاف اِس طرح کی چیزیں چھاپ کر بعد میں صلح کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ یا تو کسی کے خلاف سٹینڈ لینا ہی نہیں چاہیے اور اگر لے لیا تو وہ سٹینڈ برقرار رہنا چاہیے۔

☆ حکیم تحسین کے بارے میں بھی تو خبریں میں بہت چھپتا رہا؟

o حکیم تحسین کے بارے میں بہت سادہ سی بات ہے کہ ہمارے ہاں بیچاری ایک لڑکی کام کرتی تھی اور اُسکے والد بھی یہیں پروف ریڈر تھے۔ اُس کی لڑکی کی شادی ہونے والی تھی تو اُس نے حکیم تحسین کی کریم لیکر اپنے منہ پر لگائی تو اُس کے سارے منہ پر آبلے سے پڑ گئے۔ اُس کو گنگا رام ہسپتال بھی بھجوایا اور مزید علاج بھی کروایا۔ بعد ازاں حکیم صاحب سے پوچھا تو کہنے لگے کہ یہ تو میری کریم ہی نہیں ہے۔ کسی نے جرمنی کی کسی کریم کی یہاں دو نمبر کاپی بنائی ہوئی تھی اور وہ یہ کریم بنا کر دھڑا دھڑ بیچنے لگا۔ حکیم صاحب کہنے لگے نام ہمارا استعمال ہوا ہے حالانکہ ہم اور بیجنل دوائیں بناتے ہیں۔ باہر کی کریموں کی دو نمبر نہیں بناتے۔ یہ اُن کا موقف تھا۔

اِس معاملے پر ہم نے اُن کے خلاف کافی لکھا بھی کہ یہ بہت بُری بات ہے کہ لوگوں کے منہ جل رہے ہیں۔ ایک واقعہ اتفاقاً ہمارے اپنے دفتر میں پیش آیا۔ جسکی وجہ سے ہم نے اُس کا نوٹس لیا۔ بعد میں جب اُنھوں نے حلفاً کہا کہ جی میں یہ کام نہیں کرتا۔ آجکل بہت سے ایسے لوگ ہیں جو دو نمبر مال بناتے ہیں تو نیچے ایڈریس کوئی سا بھی لکھ دیتے ہیں۔ میں تو اپنی اور بیجنل دیسی دوا بناتا ہوں۔ اِس طرح یہ بات ختم ہوگئی۔

☆ ایک عوامی رائے ہے کہ خبریں گروپ بلیک میلر ہے۔ اِس میں کہاں تک سچائی ہے؟

o بلیک میلر تو اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شخص کے بارے میں ایک آدھ جملہ چھاپے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ تفصیلات ہم پرسوں بیان کریں گے۔ اُس دوران اُس سے بات کرے پھر اُس سے وہ معاملات طے کر کے تو پھر اُس پر لکھنا چھوڑ دے۔ میں نے کبھی اِس طرح نہیں کیا۔ ہمارے ہاں تو جس کے بارے میں چھپا ہے وہ حاجی مقصود بٹ ہو یا حکیم تحسین ہوں، علی الاعلان اخبار میں چھپا ہے اور جو کچھ بھی چھپا آج بھی اُس کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور اُس کی وجہ بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم نے تو کبھی اِس طرح نہیں کیا کہ کچھ چھاپ کر بعد میں صلح کر لیں۔

☆ صحافتی حلقوں میں یہ بات بھی عام ہے کہ موجودہ بلڈنگ جس میں خبریں گروپ کا آفس ہے۔ یہ یوسف نامی شخص کی بلڈنگ ہے اور آپ نے اِس پر قبضہ کر لیا ہے۔ اِس میں کہاں تک صداقت ہے؟

o یوسف کذاب صاحب کے پاس تو ایک گھر چھاؤنی میں ہوتا تھا۔ وہ پکڑے گئے تو اُن کی بیگم صاحبہ ہمارے پاس آئی تھیں کہ ہم اپنا گھر بیچ رہے ہیں۔ آپ نے جو کچھ چھاپا اُسکی وجہ سے میرا شوہر جیل میں ہے۔ لہٰذا دوبارہ یعنی ''خبریں'' ہی یہ تردید کر دے کہ آپ کے سارے الزامات غلط ہیں۔ ہمارے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ میں نے کہا کہ رسول پاک ﷺ کی اہانت کے مرتکب مجرم کی تو ہم کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ یہ بلڈنگ تو لاہور شہر کے ایک جانے پہچانے آدمی کی ملکیت ہے۔ ابراہیم شمسی، آفتاب شمسی کا بیٹا ہے جن کی فورٹریس سٹیڈیم میں جوائے لینڈ ہے۔ کراچی میں بھی اُنھیں کی جوائے لینڈ ہے۔ ابراہیم شمسی صاحب اِس بلڈنگ کے مالک تھے ان سے ہم نے ڈیل کی۔ یہ نامکمل عمارت تھی۔ دو پارٹنرز کا آپس میں جھگڑا تھا۔ شمسی صاحب سے علیحدہ اور شارجہ میں اِن کے دوسرے پارٹنر چودھری رحمت اللہ صاحب سے علیحدہ ڈیل کی اور دونوں کو اُن کے حصے کے پیسے دیے البتہ ہم نے ایک رعائت لی تھی جسکی وجہ سے لوگوں کو حیرت ہوئی تھی کہ ہم نے اتنی بڑی بلڈنگ کیسے خرید لی۔ یہ بلڈنگ صرف ڈھانچہ تھا۔ دیواریں بھی نہیں تھیں۔ صرف ستون اوپر تک تھے۔ اِس عمارت کو بھوت بنگلہ کہتے تھے۔ کبھی ہم بھی گزرتے تھے تو حیران ہوتے تھے کہ یہ بلڈنگ کیوں بند

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پڑی ہے۔

پارٹنرز کے درمیان لڑائی ہو رہی تھی۔ آپس میں مقدمات چل رہے تھے۔ یہ تو بالکل اتفاق ہے کہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میسج (Message) سے ہم نے پیسے لینے تھے۔ میسج والوں نے اِس بلڈنگ کی پبلسٹی کی تھی اور اُس کے اشتہارات ہمارے ہاں چھپے تھے۔ جب بھی ہم اُن سے پیسے مانگتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ ہمارا کلائنٹ ہی بھاگ گیا ہے۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ جی کلائنٹ نے ہمیں اشتہارات کے عوض اپنی اُس بلڈنگ میں آٹھ کمرے دیے تھے وہ کمرے آپ لے لیں۔ چنانچہ اِس بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر آٹھ کمروں کی رجسٹری اُنھوں نے ہمارے نام کروا دی اور چابی بھی دے دی۔ میں جب یہاں آیا تو میں نے دیکھا ہر طرف ٹوٹ پھوٹ ہے۔ اوپر دیواریں بھی نہیں تھیں، جو بعد میں ہم نے خود بنائیں۔ صرف فرسٹ فلور پر بجلی تھی۔

میں نے دیکھا تو سوچا کہ یہ آٹھ کمرے لے کر ہم کیا کریں گے۔ لہٰذا شروع میں میرا خیال تھا کہ جب یہ کوئی مارکیٹ وغیرہ بنے گی تو اپنے ایجنٹ کو کہیں گے کہ بھئی یہ دکانیں تم لے لو اور کوئی کاروبار کر لو۔ لیکن جب یہ اندازہ ہوا کہ یہاں مارکیٹ تو مزید بیس سال بھی نہیں بنے گی کیونکہ ساجھے داروں کے آپس میں مقدمات ختم نہیں ہونگے لہٰذا پھر ہم نے دونوں مالکان سے باری باری بات کی۔ وہ بلڈنگ دینے پر مان گئے۔ قیمت پونے چار کروڑ روپے مقرر ہوئی۔ ہم نے لیاقت بلوچ کو ضمانتی بنا کر وعدہ کیا کہ ہم پیسے قسطوں میں دیں گے۔ جو اُن دونوں پارٹنرز کا حصہ تھا۔ بہر حال دونوں حصہ داران کو ہم دس لاکھ مہینہ کے حساب سے پیسے دیتے رہے۔ ہم نے کہا کہ جب آپ کو ادائیگی مکمل ہو جائے تو ہمیں رجسٹری کروا دیجئے گا۔ البتہ ہمیں ایک فلور کا قبضہ دے دیں تا کہ ہم یہاں اپنے دفاتر منتقل کر دیں۔ اِس طرح ہم 5 مال روڈ سے یہاں شفٹ ہو گئے اور ساتھ ساتھ مالکان کو پیسے دیتے رہے۔ قسطیں چار پانچ سال میں مکمل ہوئیں۔

عام طور پر ہم ایک دوسرے کی عیب جوئیوں میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ مجھے ابھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کوئی بات مل جائے گی کہ عارف نظامی صاحب نے مجید نظامی صاحب کے بارے میں یہ کہا تو میں اُسے بہت اُچھالوں گا۔ جب اُس کی تردید آئے گی تو میں اُسے درِ خور اعتنا بھی نہیں سمجھوں گا۔

ہمارے ہی اخبار میں لیاقت بلوچ صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون اُنھوں نے اپنے ہاتھ اور نام سے لکھا تھا۔ ہم نے مضمون کے ساتھ اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا مضمون اور بیجنل عکس کے ساتھ چھاپا تھا۔ اُس میں اُنھوں نے لکھا تھا یہ بلڈنگ ابراہیم شمسی صاحب سے لے لی گئی تھی۔ میں اِس کا گارنٹر تھا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ خبریں کو پہلی بلڈنگ بھی میں نے بیچی تھی۔ یہ جسارت اخبار کی بلڈنگ تھی۔ اخبار یہاں سے نہیں نکلا اوپر بیورو کا دفتر تھا اور نیچے پریس تھا۔ پریس بھی میں نے اُن سے خریدا تھا۔ لیاقت بلوچ نے لکھا کہ اُس پریس کی پوری رقم بھی مجھے قسطوں میں مل گئی تھی اور اِس بلڈنگ کی چار سال میں پونے چار کروڑ کی مکمل ادائیگی ہو چکی ہے۔ اور میں بہت خوش ہوں کہ جس سودے میں پڑا تھا وہ مکمل ہو گیا ہے۔ یہ مضمون ہمارے اخبار کے صفحہ دو پر چھپا تھا مگر شاید اُس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ جبکہ افواہوں پر زیادہ دھیان ہوتا ہے۔ یوسف مجھے جگہ کیوں دیں گے میں نے تو اُنھیں پکڑوایا تھا۔

☆ لیکن بعد میں یہ بھی ہوا کہ آپ کے ایک رپورٹر نے یوسف کے قتل میں استعمال ہونے والا پستول جیل کے اندر پہنچایا؟

○ یہ بالکل ایک اتفاق تھا۔ ایاز شجاع ہمارے ہاں ایک رپورٹر تھا۔ وہ آج بھی کسی اخبار میں رپورٹر ہے اور خبریں سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ مختلف اخباروں میں کام کرتا رہا ہے۔ اُس سے تو کوئی نہیں پوچھتا۔ بہر حال اُس واقعے کے بعد جب مجھے پتہ چلا کہ وہ ہمارا جیل رپورٹر تھا اور یوسف کے قتل میں استعمال ہونے والا پستول یہ جیل میں دے کر آیا ہے تو میں نے فوراً اُسے بلایا لیکن وہ آیا ہی نہیں۔ ہم نے اُسے فارغ کر دیا۔ فرض کیجئے اگر میں نے خود جا کر بھی پستول دیا ہو تو خدانخواستہ میں تو کسی بندے کی جان لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ (ہنستے ہوئے)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جب میں یوسف کذاب کی جان لینا چاہتا تھا وہ مجھے اپنی بلڈنگ کیوں دیتا۔

☆ اخباری دنیا میں آپ نے ایک نئی چیز متعارف کروائی کہ فرض کریں گوجرانوالہ ایک ڈویژن ہے اُسی شہر میں بیورو چیف ہے، وہیں ڈسٹرک رپورٹر، پھر تحصیل رپورٹر، نامہ نگار اور یہاں تک کہ پریس کونسلر بھی ہے۔۔۔

o پریس کونسلر تو ہمارا کوئی نہیں ہے۔

☆ ایک زمانے میں آپ نے رکھے تو تھے؟

o لاہور میں ایک زمانے میں الیکشن ہونے والے تھے تو ہر کونسلر کے علاقے میں ہم نے ایک پریس رپورٹر رکھنے کا سوچا کہ الیکشن کور کریں گے۔ اور اُن رپورٹرز کا نام پریس کونسلرز رکھیں گے لیکن وہ سکیم الیکشن سے پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔ دوسری بات آپ نے بیورو کے حوالے سے کی تو بڑے شہروں میں مثلاً سیالکوٹ، وزیر آباد، گجرات، گوجرانوالہ میں ہمارے بیورو ہیں۔ ملتان سے تو خیر اب پرچہ نکلتا ہے لیکن ساہیوال، سرگودھا میں بھی ہمارا بیورو ہے۔

بیورو چیف اِس نقطہ نظر سے رکھا جاتا ہے کہ ایک آدمی تو ایگزیکٹو ہو لیکن بڑے شہر میں ایک نمائندہ خبروں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اِس میں بنیادی تصور یہ تھا کہ جیسے سرگودھا یا فیصل آباد ہیں تو وہاں آپ اگر ایک رپورٹر رکھ لیں تو ایک بندہ اتنے بڑے شہر کی کتنی خبریں دے سکتا ہے؟ ایک دن میں وہ کتنی جگہوں پر جا سکتا ہے۔ اگر کسی کالج میں کوئی تقریب ہوگی تو وہ پولیس کی رپورٹنگ کیسے کرے گا؟ اگر کرائم کے پیچھے جائے گا تو کوئی سماجی یا سیاسی سرگرمی کی کوریج نہیں کر پائے گا۔ لہٰذا ہم نے اِن علاقوں میں بیورو بنائے۔ بیورو میں ایک یا دو رپورٹر ہوتے ہیں اور ایک فوٹو گرافر۔ یہ سیٹ بنے ہوئے تھے۔

☆ آپ اُن کو پیسے دیتے تھے؟

o بیورو چیف کو ہم پیسے دیتے تھے۔ باقی جو نیچے ہوتے تھے اُن کو ہم کہتے تھے کہ جتنا بیورو کا بزنس ہوگا اُس میں سے اُن کو تنخواہیں دی جائیں گی۔ جیسے گوجرانوالہ کا آفس ہے وہی اُن کی تنخواہوں کا بندوبست کرتا ہے گوجرانوالہ کا دفتر جتنا بزنس کرتا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے اُس سے تنخواہیں دفتر کا کرایہ اور ٹیلی فون وغیرہ کا بل منہا کر کے باقی پیسے ہمیں دیتا ہے۔

☆ آپ کے اخبار سے پہلے تو یہ رواج نہیں تھا کہ نامہ نگار یا دور دراز کے رپورٹرز سے سکیورٹی کی مد میں اُن سے پیسے لیے جائیں؟

○ میں اُلٹ بات کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف خبریں میں ہے کہ بیورو چیف کو بھی پیسے ملتے ہیں۔ کسی اخبار بشمول جنگ کے میں بطور جائنٹ اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی کام کرتا رہا ہوں، کسی نامہ نگار کو پیسے نہیں ملتے۔ ہاں وہ جو بزنس بھیجتا ہے اُس میں سے کچھ فیصد اُسے حصہ ملتا ہے۔

☆ سکیورٹی تو صرف آپ لیتے ہیں، باقی اخبار تو نامہ نگار سے سکیورٹی نہیں لیتے؟

○ نامہ نگار سے سکیورٹی نہیں لیتے، ہماری سکیورٹی والی بات تو بالکل مختلف ہے، وہ سکیورٹی نہیں شیئرز ہیں۔ اور اُن کی ملکیت ہیں۔

☆ اُن کو فائدہ ہوتا ہے شیئرز کا؟

○ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ فرض کریں میرے شیئرز بیس لاکھ کے ہیں اور فرض کریں کمپنی کی مالیت آٹھ یا دس کروڑ روپے ہے اور اگر کمپنی کے اثاثے بڑھ کر سو کروڑ تک چلے جاتے ہیں تو فی شیئر اثاثوں کے حساب سے جس کے پاس ایک ہزار شیئرز ہیں اُس کے پاس درحقیقت اِس وقت دس، پندرہ لاکھ مالیت کے شیئرز بنتے ہیں۔ اگر کوئی بیچنا چاہتا ہے تو اُسے وہ خریدی گئی قیمت پر فروخت نہیں کرتا۔ آپ مجھے کسی سے شیئرز لے دیں میں تو اُسی قیمت پر خریدنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ لوگ تو پانچ پانچ گنا زیادہ پیسے مانگتے ہیں۔ کسی کے اگر دس لاکھ روپے کے شیئرز ہیں تو وہ دس لاکھ میں ہی فروخت نہیں کرتا۔

☆ جب پرویز مشرف نے اقتدار پر قبضہ کیا تو آپ نے اگلے دن خیر مقدمی اشتہار چھاپا؟ اِس بات میں کتنی حقیقت ہے؟

○ نہیں میرا نہیں خیال۔۔۔۔

(نوٹ:- 18 اکتوبر 1999ء کو خبریں کے صفحہ نمبر 2 پر ایک کالم ضیا شاہد کی بیگم محترم

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یاسمین شاہد کے نام سے جنرل پرویز مشرف کے قوم سے خطاب کے حوالے سے چھپا تھا۔ اس کالم کا عنوان تھا ''خشک لہجے میں سچی باتیں''۔ ذیلی سرخی تھی ''میں تقریر کے آخر میں رو پڑی''۔

کالم کے ابتدائیے میں یاسمین صاحبہ نے لکھا ''اُنھوں (پرویز مشرف) نے جو لفظ کہا دل میں اُتر گیا۔ شاید بولنے والا سیاستدانوں کی طرح منافق اور جھوٹا نہیں تھا''۔)

☆ پرویز مشرف کے دور میں پانچ سال خبریں عروج پر رہا۔ آپ کو اشتہار ملتے رہے۔

○ اشتہار تو ہمیں اب بھی ملتے ہیں۔

☆ خبریں منافع میں چلا گیا اور آپ نے ان لوگوں کے گھروں میں چیک بھی بھجوائے جو کارکن کہتے تھے کہ تنخواہیں نہیں ملتیں۔ تو اِس میں کہاں تک سچائی ہے کہ پرویز مشرف کے دور میں آپ کو بہت فائدہ ہوا؟

○ گھروں میں چیک بھجوانے کی حقیقت اور ہے۔ دراصل میں عمرے پر جانا چاہتا تھا۔ میں نے ایم اے عربی بھی کیا ہوا ہے اور تھوڑی بہت فقہ بھی پڑھی ہے۔ قرآن پاک اور حدیث بھی براہ راست، بغیر کسی ترجمے کے پڑھے ہیں۔ اگر آپ مقروض ہیں تو آپ کا کوئی حج یا عمرہ قبول نہیں۔ میں، میری بیوی اور بیٹی ایک دفعہ پہلے بھی عمرے پر جانا چاہتے تھے تو میں نے تقریباً اُس کے لیے سات مہینے انتظار کیا۔ کچھ پیسے جمع کرنے شروع کیے۔ میں نے کہا کہ جو لوگ چھوڑ گئے ہیں اور ان کے ہماری طرف پیسے واجب الادا ہیں۔ ویسے پیسے تھے بھی تھوڑے تھوڑے۔ کوئی چھوڑ کے چلا گیا ہے تو کسی کے دس دن کے کسی کے بیس دن کے پیسے تھے۔ اُس کے بعد میں نے اُن کا حساب لگایا کہ کتنے پیسے بنتے ہیں۔ ان پیسوں کا میں نے بندوبست کیا اور ان کو بھجوائے۔ اس کے بعد مطمئن دل کے ساتھ عمرے پر گیا کہ اب مجھ پر پیسوں کا بوجھ نہیں ہے۔ پچھلے سال مجھے حج کی سرکاری طور پر بھی آفر ہوئی تھی۔ لسٹ میں میرا اور میری بیوی کا بھی نام تھا۔ میں نے کہا کہ میں نہیں جا سکتا، کیونکہ مجھ پر قرض ہے۔ میرا تصور یہ ہے کہ جب تک میں نے کارکنوں کے پیسے دینے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہیں یا کسی کے مہینے سے زیادہ پیسے نکلتے ہیں تو میں حج پر نہیں جا سکتا۔ اپنا اپنا عقیدہ ہے اور میرا تو عقیدہ یہ ہے۔

☆ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشرف کے ساتھ آپ نے اس لیے تعاون کیا کیونکہ نواز شریف کے دور میں سیف الرحمان نے خوشنود علی خاں اور آپ کے درمیان جو ڈیل کروائی تھی۔ اس میں سیف الرحمان نے خوشنود علی خاں کے حق میں ڈنڈی ماری تھی؟

o نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتا۔ خوشنود صاحب علیحدہ ہونا چاہتے تھے اور سیف صاحب نے کوشش کی تھی۔ اصل میں وہ شروع سے ہی چاہتے تھے کہ یہ سارا ادارہ ہی واپس لے لیں۔ مجھے وہ کہہ رہے تھے اپنے پیسے لے لو اپنا حصہ لے لو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میں نے انھیں کہا کہ میں نہیں چھوڑنا چاہتا۔

☆ سیف الرحمان کو کیا مسئلہ تھا؟

o پتہ نہیں، مسئلہ تو وہ جانتے ہوں گے۔ اچھا میں نے کہا کہ میں بلاوجہ کیسے چھوڑ دوں۔ میرے شیئرز بھی ہیں اور میں نے محنت بھی کی ہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے تقسیم کی بات کی تو میں نے کہا میرے مین شیئر ہولڈر خوشنود صاحب الگ ہونا چاہتے ہیں اور میں نے ان کو آفر بھی کی ہے کہ دو اخبار، خبریں اور صحافت ہیں اور دو شہروں لاہور اور اسلام آباد میں دفاتر ہیں۔ ایک اخبار اور ایک شہر کا دفتر لے لو۔ ملتان کا دفتر لاہور آفس نے ہی بنایا تھا۔ لہٰذا ان میں سے ایک لے لو اور باقی بیٹھ کر حساب کر لو۔ اس بات پر میرے خوشنود صاحب کے ساتھ بہت خوش اسلوبی سے معاملات طے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ایک اخبار صحافت لے لیا اسے اُنھوں نے شام کی بجائے صبح کا اخبار کر لیا۔ اور اسلام آباد کا دفتر اور پریس ان کے حصے میں آیا۔ اس طرح ہم الگ ہو گئے۔

☆ آپ پنجاب بنک کے بھی نادہندہ ہیں۔ سترہ کروڑ آپ نے چینل فائیو نکالنے کے لیے لیا تھا اور آپ پر پرچہ بھی ہوا تھا۔ آپ اور شاید آپ کی فیملی بھی ضمانت پر ہیں؟

o ضمانت پر تو میں نہیں ہوں۔ سول مقدمات فوجداری (Criminal) نہیں ہوتے۔ ہوا یہ کہ ہم نے چینل فائیو کیلئے پنجاب بینک سے دس کروڑ روپے لیے۔ دس کروڑ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روپے اصل رقم ہے اور چار کروڑ روپے سود ہے۔ ان کا کل چودہ کروڑ کا ہمارے خلاف دعویٰ ہے۔ اُنھوں نے ہمیں پچیس کروڑ روپے دینے تھے لیکن اُنھوں نے صرف دس کروڑ روپے دیے اور وہ بھی دس کروڑ کا سامان لیز کروا کے دیا۔ پنجاب بینک والوں نے کہا کہ پہلے آپ سامان لے لیجئے اس کے بعد 15 کروڑ رننگ فنانس (R.F) دوسری قسط میں دیں گے۔ لیکن دوسری قسط ملنے سے پہلے ہی حکومت تبدیل ہوگئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب پرویز الٰہی کی حکومت گئی تو پنجاب بینک میں ایف آئی اے اور سٹیٹ بینک کی ٹیم آ کر بیٹھ گئی اور اُنھوں نے پچھلے سارے معاہدات منسوخ کر دیئے وہ مزید سخت ہو گئے اور کہا جی کہ پیسہ کسی کو نہیں دینا۔ پنجاب بینک نے چونکہ ہمیں معاہدے کے مطابق پیسے نہیں دیئے لہٰذا پہلے ہم پنجاب بینک کے خلاف عدالت میں گئے کہ لیز پر سامان لے کر ہم نے چینل مکمل کیا ہے اور اب رننگ فنانس دے نہیں رہے تو ہم پیسوں کے بغیر چینل کیسے چلائیں؟ وہ کیس چل رہا تھا تو تین ساڑھے تین ماہ بعد بینک نے ہم پر جوابی مقدمہ کر دیا کہ ہم نے ان کے چودہ کروڑ روپے دینے ہیں۔ یہ کیس دو سال سے چل رہا ہے۔ دونوں کے ایک دوسرے پر مقدمات ہیں۔ اب چونکہ پنجاب بینک کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ لہٰذا ان کے زیادہ ذرائع ہیں۔ اُنھوں نے ہم پر تین چار فوجداری (Criminal) مقدمات کروا دیئے اور یہ بہت دلچسپ مقدمات ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہاں چینل کا جو سامان پڑا تھا وہ غائب ہے اور چوری ہو گیا ہے۔ بینک نے ہم پر یہ فوجداری مقدمہ کروایا ہے کہ ان کا سامان چوری ہو گیا ہے۔ اس پر ہم نے ان کو شروع میں ہی لکھ کر دے دیا کہ آپ آ کر سامان چیک کر لیں۔ سامان موجود ہے تو چینل چل رہا ہے۔ اگر سامان نہیں ہے تو پھر چینل کیسے چل رہا ہے؟ اُنھوں نے بجائے چیک کرنے کے یا کوئی بندہ بھیجنے کے یا ہمیں خط لکھنے کے اُنھوں نے دوسرا مقدمہ کر دیا کہ مشنری چینل فائیو نے اٹھا کر بیچ دی ہے اور پیسے بھی نہیں دیئے۔ لہٰذا ان پر فوجداری مقدمات درج کئے جائیں۔ پولیس نے کسی جج کی وجہ سے یا کوئی چاہے تو پولیس ویسے ہی ایسا کر سکتی ہے لہٰذا پولیس نے ہم پر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مقدمات بنا دیئے۔ اب وہ مقدمات انویسٹی گیشن والوں کے پاس ہیں اور وہ بے چارے کہتے ہیں کہ ہمیں تو خود سمجھ نہیں آتا کہ کیا کریں۔ وہ بینک سے کہہ رہے ہیں کہ آپ وزٹ کیوں نہیں کرتے اور ری چیک کیوں نہیں کرتے کہ لسٹ کے مطابق یہ سامان لیز ہوا تھا۔ ہم بار بار یہ لکھ کر بھی دے چکے ہیں اور آخری دفعہ بھی لکھ کر دیا ہے اس کے باوجود کبھی کسی طرف اور کبھی کسی طرف سے وارنٹس آجاتے ہیں۔ یہ مہربانی تو پنجاب بینک کر رہا ہے۔

☆ اس میں شہباز شریف، نواز شریف یا کسی اور کا ہاتھ ہے؟

o شہباز شریف کہتے ہیں کہ مجھے نہیں پتا۔

☆ ایک زمانے میں خبریں بہت پاپولر تھا۔ بڑا نام تھا اور لوگ بہت پڑھتے تھے، تو پھر کیا وجہ ہوئی کہ یہ زوال کی طرف آ گیا؟

o میں نہیں سمجھتا کہ زوال کی طرف آیا ہے۔ البتہ اس کی ترقی رک گئی ہے اس کی وجہ میری ذاتی صحت ہے۔ پہلے چار پانچ ماہ بیمار رہا پھر تقریباً ایک سال ہسپتالوں میں رہا۔ اس کے بعد دو تین ماہ لندن ہسپتال میں داخل رہا واپس آیا تو پھر علاج کیلئے امریکہ چلا گیا۔ تقریباً اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں جہاں میں ہوتا تھا باری باری عدنان اور امتنان صاحب میرے ساتھ رہتے تھے۔ اس سارے عرصے میں جب میں آؤٹ رہا تو کام کاج کافی متاثر ہوا۔ اس کا تھوڑا سا اثر یہ ضرور پڑا کہ اخبار کی ترقی رک گئی۔

☆ ایک بات یہ بھی کی جاتی ہے کہ ''پاکستان'' اور ''خبریں'' بہت کم تعداد میں چھپتے ہیں مگر سرکاری اشتہار اسی تعداد کے مطابق لیتے ہیں جو اے بی سی میں بتائی ہوئی ہے۔ چونکہ ویسے اخبار چھاپنے کی لاگت اس قیمت سے زیادہ ہوتی ہے جس قیمت پر ایک اخبار بکتا ہے لہٰذا اس طرح آپ لوگوں کی لاٹری نکلی ہوئی ہے؟

o باقی سب کی بھی لاٹری نکلی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں تو کم اشتہارات ملتے ہیں۔ ہمیں شکایت ہے کہ کم اشتہارات ملتے ہیں۔

☆ ستمبر یا اکتوبر 2010ء میں امتنان شاہد صاحب نے خبریں اور چینل فائیو کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کارکنوں کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف جلوس نکالا۔ اسکی بیک گراؤنڈ بتانا پسند کریں گے؟

O وہ جلوس میرے خلاف تو نہیں تھا۔ نہ اس میں امتنان صاحب شامل تھے۔ جب وہ جلوس میرے خلاف نکل رہا تھا تو امتنان صاحب اسی صوفے پر میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ بلکہ میں نے اُنھیں دکھایا کہ دیکھو یار میرے خلاف بڑی زبردست قسم کی گالم گلوچ ہو رہی ہے۔ میں ہنستا رہا۔ کیونکہ جن لوگوں نے وہ جلوس نکالا تھا وہ زور زور سے سینے پر ہاتھ مار رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے ''مر گئے بھکھے، مر گئے بھکھے''۔ تو میں نے کہا یہ آدمی جو سب سے آگے ہے، اس نے اشتہارات کی مد میں دفتر کا ساڑھے چار لاکھ روپے دینا ہے۔ ایک دوسرا تھا جس کے ذمہ ڈھائی لاکھ روپیہ تھا۔ ہمارا سسٹم یہ ہے کہ ہم عام طور پر اشتہارات میں ہر کارکن کو دخل نہیں دینے دیتے لیکن سالگرہ پر کوئی کارکن بھی اگر اشتہار لاتا ہے تو اس کو بھی کمیشن دیتے ہیں۔ البتہ اس سے اقرار نامہ لکھوا لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے بھی پیسے بن جاتے ہیں۔ اِس جلوس والی ساری مشقت کے پیچھے جو ہمارے دوست تھے، ان کو اس صورتحال سے بہت مایوسی ہوئی، وہ اصل میں ہم باپ بیٹے کو آپس میں لڑوانا چاہتے تھے۔ جب امتنان صاحب کو، جو مجھ سے اتفاقاً کسی ذاتی مسئلے کی وجہ سے ناراض تھے اور آٹھ دس دن سے دفتر نہیں آ رہے تھے، صورتحال کا پتہ چلا کہ کوئی جلوس نکلا ہوا ہے اور اس میں لامحالہ اُن کا نام آئے گا، تو وہ جلوس میں سے گزر کر اوپر میرے پاس آئے تو کہنے لگے کہ میرا اِس جلوس سے کوئی تعلق نہیں ہے، ویسے میں ناراض ہوں۔ میں نے کہا جو آپ کی ناراضگی ہے اس پر بیٹھ کر بات کر لیں لیکن یہ جو بے ہودگی باہر ہو رہی ہے اس کو آپ کی وجہ سے شہہ مل رہی ہے۔

کہنے لگے ''آپ ان کو بلائیں یہ آپ کے بچے ہیں، ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں نے کہا اچھا ان سب کو اندر آنے دو۔ ان سب نے ایک ہی دن میں استعفے دے دیئے تھے۔ میں نے سب استعفے منظور کر لیے۔ میرا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ اگر کوئی کہتا ہے کہ میں استعفیٰ دے رہا ہوں تو میں نے کبھی اس کو روکا نہیں۔ میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پوچھتا بھی نہیں ہوں۔ ایک بندہ کام نہیں کرنا چاہتا تو یہ اس کا حق ہے۔ اس کو زیادہ پیسے مل رہے ہیں یا دوسری جگہ جانے میں اس کی بہتری ہے تو اس کو کہنے کا فائدہ ہی نہیں کہ آپ نہ جاؤ۔ احتجاج کرنے والے پچاس ساٹھ لوگ تھے۔ پہلے اُنھوں نے استعفے دیئے، بعد میں جلوس نکال لیا۔ امتنان صاحب نیچے گئے اور گیٹ والوں کو کہا کہ ان کو اندر آنے دو چونکہ وہ استعفیٰ دے چکے تھے اس لیے اندر نہیں آسکتے تھے۔ لہٰذا وہ خود جا کر انھیں اندر لے کر آئے۔ پھر وہ اوپر میرے پاس آئے اور کہنے لگے آپ بڑے ہیں معاف کردیں۔ جس دن جلوس نکلا تھا اسی دن چھ بجے ان کے استعفے واپس ہو گئے اور وہ کام پر واپس آ گئے۔

☆ جس جلوس کی آپ بات کر رہے ہیں کہا جاتا ہے کہ اسی جلوس سے ریگل میں امتنان شاہد صاحب نے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں اپنی گاڑی بیچ کر آپ کو تنخواہیں دوں گا؟

o اگر اُنھوں نے اپنی گاڑی بیچ کر تنخواہ دینی تھی تو ان کو چاہئے تھا کہ وہ دے دیتے۔ ویسے وہ گاڑی بیچیں گے کیسے؟ ان کی گاڑی لیز پر ہے۔

☆ چینل فائیو اٹھا ہی نہیں یا بیٹھ گیا ہے۔۔۔؟

o اٹھا ہی نہیں ہے۔ دراصل میں نے پنجاب بینک کے حوالے سے بتایا کہ جیسے ایک منصوبے کی پلاننگ کی جاتی ہے کہ اتنے پیسے کی مشینری ہوگی اور اتنا پیسہ رننگ فنانس کے طور پر لگایا جائے گا۔ رننگ فنانس کا ہمارے پاس ایک روپیہ بھی نہیں تھا کیونکہ بینک سے بقایا اقساط ہی نہیں ملیں۔ ہمارا بینک آف پنجاب سے جو بنیادی طور پر معاہدہ طے پایا تھا وہ پچیس کروڑ روپے کا تھا۔ میں نے پچیس کروڑ کا ہی معاہدہ میاں منشاء (ایم سی بی) سے کیا تھا۔ بعد میں مجھے دوستوں نے ہی کہا کہ پنجاب بینک زیادہ سہولتیں دیتا ہے اور ان کا مارک اپ بھی کم ہے۔ اور پنجاب بینک سے ہم نے ایسے ہی قرضہ نہیں لیا۔ اپنی جائیداد ضمانت کے طور پر گروی رکھی۔

☆ چینل فائیو کے بیٹھنے میں کیا یہ وجہ بھی شامل نہیں کہ ایک بندے کا ایک دن پتہ چلتا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے کہ وہ کرنٹ افیئرز، نیوز یا پروگرام کا ڈائریکٹر ہے اور اگلے دن علم ہوتا ہے کہ وہ فارغ ہو گیا ہے؟

o ہو سکتا ہے کہ یہ بھی ہو کیونکہ مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں کیونکہ میرا براہ راست چینل فائیو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

☆ شروع دن سے ہی؟

o ہاں شروع دن سے ہی۔ یہ بہت ہی نازک (Delicate) سی بات ہے۔ میں دراصل یہ چینل سرمائے کے بغیر شروع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ سامان تو آ گیا ہے ٹیسٹ ٹرانسمیشن بھی ہو گئی ہے لیکن سٹاف کے لیے پیسے ہیں نہ پروگرامنگ کے لیے جبکہ سافٹ ویئر کیلئے کم از کم دوگنا سرمایہ چاہئے اور اصل پیسے ہی وہاں خرچ ہوتے ہیں۔ اس صورتحال کے مدنظر میں ذاتی طور پر چینل کے حق میں نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے بیٹے کو آگاہ کر دیا کہ میرے خیال میں چینل شروع نہیں کرنا چاہئے۔ سامان کو بند پڑا رہنے دو اور اس کی قسطیں دیتے رہو۔ کیونکہ یہ انٹرایکٹو پرائیویٹ لمیٹڈ کا پراجیکٹ ہے لبرٹی پیپرز کا نہیں۔

انٹرایکٹو پرائیویٹ لمیٹڈ میں میرے بیٹے، بیٹی کے علاوہ پانچ چھ اور پارٹنرز ہیں۔ مجھے تو انھوں نے اعزازی طور پر چیئرمین بنایا ہوا ہے۔ لیکن میرا براہ راست چینل کے معاملات سے تعلق نہیں ہے۔ ویسے بھی ایک آدمی دو کمپنیوں کا ایم ڈی یا چیف ایگزیکٹو نہیں بن سکتا۔ اور دوسرا میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا۔ کچھ میری صحت بھی خراب ہے اور میں ان کو زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ میں دفتر بھی پانچ چھ گھنٹوں کیلئے آتا ہوں۔

اسی دفتر کو میں نے اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے بھی دیئے ہیں لہٰذا میں ''خبریں'' کے علاوہ ایک اور مصیبت سر پر لینے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن ان کا یہ فیصلہ تھا کہ چونکہ لیزنگ اماؤنٹ کی قسطیں دینی ہیں اس لیے ہم چینل کو Low Key شروع کر دیتے ہیں۔ اگر شروع نہیں کرتے تو قانونی طور پر بینک سامان واپس لینے کا حقدار ہو گا۔ بینک کہہ سکتا ہے کہ جب پراجیکٹ ہی نہیں چل رہا تو مشینری آپ نے کیوں رکھی ہوئی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے۔ لہٰذا ایک مجبوری کے تحت اُنھوں نے چینل شروع تو کیا لیکن اسے صحیح طریقے سے چلا نہیں سکے۔ ویسے اب تو میرا خیال ہے کہ معاملہ ٹھیک ہے چونکہ اس کی آمدن اور لاگت برابر ہو گئے ہیں۔

☆ آپ کی بیگم اور بیٹی کی میں نے کسی بندے سے بدتعریفی نہیں سنی۔ آپ کی ذاتی صلاحیتوں کے بھی لوگ بہت معترف ہیں۔ بے شمار لوگ جو آپ کے ادارے میں کام کرتے رہے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ گالیاں بہت دیتے ہیں۔ بہت گالم گلوچ کرتے رہے ہیں اور امتنان صاحب بھی ایسے ہی کرتے ہیں؟

o امتنان صاحب کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ میں ان کے کمرے میں نہیں بیٹھتا کہ وہ کیا کرتے ہیں، کیا نہیں کرتے، گالیاں دیتے ہیں یا نہیں۔

☆ آپ گالیاں نہیں دیتے؟ لوگ کہتے ہیں کہ ضیاء صاحب بہت غصے میں آجاتے ہیں۔۔۔؟

o غصے میں آنا اور بات ہے۔

☆ اپنے آپ کو اور اگلے کو بھی بہت گالیاں دیتے ہیں؟

o اصل میں جب آدمی کو ایک سفر طے کرنا ہو اور اس میں کوئی کوتاہی محسوس کرے تو پھر ایسا ہو جاتا ہے۔ مجھے غصہ صرف جھوٹ بولنے پر آتا ہے۔ میری ساری ناراضگی کارکنوں سے صرف اور صرف ایک بات پر ہوتی ہے۔ ایک آدمی بڑی سے بڑی غلطی کر دے لیکن وہ کہہ دے کہ جی غلطی ہو گئی۔ چلیں جی ٹھیک ہے۔ آپ اِسے سو روپے کا ٹوکن جرمانہ کر دیں گے، چاہے آپ کو لاکھوں کا نقصان ہو گیا ہو، بہرحال بات ختم ہو گئی۔ لیکن ایک آدمی کی کسی جگہ کوریج کیلئے ڈیوٹی لگتی ہے وہ وہاں پہنچتا ہی نہیں ہے اور اِدھر اُدھر سے سن کر دو چار لائنیں لکھ کر دے دیتا ہے۔ میں بہت باریکی سے اخبار پڑھنے والا آدمی ہوں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ دوسرے اخبار میں خبر کا یہ بھی وہ بھی حصہ چھپا ہوا ہے۔ ہمارے اخبار میں نہیں ہے۔ میں متعلقہ بندے سے پوچھتا ہوں کہ ''تم وہاں گئے تھے''۔ وہ کہتا ہے؟ ''ہاں جی گیا تھا''۔ میں کہتا ہوں ''تم گئے ہی نہیں، یہ جو رواروی میں چیزیں لکھی ہوئی ہیں یہ تم نے کسی سے سن کر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لکھی ہیں، تم وہاں موجود نہیں تھے۔"

بعد میں وہ بڑی مشکل سے مانتا ہے "نہیں جی وہ میرا موٹر سائیکل خراب ہو گیا تھا۔"

پھر وہ کہتا ہے:

"نہیں جی میں پہنچ تو گیا تھا لیکن اس وقت تک وہ تقریب ختم ہو چکی تھی۔"

بھئی ختم ہو گئی تھی تو وہ نہ پہنچنا ہی ہوا؟

تو اس طرح جو بندہ جھوٹ بولے اس پر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم نے میرا پون گھنٹہ تو اس سوال و جواب میں ضائع کیا ہے۔ ایک تو جھوٹ بولا ہے پھر اپنا اور میرا ابھی وقت ضائع کیا ہے۔ ہاں غلطی تو ہر بندے سے ہوتی ہے۔ میں کام کروں تو کروڑ غلطیاں ہوتی ہیں۔ ہر انسان سے ہوتی ہیں۔ اس دفتر میں ابھی آپ آئے ہیں۔ دفتر تو بہر حال چل رہا ہے۔ تو اس برآمدے، بلکہ پورے ایگزیکٹو فلور پر آپ نے کسی کو اونچی آواز میں بات کرتے سنا ہے؟

انٹرویورر: بالکل نہیں بہت پرسکون ہے۔ میں خود حیران ہوں جس شائستگی اور مہذب طریقے سے آپ مجھے ڈیل کر رہے ہیں۔

☆ یہ بات بھی کی جاتی ہے کہ آپ کا یہ جو گالم گلوچ یا تھوڑا غصے میں آنا ہے۔ شاید لاشعوری طور پر آپ میر شکیل الرحمن کو کاپی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گاڑی کا نمبر بھی شاید آپ انھی کی طرح کا لیتے ہیں؟

o نہیں، گاڑی کا نمبر تو میرا نمبر ہے (ہنستے ہوئے) اصل میں میرے گھر کا نمبر پانچ ہے۔ خبریں کیلئے جو پہلا دفتر تھا وہ پنج مال روڈ تھا۔ ہم کوئی وہمی لوگ نہیں ہیں۔ شروع سے ہی ہمارے گھر میں ایسے ہی مذاق میں بات چلی جی پانچ نمبر لے لو، چنانچہ شروع میں پانچ نمبر لیتے رہے۔ پھر ایک سے لیکر دس تک سرکاری نمبر ہو گئے۔ پھر ہم نے 500 کا نمبر لینا شروع کر دیا۔ شکیل الرحمن کی کاپی محنت میں ضرور کرنی چاہئے۔

☆ کہتے ہیں کہ وہ بھی گالم گلوچ اور سٹائل۔۔۔۔۔۔

o وہ کافی گالم گلوچ کرتے ہیں لیکن وہ گالیاں اپنے آپ کو زیادہ دیتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ اعظم سہروردی آپ کے پارٹنر تھے، کالم لکھتے تھے اور آپ کے وکیل تھے، آپ لوگ اتنے سال اکٹھے رہے۔ جب علیحدہ ہوئے تو آپ ان کی فیملی کی تصویریں چھاپتے رہے۔ کیا یہ مناسب طریقہ تھا؟

○ نہیں، یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن ادلے کا بدلہ ہوتا ہے، بعض اوقات یہ دوسرے فریق کے رویے پر منحصر ہوتا ہے۔ سولہ سال وہ یہاں رہے۔ ہم انھیں لاکھ روپیہ مہینہ دیتے تھے۔ سولہ سال بڑی مدت ہوتی ہے۔ ان کا دفتر تھا۔ ان کا بڑا بیٹا مزمل یہاں کام کرتا تھا۔ چینل میں بھی کام کرتا تھا۔ ان کا چھوٹا بیٹا مصدق سلطان اوپر پوسٹ میں کام کرتا تھا۔

اعظم صاحب اچانک کسی ذاتی بات پر ناراض ہو گئے اور مجھے لکھ کر دے دیا کہ میں ابھی استعفیٰ دے دوں یا تین چار دن بعد دوں۔ تو میں نے گھنٹی دے کر کسی کو کہا ''یار اعظم صاحب کو ذرا لانا وہ استعفیٰ لکھ کر دے گئے ہیں۔ جاتے جاتے اُٹھتے ہوئے کاغذ لکھ کر دے گئے ہیں اور پھر فوراً چلے گئے ہیں'' تو اس نے کہا جی وہ تو دفتر سے چلے گئے ہیں۔ میں نے سوچا اچھا چلو کل آجائیں گے لیکن تھوڑی دیر بعد پتہ چلا ان کے بیٹے مزمل صاحب چینل فائیو پر پروگرام ''آج پاکستان میں'' کے سیٹ پر میزبان کے طور پر بیٹھے ہوئے اٹھ گئے ہیں اور انھوں نے کہا ہے کہ میں آج پروگرام ریکارڈ نہیں کراؤں گا۔ اس کے بعد مصدق صاحب چلے گئے اس کے بعد ان کے ڈرائیور نے کہا کہ جی میں یہاں کام نہیں کروں گا مجھے اعظم صاحب نے بلا لیا ہے۔ پھر ان کے منشی اور سٹینو نے کہا کہ ہم جا رہے ہیں۔ چنانچہ چھ آدمی اگلے پندرہ منٹ میں دفتر سے چلے گئے۔ چلیں یہ ان کا ذاتی مسئلہ تھا میں کبھی ان کو کچھ نہ کہتا باوجود اس کے انھیں چارج دیکر جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ ہمارے لیگل ایڈوائزر تھے۔ کالم بھی لکھتے تھے۔ وہ کمپنی کے باقاعدہ ملازم تھے۔ خبریں کے آفس میں ہی نیچے ہم نے ہیومن رائٹس سوسائٹی بنائی ہوئی ہے۔ اس کا کل بینک بیلنس شاید پچاس یا پچیس ہزار روپے ہوگا۔ وہ سوسائٹی چندے پر چلتی تھی۔ شاید نو سو یا ہزار اس کا سالانہ چندہ تھا۔ اسی چندے سے سوسائٹی میں کام

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کرنے والے افراد کی تنخواہیں نکل آتی تھیں۔ ''خبریں'' سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ ہم نے اس کے دفتر کیلئے جگہ دی ہوئی تھی۔ اچھا شام سے پہلے مجھے ٹیلی گرام، ٹیلیکس اور فیکس میسج آنے شروع ہو گئے کہ آپ نے ہیومن رائٹس سوسائٹی کے اکاؤنٹس میں کروڑوں کا فراڈ کیا ہے اور پھر بنک منیجر کے نام ان کے لکھے گئے خط کی فیکس کاپی آئی کہ سوسائٹی کے اکاؤنٹس کی ٹرانزیکشن روک دی جائے چونکہ ان میں کروڑوں کی خرد برد ہوگئی ہے۔ تو کروڑ روپے تو اس کی ساری زندگی میں جمع ہی نہیں ہوئے تھے۔ رات کو میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ اتنی جلدی اتنے مشتعل کیوں ہو گئے ہیں۔ اگلے دن پتہ چلا اُنھوں نے مجھ پر اور میری بیٹی پر فراڈ کا کیس کر دیا ہے۔ یہاں سے پھر ہماری لڑائی کا آغاز ہوا اس طرح بیٹیوں یا خواتین کو لڑائی میں لانے کی روایت پہلے اُنھوں نے ڈالی۔ ان کے جانے کے بعد پتہ چلا کہ اپنی بیگم صاحبہ کے نام پر اُنھوں نے جعلی شیئرز بنائے۔ جاتے ہوئے ہماری بہت سی ضروری فائلیں اٹھا کر لے گئے۔ جس پر ہم نے الگ کیس بھی کروایا۔ اس طرح زندگی میں ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات بعض لوگ کسی وجہ سے خفا ہو جاتے ہیں۔

☆ ان کا مؤقف یہ تھا کہ اُنھوں نے آپ اور امتنان صاحب کی چپقلش میں تصفیے کے دوران آپ کی سائیڈ لی اور چونکہ عملی طور پر آپ کمزور ہو چکے تھے، لہٰذا جب آپ کی فیملی کی آپس میں صلح ہوئی تو آپ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کو فارغ کر دیا جائے؟

○ نہیں، ایسی بات نہیں۔ اُنھوں نے اپنی مرضی سے ادارہ چھوڑا۔ اپنے ہاتھ سے لکھا کہ میں چھوڑنا چاہتا ہوں اور ان کی بنیادی وجہ بالکل مختلف تھی۔ بنیادی وجہ بنک کیس ہی تھا۔ ہمیں بنک کے نوٹس آ رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ہم بھی قانونی طور پر کچھ کر سکتے ہیں۔ بنک نے ہمیں پورے پیسے ہی نہیں دیئے۔ اوپر سے پچھلے پیسے مانگ رہا ہے۔ ہمارا تو اُنھوں نے پراجیکٹ خراب کر دیا ہے۔ اعظم صاحب نے اس سارے کیس کو بڑی اچھی طرح پڑھا اور کہا کہ اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ آپ کو چودہ کروڑ دینے پڑیں گے۔ میں نے کہا جی کہ بینکنگ کورٹس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوتی ہیں ہم بھی تو اپنا معاملہ لے کر کہیں جا سکتے ہیں؟ اُنھوں نے کہا نہیں جا سکتے۔ اس کے بعد میں نے انہیں کہا نہیں جا سکتے تو ٹھیک ہے۔ اس کے بعد میں نے کچھ اور لوگوں سے مشورہ کیا تو اُنھوں نے کہا کہ جس طرح پنجاب بنک نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے آپ الٹا ان پر کیس کریں کہ ایک تو آپ کو پورے پیسے نہیں دیئے اور دوسرا آپ پر کیس کر رہے ہیں۔ اس وقت پنجاب بنک ہمیں نوٹس بھجوا رہا تھا۔ کیس تو اُنھوں نے ہم پر بعد میں کیا۔ جب میں نے کچھ لوگوں سے مشورہ کیا تو اُنھوں نے مجھے ایک وکیل صاحب کا نام بتایا کہ یہ بینکنگ معاملات میں ٹاپ کے وکیل ہیں۔ آپ ان سے مشورہ کریں۔ وکیل صاحب نے کہا کہ میں اس حساب سے فیس لوں گا اور آپ کے کیس میں بہت وزن ہے کیونکہ صرف مشینری سے آپ کا پراجیکٹ چل ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا ان وکیل صاحب نے کیس کر دیا۔ اس پر اعظم صاحب بہت ناراض ہوئے کہ میں لیگل ایڈوائزر ہوں میری موجودگی میں آپ نے باہر سے کیس کیوں کروایا اور اس کو اتنے پیسے کیوں دیے، فیس کیوں دی؟ لہٰذا میں نے ان سے کہا جب آپ نے خود ہی انکار کر دیا تھا۔ تو میں نے ایسا ہی کیا۔ اس سارے قضیے کی بنیادی وجہ یہ تھی۔

☆ آپ نے کہا کہ کارکنوں نے جو جلوس نکالا تھا اس کے پیچھے ایک شخص تھا۔ وہ شخص اعظم سہروردی تو نہیں تھے؟

o نہیں! اس جلوس کا اعظم صاحب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

☆ آپ نے خبریں، پوسٹ، سندھی اخبار خبرون، خبراں اور سرائیکی اخبار نکالنے کا بھی اعلان کیا لیکن کیا وجہ ہے سارے پراجیکٹس پنپ نہیں سکے۔ پوسٹ تو اچھا خاصا نکلنا شروع ہوا پھر وہ بیٹھ گیا؟

o دراصل 'پوسٹ' تو میں نے عدنان شاہد صاحب کی وفات کی وجہ سے بند کیا تھا۔ عدنان صاحب نے اسے بہت اچھا نکالا تھا اور اس کی اٹھان بہت اچھی تھی۔ اس کی لے آؤٹ اور میک اپ بھی بہت اچھا تھا۔ لیکن امتنان صاحب چینل میں مصروف ہو گئے تھے اور پوسٹ بالکل یتیم ہو گیا۔ نسیم احمد صاحب وہاں ہوتے تھے اور ان کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عالم یہ تھا کہ وہ کہیں پڑھانا شروع ہو گئے اور یہاں شام کو دو گھنٹے کے لیے آتے اور وہ بھی سرخیاں دیکھ کر چلے جاتے تھے۔ تو جب ہم نے دیکھا کہ بھئی اس کا والی وارث ہی کوئی نہیں تو میں نے کہا اس کو بند کر دیا جائے یہ زیادہ بہتر ہے۔ اخبار یا تو چلانا چاہیے یا بند کر دینا چاہیے۔

☆ پنجابی کا خبراں اور سندھی کا خبرون، وہ کیسا تجربہ رہا؟

o خبرون تو اب بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔

☆ وہ منافع میں چل رہا ہے؟

o ٹھیک چل رہا ہے۔ 'خبراں' میں نے بند کر دیا تھا۔ پنجابی میں پرچہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

☆ وجہ؟

o پنجابی ریڈر شپ نہیں ہے؟

☆ اس کی کیا وجہ ہے؟

o اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجابی ہم اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں اور اردو رسم الخط میں پنجابی کا تلفظ ٹھیک نہیں ہے۔ پنجابی حقیقتاً تو گرمکھی میں لکھنی چاہیے۔ جس طرح مشرقی پنجاب میں اخبار نکلتے ہیں وہ ڈیڑھ، دو لاکھ چھپتے ہیں اور وہ اخبار گرمکھی میں چھپتے ہیں۔

☆ ساؤنڈ تو انگریزی زبان میں بھی بعض الفاظ کی ان کے حروف کے مطابق نہیں؟

o ہاں لیکن پنجاب میں پنجابی بولتا تو پنجابی ہے لیکن پڑھتا اُردو ہے۔

☆ پنجابی کی پنجابی کے ساتھ کمٹ منٹ نہیں ہے۔

o بالکل بھی نہیں بلکہ نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کوئی تھوڑا سا پڑھا لکھا گھرانہ دیکھ لیں وہاں کوئی بچوں کو پنجابی نہیں سیکھنے دیتا۔ وہ اردو یا انگریزی پر بچوں کو لگاتے ہیں۔

☆ ''خبراں'' آپ نے کاروباری نقطہ نظر سے نکالا تھا یا پنجابی زبان۔۔۔

o میں نے تو پنجابی زبان کیلئے نکالا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ زبان کے طور پر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس کے پڑھنے والے نہیں ہیں۔ فرض کریں ''خبریں'' کی سرکولیشن نوے ہزار ہے۔ اور ''خبراں'' کی سرکولیشن دو ہزار ہو اور اس میں سے بھی 1200 کاپیاں بکتی ہوں اور آٹھ سو واپس آجاتی ہوں اور جب آپ کی کوشش کی پذیرائی نہ ہو تو آدمی مایوس ہو جاتا ہے۔ چار کلرز میں ہم بہت خوبصورت اخبار چھاپتے تھے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ باہر اس کی بالکل اہمیت نہیں تو پھر اس کو بند کر دیا۔

☆ جنوبی پنجاب میں آپ نے سرائیکی کے معاملے کو بہت اٹھایا تھا۔ اس میں آپ کے کاروباری مفادات تھے یا کیا مسئلہ تھا؟

o (تھوڑا توقف سے) ہمارے کاروباری مفاد کیا ہونگے؟ یا کیا ہو سکتے ہیں؟ وہاں ہمارا اخبار نمبر ون پر تھا، ابھی بھی ہے۔ خبریں پاکستان میں دو جگہ پر ہی نمبر ون ہے ایک مظفر آباد آزاد کشمیر میں جہاں دوسرے پر اوصاف ہے، تیسرے نمبر پر نوائے وقت اور چوتھے پر جنگ ہے۔ یہ صورتحال سارے آزاد کشمیر میں ہے۔ ملتان میں پہلے نمبر پر خبریں ہے دوسرے نمبر پر نوائے وقت، تیسرے نمبر پر جنگ اور چوتھے نمبر پر ایکسپریس ہے۔

چونکہ جنوبی پنجاب میں خبریں کی سب سے زیادہ سرکولیشن ہے لہٰذا اس میں لوگوں کی رائے دینا ضروری ہے۔ وہاں لوگ چاہتے ہیں۔ اب تو ساری جماعتوں والے مان گئے ہیں یہاں تک کہ ''ن لیگ'' والے بھی سوچ رہے ہیں کہ اچھے طریقے سے کہہ ہی دیں۔

☆ کیا عملی طور پر آپ آج کل او ایس ڈی ہیں؟ یعنی عملاً آپ اخبار سے منسلک نہیں ہیں؟

o کیوں نہیں ہوں۔ جو ایڈیٹر کے فرائض ہوتے ہیں وہ دیکھتا ہوں۔ ایڈیٹوریل کی پالیسی لائن میں دیتا ہوں۔ رپورٹرز کی میٹنگ کے نوٹس میں دیتا ہوں البتہ انتظامی امور (Execution) چونکہ زیادہ وقت لیتے ہیں اس لیے یہ کام امتنان صاحب سے کرواتا ہوں۔ میں عام طور پر اخبار میں بھی کوئی غلطی دیکھتا ہوں تو اس پر نشان لگا کر ان کو بھیج دیتا ہوں۔ اُنھوں نے جو ایکشن لینا ہے لیں مثلاً آگے لیٹر لکھنا،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بندے کو پوچھنا، اس سے جواب لینا وغیرہ، میں اس طرح کے دیگر امور میں نہیں پھنستا۔ لیکن چیف ایڈیٹر ہمیشہ چیف ایڈیٹر ہوتا ہے۔

☆ آپ کا ضمیر بطور ضیا شاہد اور صحافی مطمئن ہے؟

○ کوئی بھی آدمی پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادی وجہ ہے کہ میں خاص کر ذاتی طور پر اپنی پریشانیوں اور دکھوں سے متاثر ہوا ہوں۔ میری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ میری ریڑھ کی ہڈی کے دو آپریشن ہوئے ہیں۔ میرے گردے ٹھیک طریقے سے کام نہیں کر رہے اور ظاہر ہے مجھے چلنے پھرنے میں بھی دِقت ہوتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھنے میں بھی دِقت ہوتی ہے۔ میں جسمانی طور پر اتنی محنت نہیں کر سکتا، جتنی میں کر سکتا تھا۔ میں زیادہ، آجا اور متحرک بھی نہیں رہ سکتا۔ اس کے باوجود میں اپنے اوپر بہت پابندی لگا کے رکھتا ہوں کہ آدمی بالکل ہی عضوِ معطل نہ بن جائے۔ میں ملتان اور پنڈی جاتا رہتا ہوں۔ ہوائی جہاز پر نہیں جاتا کیونکہ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں تو عام طور پر پھر میں بذریعہ سڑک جاتا ہوں۔

☆ کیا میڈیا آزاد ہے؟

○ میڈیا آزاد تو نہیں ہے۔ لیکن میڈیا پر پابندیاں حکومت کی طرف سے نہیں ہیں۔ مختلف سیکشنز کی طرف سے ہیں مثال کے طور پر آزاد میڈیا تو تب ہو جب اخبار وہ لکھے جو بالکل سچ سمجھتا ہے اور پھر اس پر کوئی اثر انداز نہ ہو۔ اگر ایک اخبار (جنگ) میں کسی کا نام نہیں لیتا فرض کریں وفاقی حکومت کی مخالفت کر رہا ہے۔ اور وفاقی حکومت نے اس اخبار کے مکمل اشتہار بند کر رکھے ہیں اور پچھلے دو ڈھائی سال سے کیے ہوئے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پورا آزاد تو نہیں ہے۔ اس پر تھوڑا پریشر تو ڈالا ہوا ہے کہ بھئی پیسے چاہئیں تو ہماری طرف آؤ۔ لہٰذا اس کو آزادی تو نہیں کہتے۔ وہ تو ان کی ہمت ہے کہ وہ ایک بڑا ادارہ ہے اور ان کے دیگر ذرائع آمدن بھی ہیں اور مستحکم ادارہ ہے۔ اس لیے وہ برداشت کر رہے ہیں ورنہ تو یہ صورتحال کسی اخبار کے لیے بہت مشکل ہوتی ہے۔

☆ مارکیٹ فورسز کسی اخبار پر کتنا اثر انداز ہوتی ہیں؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o بہت اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر سب سے زیادہ وہ اشتہار سیلولر کمپنیوں کے ہیں۔ مجھے بہت لوگوں نے کہا ہے کہ ان کے خلاف لوگوں کو جو شکایات ہیں وہ اخبار میں نہیں چھپتیں۔

o

کالم نگار اور کالم نگاری

کسی اخبار کی کامیابی اور مقبولیت میں ادارتی صفحات کا کردار تسلیم شدہ امر ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہمارے ہاں گزشتہ ایک دہائی میں الیکٹرانک میڈیا کی ترقی کے باوجود کالم اور کالم نگاروں کی اہمیت مسلمہ رہی۔ کالم اپنے دامن میں بے ساختگی، تازگی، سادگی، روانی اور سلاست لئے ہوتا ہے اور اگر فراست کا تڑکا بھی لگ جائے تو سبحان اللہ!

بے جا معلومات اور اعداد و شمار کا ٹھونسنا نہ صرف قاری پر گراں گزرتا ہے بلکہ کالم کو بوجھل بھی بنا دیتا ہے۔ لیکن اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کالم کسی سنجیدہ بحث کا متحمل نہیں ہوسکتا بلکہ غیر جانبدارانہ تجزیہ اور دانشورانہ رائے سازی کالم اور کالم نگار دونوں کی عزت میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔ روزمرہ مشاہدات، پس منظر کا علم، تجزیے کی صلاحیت، مطالعہ، حالات و واقعات پر گہری نظر اور تحریر کی مہارت کسی بھی کالم نگار کو منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، احمد بشیر، ارشاد احمد حقانی، منو بھائی، وارث میر، نذیر ناجی، عطاالحق قاسمی، رفیق ڈوگر، مجیب الرحمن شامی، ضیا شاہد، ہارون الرشید، حمید اختر، عباس اطہر، حسن نثار، حامد میر، جاوید چودھری، ایاز امیر، اردشیر کاؤس جی، زاہدہ حنا، عرفان صدیقی اور سلیم صافی نے کالم نگاری میں بہت نام کمایا۔

کالم نویس نہ صرف اخبار کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کرتے ہیں بلکہ اُن میں سے کئی سیاسی جماعتوں، اُن کے رہنماؤں یا دیگر طاقتور لوگوں کے ایجنڈے کے فروغ میں بھی پیش پیش ہوتے ہیں۔ کچھ اہل قلم نے تو خود کو اس کام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن اسے شخصی صحافت کا نیا انداز بھی قرار دیتے ہیں۔

قارئین اور کالم نگار کے درمیان اکثر ایک تعلق بن جاتا ہے لہٰذا بعض اوقات قاری بھی اپنے پسندیدہ کالم نگار کے ایک سے دوسرے اخبار میں جانے سے اخبار بدل لیتا ہے۔

زمانہ قدیم سے ہمارے ہاں ایک قوم آباد ہے جسے عرفِ عام میں میراثی کہا جاتا ہے۔ میراثیوں کی مختلف اقسام اور درجات ہیں ان میں سے بعض آج کل بھی اپنے خاندانی پیشے کی مختلف جہتوں سے وابستہ ہیں جن میں گانا بجانا بھی شامل ہے۔ ایک زمانے میں درباری گویے بھی ہوتے تھے جو اعترافِ فن پر انعامات و اعزازات سے نوازے جاتے۔ آج بھی کئی گویے خاندان ہمارے ہاں نامور اور معروف ہیں۔

میراثیوں کے نچلے درجے کی ایک قسم 'بھانڈ' کہلاتی ہے۔ حالاتِ حاضرہ پر برجستہ اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

برمحل تبصرہ کرنا یہ لوگ بھی خوب جانتے ہیں۔ بعض اوقات جگتیں کرتے کرتے یہ اتنی باریک بات کہتے ہیں کہ بندہ داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شادی بیاہ کی بعض تقاریب میں آج بھی یہ لوگ اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے فن کی داد پاتے ہیں۔ دیہاتی شادیوں کی تقریب کا یہ جزو لاینفک ہوتے ہیں۔

گو کہ معاشرتی اعتبار سے میراثیوں کو برابری کا درجہ نہیں دیا جاتا مگر یہ لوگ اپنا خاندانی کام اُسی پیشہ ورانہ اعتماد سے کرتے ہیں۔ جس طرح کوئی اور فرد، گروہ یا قبیلہ۔ پرانے زمانے میں میراثی دیہی کلچر میں بہت اہم کردار ادا کرتے تھے۔ انہیں گفتگو پر ملکہ حاصل ہوتا تھا اور مشکل صورتحال میں بھی بات کرنے کا سلیقہ اور فن جانتے تھے۔ ان لوگوں پر زمیندار بہت اعتماد کرتے تھے اور ان کی آل اولاد کے رشتے ناتے بھی یہی لوگ طے کرتے تھے۔ لہٰذا اس حوالے سے ان کا انکار یا اقرار ہی غالباً حتمی قرار پاتا کیونکہ ان لوگوں کو بہت جہاں دیدہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ زمینداروں کے سامنے سیس نواتے، اُن کا شجرہ نسب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے، انہیں ڈھیروں دعائیں دیتے ہیں، جیسے ''بادشاہیاں قائم رہن، بھاگ لگے رہن، مولا خوش رکھے، چودھری دی آل اولاد دی خیر!'' اہل فن کا نعرہ ہے ''جس کا کھایئے اُسی کے گن گایئے۔'' زمیندار بھی ان لوگوں کو عزت سے دادا یا میر عالم کہتے اور میراثی ان سے اپنا حق سمجھ کر 'مان تران' سے مانگتے۔ دیہاتی زندگی کی زوال پذیری کے باوجود اب بھی یہ لوگ یا ان کی باقیات مل جاتی ہیں اور ایک دنیا ان کے بے مثل فن سے آگاہ ہے۔

بعینہٖ ان لوگوں کی ترقی یافتہ اقسام کچھ کالم نگاروں کی صورت آج بھی موجود ہیں جو جا بجا اپنے سرپرستوں کے مفاد کی ترویج، دفاع، قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور ان میں سے بعض تو اب بھی محض کھانا کھا کر کسی صاحب ثروت کی شان میں کالم لکھ دیتے ہیں البتہ کچھ نے وقت کے ساتھ اپنا ریٹ بڑھا لیا ہے اور وہ میڈیا منڈی میں رائج الوقت قیمت وصول کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسا مؤثر اور نمایاں فورم یا پلیٹ فارم نہیں جہاں میڈیا کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہو۔ ہاں البتہ جزوی طور پر یا انفرادی سطح پر تجزیہ سامنے آتا رہتا ہے۔ اسی طرح کالم نگاروں کی تحریروں کا جائزہ اور ان کے حسن و قبح پر تبصرہ کم ہی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سامنے آتا ہے۔ چند برس قبل ایک ضخیم کتاب ''کالم نگاروں کی قلابازیاں'' کے نام سے ڈاکٹر محمد فاروق نے مرتب کی جس میں نامور کالم نگاروں کی اپنی ہی تحریروں کا موازنہ کر کے اُن کے موقف کے تضاد اور کہہ مکرنیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ کتاب منتخب کردہ کالم نگاروں کے ''فنی تجزیے'' کی اچھی کوشش تھی لیکن ایک تو محض پانچ کالم نگار تجزیے کے لیے چنے گئے اور دوسرا یہ کہ غالب پہلو صرف ان کی تحریروں کے تضادات اور موقف کی تبدیلی کو نمایاں کرنا تھا لہٰذا کتاب کے مطالعے سے مختلف جہتوں پر تنقیدی تجزیے کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں زیرِ بحث کالم نگار جواب میں اپنے مؤقف کی تبدیلی کو وقت اور حالات کے مطابق نقطہ نظر اپنانے پر منطبق کر سکتے ہیں۔ ایک زمانے میں کالم نگار اپنا ذکر کرنے سے اجتناب برتتے تھے مگر وقت اور حالات بدلنے کے ساتھ یہ روش انہوں نے بھی ترک کر دی۔ معروف دانشور اور استاد ڈاکٹر مہدی حسن کہتے ہیں:

''میں نے پہلی دفعہ 1961ء میں ایک سنجیدہ مضمون لکھا اور 'امروز' کے نیوز ایڈیٹر حمید ہاشمی مرحوم کو دیا۔ اُنھوں نے کہا: ''آپ نے اس مضمون میں تین دفعہ لفظ 'میں' لکھ کر اپنا ذکر کیا ہے۔ ہم اخبار آپ کی تشہیر کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے لیے چھاپتے ہیں۔ اس مضمون سے یہ 'میں' نکال دیں''۔ اس کے بعد اب تک میں اردو انگریزی میں تقریباً پانچ ہزار مضمون لکھ چکا ہوں مگر آج تک اپنا ذکر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ایسے واقعات جو بہت اہم تھے اور میں ان کا چشم دید گواہ تھا ان کو بھی تھرڈ پرسن کے حوالے سے لکھا۔ آج کا کالم شروع بھی 'میں' سے ہوتا ہے اور ختم بھی 'میں' پر۔ کوئی بھی کالم اُٹھا کر دیکھ لیں یہی لکھا ہوگا کہ:

''میں وزیرِ اعظم کے ساتھ جہاز میں بیٹھا تھا، انھوں نے میرے کان میں سرگوشی کی۔۔۔''

''میں شام کو چیف آف آرمی سٹاف کے پاس بیٹھا تھا انھوں نے مجھ سے یہ کہا۔۔۔''

''میں گورنر صاحب کے ساتھ فلاں سفر یورپ جا رہا تھا تو فرمانے لگے:۔۔۔''

اور بہت سے کالم نویس تو کالم میں اپنی صحت کا بلیٹن بھی لکھ دیتے ہیں''(1)۔

احمد بشیر کہتے ہیں کہ:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''ہمارے استادوں نے سکھایا تھا ''میں'' کا ایک سے زیادہ بار استعمال فحاشی میں شمار ہوتا ہے۔ 'میں' کا لفظ شرفاء کم ہی استعمال کرتے ہیں مگر یہ گناہ تو شہر تمنا میں بلا ناغہ ہو رہا ہے''(2)

باب ہذا میں مختلف کالم نگاروں کے مجموعی تاثر کے حوالے سے تجزیہ یا تبصرہ کیا گیا ہے۔ جزوی طور پر کسی بھی صاحب قلم کی کوئی تحریر بہت اچھی، متوازن یا پست معیار کی حامل ہو سکتی ہے۔ مزید برآں اچھے سے اچھا کالم نگار بھی ہر روز اچھا کالم نہیں لکھ سکتا۔

جناب عطاالحق قاسمی سینئر ترین کالم نگاروں میں سے ایک ہیں۔ فقرہ چست کرنے اور لکھنے کا فن اُن پر 'ختم' ہے۔ اگر کوئی بروقت اور برمحل فقرہ لکھنا سیکھنا چاہتا ہے تو وہ قاسمی صاحب کو پڑھے۔ پیچیدہ اور مشکل ترین صورتحال میں بھی اپنا مدعا بیان کرنے اور ان کہی کو بھی کہہ جانے کا فن اُنھی کا خاصہ ہے۔ مزاح کی چاشنی، اختصار اور جامعیت ان کی تحریر کا حسن ہے۔ وہ جس قدر ملکہ برجستہ اور بے ساختہ تحریر پر رکھتے ہیں اسی طرح گفتگو بھی شگفتہ کرتے ہیں۔ وہ بول رہے ہوں تو حاضرین کو اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ کھل کھلائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے تعارف کی کئی جہتیں ہیں۔ شاعر ہونے کے علاوہ وہ اعلیٰ درجے کے مزاح نگار ہیں تو کئی سفرناموں کے مصنف بھی۔ انھوں نے خواجہ اینڈ سن، ''شیدا ٹلی'' اور ''شب دیگ'' جیسے یادگار اور مقبول ٹی وی ڈرامے بھی لکھے۔ گو کہ قاسمی صاحب کو دائیں بازو کا کالم نگار سمجھا جاتا ہے مگر بقول شخصے وہ بوقتِ ضرورت بائیں بازو کو بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ ذاتی حوالے سے وہ خاصے روشن اور متوازن خیالات کے حامل ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں اُنھوں نے بتایا:

''تمام مذاہب کی روح ایک ہی ہے اور سب کا بنیادی تصور بھی ایک ہے کہ آپ جو فصل بوئیں گے، وہی کاٹیں گے۔ اس کے علاوہ خدا کا تصور بھی تمام مذاہب میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا کہ یہ جو ہم ہندوؤں کو کہتے ہیں کہ وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو ٹھیک ہے وہ واقعی بتوں کی پوجا کرتے ہیں لیکن حتمی طور پر وہ خدا ہی کو مانتے ہیں، دنیا کے تمام مذاہب خیر کی طرف ہی لوگوں کو بلاتے ہیں۔ راستے ضرور مختلف ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے''۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''مذہب، فلسفے اور سائنس کا آپس میں کوئی جوڑ یا مماثلت نہیں ہے۔ یہ جوڑ لگانا ہی نہیں چاہیے۔ میں تو اس بات کے بھی بہت خلاف ہوں کہ لوگ قرآن مجید میں سے آج کے مادی علوم تلاش کرتے ہیں، سائنسی تھیوریوں کا سراغ لگاتے ہیں۔ ایٹم بم کا فارمولا قرآن سے تلاش کرتے ہیں۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ قرآن حکیم سائنس کی کتاب ہے نہ فلسفے کی''۔

''سائنس کی تھیوریاں اور نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ آج آپ قرآن سے ایک چیز نکال لیتے ہیں، کل کو وہ سائنسی نظریہ غلط ثابت ہو جاتا ہے تو کیا نعوذ باللہ قرآن کو غلط ثابت کریں یا اس میں ترمیم کریں گے''؟ قرآن مذہبی کتاب ہے اور اس کو وہی رہنے دیں جو یہ ہے۔ ایک اور ظلم ہمارے ہاں ہوتا ہے اور وہ ہے طب نبویؐ کے نام پر۔ یہ بتائیں کہ آنحضورؐ کی بتائی ہوئی کوئی دوا اگر کسی مریض کو دی جائے اور اس کو افاقہ نہ ہو تو کیا یہ اچھی بات ہوگی؟ دوسری بات یہ کہ اگر اس سے شفا ہو جاتی ہے تو کیا یہ عمل آنحضورؐ کے مرتبے میں اضافے کا باعث بنتا ہے؟ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ انھیں کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ نعوذ باللہ! آپ انھیں حکمت کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے جو باتیں اپنے بڑے بوڑھوں سے سنیں کہ فلاں چیز کھانی چاہئے اور فلاں نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے، وہی انھوں نے لوگوں کو بتائیں۔ دوسری بات یہ کہ وہاں عرب میں دو تین چیزیں ہی زیادہ ہوتی تھیں مثلاً کھجور، زیتون اور انجیر وغیرہ انھی میں سے ہر چیز کا علاج تلاش کیا جاتا تھا اور بڑے بوڑھے یہی چیزیں کھانے کے لیے کہتے تھے۔ سو یہی بات وہاں تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہاں ایک ڈاکٹر صاحب ہیں، وہ طب نبویؐ کے نام پر ذیابیطس کے مریضوں کو کھجوریں کھلا رہے ہیں چاہے مریضوں کا شوگر لیول کنٹرول سے باہر ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مذہب کی Exploitation ہے اور کچھ بھی نہیں''۔

ادب اور موسیقی سے قاسمی صاحب اپنی فطری وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔

''میں نے آٹھویں جماعت ہی سے ادب میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اسکے علاوہ بھی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ میں بیٹھے بیٹھے میز یا کسی اور چیز پر طبلہ بجایا کرتا تھا۔ گویا ردھم سے آشنائی تھی۔ یہ بھی شاعری سے لگاؤ کا اظہار ہے۔ چنانچہ میں سکول کے بینڈ میں ڈرم بجایا کرتا تھا۔ ویسے اب بھی میں میوزک کی کوئی Beat بجا لیتا ہوں۔ یہ چیزیں فطرتاً میرے مزاج

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کا حصہ ہیں"۔(3

قاسمی صاحب اکثر دعویٰ کرتے ہیں کہ "ایوب خاں، ذوالفقار علی بھٹو، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کے دور حکومت میں حکمرانوں پر شدید تنقید کرتا رہا ہوں"۔(4

قاسمی صاحب کی طرف سے ایوب خاں اور ضیاء الحق کی مخالفت کا دعویٰ محض گپ شپ ہے۔(5 البتہ ضیاء الحق کے سیاہ دور میں جب جمہوریت کی بحالی کے لیے ایم آر ڈی کی تحریک چل رہی تھی تو وہ مزاح کا سہارا لیتے ہوئے اپوزیشن پر طنز کے تیر ضرور برسا رہے تھے۔ 18 اگست 1983ء کو نوائے وقت میں چھپنے والے اپنے ایک کالم "بے بنیاد افواہیں!" میں وہ رقمطراز ہیں:

"ان دنوں ہم نے اپنے لیڈروں کے بارے میں بعض بہت عجیب و غریب خبریں سنی ہیں، مثلاً ہم نے سنا ہے فاروق لغاری اپنے صاحبزادے کی شادی کر رہے ہیں۔ مگر اس موقع پر نہ باجے بجیں گے نہ شہنائیاں بلکہ گھر سے بارات روانہ ہونے سے قبل ایک زبردست احتجاجی جلسہ منعقد کیا جائے گا جس میں اقتدار پر حکومت کے غاصبانہ قبضے کے خلاف تقریریں کی جائیں گی، بعد ازاں دلہن کے گھر کی طرف جاتے ہوئے باراتی مختلف روٹوں کو جانے والی بسوں کو روکیں گے اور سواروں کو باہر نکال کر بسوں کو آگ لگا دیں گے۔ ایک احتجاجی جلسہ دلہن کے گھر پر بھی منعقد ہوگا، جس میں پارٹی کے رہنما تقریریں کریں گے۔ اسی طرح ملک قاسم کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ چند دنوں تک ان کی سالگرہ آنے والی ہے اور سالگرہ کا پروگرام اُنھوں نے یہ ترتیب دیا ہے کہ وہ تیز دھار والا چاقو ہاتھ میں پکڑ کر لہرائیں گے اور پھر علامتی طور پر کیک کاٹیں گے۔ اس موقع پر کسی کو مبارکباد دینے کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ سب حاضرین سنجیدہ چہرے بنا کر تالیاں بجائیں گے۔ اور یہ تالیاں ان کی تقریر کے دوران بجیں گی جو وہ بحالیٔ جمہوریت کے لیے اس موقع پر کریں گے۔ ایک اسی طرح کی افواہ خواجہ خیر الدین کے بارے میں بھی سننے میں آئی ہے کہ موصوف اپنے صاحبزادے کا عقیقہ کر رہے ہیں اور اس موقع پر گھر کے دالان میں فوجی حکومت کے خلاف نعرے لگائیں جائیں گے اور ایک زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا جائے گا۔ اسی طرح شیر باز مزاری کے بارے میں شنید ہے کہ انھوں نے اپنی شادی کی سالگرہ والے دن اپنے گھر میں سیاہ جھنڈیاں لہرانے کا پروگرام بنایا ہے۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''تاہم ہم نے یہ دعا ضرور مانگی ہے کہ خداوندا، یہ ساری افواہیں غلط ہوں یعنی خدا نہ کرے کہ فاروق لغاری اپنی کسی خوشی کی تقریب میں اپنی اور حاضرین کی خوشیاں مٹی میں ملانے کی کوشش کریں یا ملک قاسم اپنی سالگرہ کے دن کو یومِ احتجاج میں تبدیل یا خواجہ خیرالدین اپنے گھر میں منعقد ہونے والی کسی تقریب سعید میں احتجاجی مظاہرہ کروانے کی کوشش کریں یا شیر باز مزاری کسی ایسے روز اپنے گھر میں سیاہ جھنڈیاں لہرانے کا پروگرام بنائیں جو خوشیاں منانے کا دن ہو۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ فعل دانشمندی کی ذیل میں نہیں آتا''۔((6

قبل ازیں 1979ء میں منظرِ عام پر آنے والے ادب پر اپنے سالانہ جائزے میں جن ارشاداتِ عالیہ کا قاسمی صاحب نے اظہار فرمایا، ان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ضیاء الحق کی کس قدر ڈٹ کر مخالفت کی۔ فرماتے ہیں: ''پاکستانی ادب کی کم سے کم شرط یہ ہے کہ وہ مایوسی پیدا کرنے والا نہ ہو۔ پاکستانی عوام کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے والا نہ ہو''۔

''اگر بے لگام ادب کو پھلنے پھولنے کا حق حاصل ہے تو پھر یہ حق آکاس بیل کو بھی ملنا چاہئے۔ یہ آزادی دیمک کو بھی حاصل ہونی چاہئے اور فصلیں اُجاڑنے والے جانوروں کو بھی ان آزادیوں سے ضرور بہرہ ور ہونا چاہئے''۔

''خدا کا شکر ہے کہ پاکستانی ادیبوں کی ایک بڑی تعداد اپنے فرائض سے آگاہ ہے۔ اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آزادی اور مادر پدر آزادی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ چنانچہ اس حوالے سے جب ہم 1979ء کے اردو ادب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں، تو یہ خوشگوار پہلو ہمارے سامنے آتا ہے کہ گزشتہ سالوں کی نسبت اس سال نسبتاً ایسی تخلیقات زیادہ منظرِ عام پر آئی ہیں، جن میں پاکستانی قوم کے عقیدوں اور آدرشوں کی مہک ہے''۔

''ایک خاص واقعہ (بھٹو کی پھانسی) کے ردِعمل میں کچھ ادیب اعتدال کی راہ سے بھی ہٹ گئے اور اُنھوں نے قوم کو شدید قسم کی مایوسی کے انجکشن دیئے، اور ان افسانہ نگاروں اور شاعروں میں بیشتر ''ترقی پسند'' تھے''۔

''تاہم یہ بے اعتدالی افسانے میں زیادہ ہوئی۔ شاعری کی مجموعی فضا اس قسم کے مریضانہ ردِعمل سے بہرحال خاصی حد تک [illegible] رہی!'' (7) قاسمی صاحب کے اس دعوے میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

البتہ کافی سچائی ہے کہ انھوں نے پرویز مشرف کی شدید مخالفت کی۔ اس مخالفت کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ نواز شریف نے انہیں سفارت سے نوازا تھا۔ نواز شریف کی برطرفی کے بعد حقِ وفاداری نبھاتے ہوئے قاسمی صاحب نے سفارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اُن کا یہ فیصلہ ہر حوالے سے قابل تعریف تھا۔ ہوسکتا ہے انھوں نے روایتی سفارت کاروں سے کہیں بہتر سفارت کی ذمہ داریاں نبھائی ہوں چونکہ ان کے منہ سے کون سے پھول جھڑتے تھے جو قاسمی صاحب ان سے پیچھے رہ گئے ہوں، مگر سوال یہ ہے کہ انھیں سفیر کس اصول اور میرٹ کی بنیاد پر لگایا گیا تھا؟ اگر اچھا کالم نگار، شاعر، ادیب اور استاد ہونا شرط تھا تو کیا محض قاسمی صاحب ہی اس میرٹ پر پورا اترتے تھے؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ وفاداری اور قصیدہ گوئی کے صلے میں نوازے گئے تھے۔

لہٰذا سفارت سے فراغت کے بعد وہ دھڑے بندی نبھاتے رہے اور جن اصولوں کی بنیاد پر وہ سفیر بنے تھے، انھی کی بنا پر وہ ڈٹ کر مشرف پر تنقید کرتے اور شریف برادران کی جا بجا قصیدہ گوئی بھی کرتے رہے۔ ان کا کالم خواہ کسی بھی موضوع پر ہوتا وہ اس میں میاں برادران کا ذکر کسی نہ کسی طرح گھسیڑ ہی دیتے۔ 2008ء کے الیکشن میں کامیابی کے بعد ایک دفعہ پھر پنجاب میں مسلم لیگ نواز کی حکومت آ گئی تو قاسمی صاحب کو الحمرا آرٹس کونسل کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ بقول ان کے ''وہ الحمرا کی چیئرمین شپ سے وابستہ تنخواہ سمیت کوئی سہولت نہیں لیتے'' لیکن یہاں پھر وہی پرانا سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لاہور یا پورے پنجاب میں صرف عطاالحق قاسمی ہی اس عہدے کے اہل تھے؟ اس سوال کے جواب میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے۔ جی بالکل وہی اس عہدے کے اہل ہیں کیونکہ شہباز شریف کے ''سلوکے، کاٹن کی پتلون اور گھڑی'' پر خوبصورت کالم بھی تو صرف وہی لکھ سکتے ہیں۔((8

2011ء کے اواخر میں عمران خان کی تحریک انصاف، مسلم لیگ (ن) کے لیے چیلنج بن کر ابھرنے لگی تو بالخصوص جناب قاسمی صاحب اور عرفان صدیقی عجیب و غریب کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ جسے تشنج بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس ہذیانی کیفیت کے زیر اثر قاسمی صاحب نے عجیب و غریب حرکات کیں۔ ان کے بے شمار کالم ان کی مذکورہ کیفیت کی گواہی دیں گے۔ وہ مختلف کالموں میں بات کا آغاز یوں کرتے کہ عمران خان مجھے ذاتی طور پر پسند

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہیں۔ انھوں نے کئی اچھے کام بھی کیے ہیں، جن میں کرکٹ ورلڈ کپ جیتنا، شوکت خانم کینسر ہسپتال بنانا وغیرہ۔ اس کے بعد وہ لیکن، اگر مگر اور چونکہ، چنانچہ کا استعمال کر کے عمران خان کی کھچائی اور شریف برادران کی قصیدہ گوئی کرتے، یہ سلسلہ تا حال جاری ہے بلکہ 2012ء کے اواخر میں طاہر القادری کی پاکستان آمد کے بعد بھی قاسمی صاحب نے اس تکنیک کا اپنے کالموں میں بھرپور استعمال کیا۔ کیونکہ طاہر القادری کا سیاسی اُبھار بھی مسلم لیگ (ن) کے لئے نقصان دہ سمجھا گیا۔

اسی طرح 2014ء کے وسط میں طاہر القادری ایک بار پھر پاکستانی سیاست کے اُفق پر نمودار ہوئے تو قاسمی صاحب اُن کی حد درجہ تضحیک کرتے رہے (ویسے تو اس معاملے میں حکومتی وزرا اور دیگر کچھ کالم نگار بھی پیچھے نہیں رہے) 13 اگست 2014ء کو روزنامہ جنگ لاہور میں اپنے چھپنے والے کالم میں تو انھوں نے ''بدقلمی'' کی حد کر دی۔ لکھتے ہیں:

''قادری صاحب کو شاید یاد ہو کہ امام ابوحنیفہؒ سے حصولِ تعلیم کے دوران میں ان کا کلاس فیلو تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کثر بھری کلاس میں قادری صاحب کو مرغا بنا کر ان کی کمر پر علامہ طاہر اشرفی کو لاد دیا کرتے تھے جس پر ان کی چیخیں نکل جایا کرتی تھیں۔''

ایک من چلے نے یہ کالم پڑھنے کے بعد جملہ کسا کہ ''میں بھی قاسمی صاحب کا کلاس فیلو تھا۔ انھیں بھی مرغا بنا کر مختلف لوگوں کو ان کی پشت پر بٹھایا جاتا تھا۔ مگر وہ اس بات کا ذکر گول ہی کر گئے ہیں۔''

یاد رہے کہ مولانا طاہر اشرفی اور طاہر القادری مختلف مسالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ طاہر القادری کے اندازِ سیاست سے ہزار ہا اختلاف سہی مگر ایسی مزاح نگاری ہرگز قاسمی صاحب کے شایانِ شان نہیں۔ میاں برادران کی مدح سرائی میں عمران اور تحریک انصاف کی بھد اُڑاتے ہوئے بھی ان کا کالم ایسی ہی مضحکہ خیزی کا شاہکار بن جاتا ہے۔ اپنے ایک کالم ''نواز شریف۔ دشمنوں کے درمیان ایک شام'' میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

''عمران خان کے لیے میرے دل میں بہت احترام ہے مگر میری خواہش ہے کہ وہ بھی دوسروں کا احترام کرنا سیکھیں، اپنے ہر بیان میں اپنے ہم عصروں کے لیے وہ ایسی زبان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

استعمال کرتے ہیں جسے نرم سے نرم لفظوں میں غیر مہذب زبان کہا جاسکتا ہے۔ میاں نواز شریف ان کے خصوصی ہدف ہیں، جن کی حب الوطنی کے معترف دوست اور دشمن سبھی ہیں، عمران خان انھیں کرپٹ اور اس کے علاوہ جو منہ میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں"۔(9)

عمران کی بدزبانی کا ذکر کرتے ہوئے قاسمی صاحب، اکتوبر 2011ء میں بھاٹی دروازہ کے جلسہ میں شہباز شریف کی طرف سے صدر زرداری کو اُلٹا لٹکانے اور "گو زرداری گو" کے نعرے یکسر بھول گئے۔ پھر ڈوگر کورٹس کی طرف سے پنجاب میں شہباز شریف کی حکومت ہٹائے جانے کے بعد پنجاب اسمبلی کے باہر احتجاجی جلسے میں منظور وٹو کو "چٹو" بنانے اور رحمان ملک کے حوالے سے اُن کے ارشادات قاسمی صاحب کو بالکل یاد نہ آئے۔ شہباز شریف جا بجا صدر زرداری کے حوالے سے 'زر بابا چالیس چور' کی گردان کرتے رہے۔ مگر اس حوالے سے بھی قاسمی صاحب selective amnesia کا شکار نظر آئے۔

اسی طرح قاسمی صاحب نے "سیاسی جماعتوں کی میڈیا دوڑ" کے عنوان سے ایک کالم لکھا جس کی ابتدا میں انھوں نے تحریک انصاف اور دیگر سیاسی جماعتوں کا تذکرہ کیا کہ وہ میڈیا کا کس طرح بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔ پھر کالم لکھنے کے دوران ہی اچانک انھیں ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط انھیں چکوال سے مسلم لیگ کے ایک ادنیٰ کارکن غلام حسین ازہر نے تحریر کیا تھا۔ انھوں نے فوراً خط کھولا جیسے وہ اسی کے انتظار میں ہوں وہ خط انھیں کالم کے موضوع سے متعلقہ محسوس ہوا لہٰذا من وعن انھوں نے کالم کا حصہ بنا دیا۔ اس خط میں "ادنیٰ کارکن" نے یہ رونا رویا تھا کہ مسلم لیگ (ن) نہ تو میڈیا کو بھرپور استعمال کر رہی ہے نہ ہی تنظیم سازی کی طرف دھیان دے رہی ہے اور نہ ہی کارکنوں کی دل جوئی کر رہی ہے۔((10

اسی طرح قاسمی صاحب نے ایک دفعہ یک سطری کالم "عمران خان اور اسٹیبلشمنٹ" کے عنوان سے بھی تحریر کیا۔ جس کے آغاز میں انہوں نے محض یہ تحریر کیا کہ "اجمل شاہ دین ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ آج کا کالم ان کے ارشادات کی نذر ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:((11

عمران خان اور تحریک انصاف کے بارے میں ایک تاثر یہ بھی ہے کہ یہ نوجوانوں کی جماعت ہے یا نوجوان ان سے ہمدردی رکھتے ہیں لہٰذا جواب آں غزل کے طور پر قاسمی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صاحب نے حمزہ شہباز کی شان میں عمران خاں کے 30 اکتوبر 2011ء کے جلسے کے چند دن بعد ایک بھرپور کالم ''ابتلاؤں میں ثابت قدم رہنے والا نوجوان سیاستدان'' لکھا جس کا آغاز یوں کیا:

''خوش لباس اور خوش گفتار حمزہ شہباز شریف (خصوصاً) نوجوانوں میں بہت مقبول ہیں، انھیں ایک جی دار سیاستدان سمجھا جاتا ہے۔'' آگے چل کر انھوں نے مختلف امور جیسے ڈرون حملے، تھانوں کی کمپیوٹرائزیشن وغیرہ پر تحریک انصاف کے موقف اور عمران خان کی 30 اکتوبر 2011ء کے جلسے کی تقریر کے نکات کا نقیب بالواسطہ طور پر حمزہ شہباز شریف کو قرار دیا۔(12)

یقیناً قاسمی صاحب درست ہی سمجھتے ہوں گے کہ حمزہ ہی نوجوانوں کے اصل لیڈر ہیں اور یقیناً بعد میں ان کے علم میں آ گیا ہوگا کہ 2012ء میں حکومتِ پنجاب نے نائب قاصدوں اور دیگر چھوٹے ملازمین کی بھرتی کے لئے اشتہارات دیئے تو ہزاروں نوجوانوں نے پنجاب بھر سے اپلائی کیا جن میں ایم اے، ایم ایس سی، بی کام اور ایم بی اے پاس نوجوان بھی تھے لیکن بھرتی صرف وہی نوجوان ہو سکے تھے جن کی لسٹیں مبینہ طور پر حمزہ شہباز بھجواتے تھے۔ اور ان میں سے اکثر حمزہ شہباز کے حلقہ انتخاب سے ہوتے تھے۔ مگر قاسمی صاحب نے کبھی اس حوالے سے تو حمزہ شہباز کو خراجِ تحسین پیش نہیں کیا۔ تادمِ تحریر قاسمی صاحب مسلسل عمران خان کے ''کڑاکے'' نکالتے رہتے ہیں۔

عمران خان یا ان کی سیاست بالکل بھی خامیوں اور کوتاہیوں سے پاک نہیں اور نہ ہی وہ تنقید سے مبرّا ہیں۔ ان کی طرزِ سیاست پر تنقید اور تبصرے کا حق ہر شہری کو ہے۔ اسی طرح مسلم لیگ (ن) کی حکومت یا شریف برادران کے اچھے اقدامات کی تعریف ممنوع نہیں مگر شریف برادران کی قصیدہ گوئی اور عمران خان پر مشن کے طور پر نشتر زنی قاسمی صاحب کا پیشہ اور پہچان بن چکی ہے۔

سفیر یا گورنر بننے کی خواہش اپنی جگہ مگر عمر کے آخری حصے میں ایک دانشور کو زیادہ متوازن کردار نبھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن شاید کچھ کے لگاتے ضمیر کو مطمئن کرنے کا نسخہ بھی قاسمی صاحب خوب جانتے ہیں اور اس کا بندوبست ''کالم نگاری اور غیر جانبداری'' کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عنوان سے لکھی تحریر میں یہ کہہ کر کر لیتے ہیں کہ: ''پاکستان کے موجودہ حالات میں دانشوروں کو عوام کے کنفیوژن میں اضافہ کرنے کی بجائے انھیں واضح طور پر کسی ایسی قیادت کی طرف راغب کرنا چاہیے جو اُن کے نزدیک پاکستان کو موجودہ پاتال سے نکال سکتی ہو''۔

''میرے بہت سے کالم نگار دوست جن کا میں ذاتی طور پر مداح ہوں جن کی نیت اور بے لوثی پر بھی مجھے کوئی شک نہیں۔ مختلف سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں کی حمایت اپنے کالموں میں کرتے ہیں جس میں تحریک انصاف سے لے کر (ن) لیگ اور ایم کیو ایم سے لے کر جماعت اسلامی تک سبھی شامل ہیں۔ میرے ان دوستوں کو ان جماعتوں کی حمایت کا حق حاصل ہے اور اسی طرح مجھے بھی حق حاصل ہے کہ میں نظریاتی حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کروں''۔ آگے چل کر اپنے مؤقف کی مزید مضبوطی کیلئے ایک اور ''آزمودہ'' دلیل سامنے لے آتے ہیں: ''میرے نزدیک ان دِنوں پاکستان اندرونی اور بیرونی دشمنوں نیز ''دوست نما دشمنوں'' کی ریشہ دوانیوں کی زد میں بہت بری طرح آیا ہوا ہے۔ اگر تحریک پاکستان کے دنوں میں غیر جانبداری ایک گناہ تھی تو ان دنوں یہ گناہ نہیں گناہِ کبیرہ ہے کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی اس قیام گاہ کو مسمار کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ اگر پاکستان کو بچانے اور اسے استحکام بخشنے والے عناصر کی حمایت میں اپنے اپنے نظریات کے حامل افراد کو بصد سامانِ رسوائی، سرِ بازار بھی رقص کرنا پڑے تو یہ رقص اُنھیں ضرور کرنا چاہیے۔''(13)

قاسمی صاحب ماشاء اللہ بصد شوق یہ فریضہ شریف فیملی کے لئے سرانجام دے رہے ہیں۔ اپنے اسی کالم میں انھوں نے دانشوروں کو نصیحت کی ہے کہ موجودہ حالات میں وہ کنفیوژن پیدا نہ کریں بلکہ عوام کو کسی خاص قیادت کی طرف راغب کریں۔ یعنی ایک تو وہ خود کو بالواسطہ ایسا دانشور کہہ رہے ہیں جو عوام کو ایک خاص قیادت کی طرف راغب کر رہا ہے۔ ان کے نزدیک وہ دانشور کنفیوزڈ ہے جو غیر جانبدار تجزیہ کرے۔ سوال یہ ہے کہ جناب نے آج تک بیرون ملک مشاعرے پڑھنے کے سوا ایسا کونسا کام کیا ہے جسے ''دانشورانہ'' کہا جا سکے؟ بیشک وہ بڑے کالم نویس اور مزاح نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے نیچے سے اگر کالم نگاری کی کرسی کھینچ لی جائے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ وہ بطور شاعر کہاں کھڑے ہیں اور ان کے کتنے شعر زبان زدِ خاص و عام ہیں؟ ہاں البتہ جناب شہباز شریف کو ان کے دو عدد شعر یاد ہیں جو وہ اکثر اپنی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تقریروں میں پڑھتے رہتے ہیں۔

صحافت اور سیاست کا عام طالب علم بھی جانتا ہے کہ کسی بھی تجزیہ کار کا منصب یہ ہے کہ وہ پس منظر اور پیش منظر کو سامنے رکھتے ہوئے عصری حالات کا یوں تجزیہ کرے کہ عام آدمی کے سامنے ساری صورتحال کھل کر آجائے تاکہ کسی بھی معاملے پر اُسے اپنی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکے۔ ہر انسان کو مناسب پیرائے میں اپنی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح۔ اسی طرح قاسمی صاحب کو بھی آزادیِ اظہار کا بھرپور حق ہے مگر جب کوئی لکھاری یا صحافی غیر جانبدارانہ تجزیہ نہیں کرتا اور کسی ایک فریق کی تو بے جا تعریف کرتا ہے اور دوسرے پر خواہ مخواہ لعن طعن، تو وہ دانشوری کے رتبے پر فائز نہیں رہتا البتہ قصیدہ گو اور درباری کا روپ ضرور اختیار کر لیتا ہے۔

رہ گئی بات غیر جانبداری کی تو دنیا میں کوئی بھی شخص مختلف شعوری یا غیر شعوری تعصّبات اور وجوہات کی بنا پر مکمل طور پر غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ ((14 تاہم جینوئن دانشور اپنے طور کلی کوشش کرتے ہیں کہ وہ تعصّبات اور ذاتی پسند ناپسند سے اوپر اُٹھ کر کسی بھی حوالے سے اپنی غیر جانبدارنہ رائے دیں۔ اس ضمن میں اگر قاسمی صاحب تھوڑی سی زحمت کر لیں تو اپنے گھر میں یا سرپیرزادہ نظر آجائیں گے جو بہر حال حالات کا نسبتاً بہتر تجزیہ کرنے کی اپنے تئیں کوشش کرتے ہیں۔

قاسمی صاحب اور عرفان صدیقی بے شک ایاز امیر کو اپنا رول ماڈل نہ سمجھیں جو مسلم لیگ (ن) کا ایم این اے ہونے کے باوجود بھی غیر جانبدارانہ تجزیہ کرتے رہے لیکن وہ کم از کم وسعت اللہ خاں اور رحیم اللہ یوسف زئی سے ہی کچھ سیکھ لیتے مگر

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

میدانِ کالم نگاری کے ایک اور شاہ سوار غازی عرفان صدیقی نائن الیون کے بعد طالبانی گھوڑا سرپٹ دوڑاتے، نوائے وقت کے صفحات پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے خاندانِ شریفاں کی سرسبز چراگاہوں میں یوں داخل ہوئے کہ پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ آج اُن کی ''بھید بھری آواز'' دربارِ میاں برادران میں صفِ اوّل کے درباری کے طور پر بلند تر ہے۔

پروفیسر عرفان صدیقی ستر کے قریب ریڈیو ڈرامے لکھ چکے ہیں اور اُن کے دس ریڈیائی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ڈراموں پر مشتمل کتاب ''بھید بھری آواز'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ آپ سابق صدر رفیق تارڑ کے پریس سیکریٹری بھی رہے۔ 27 جنوری 2014ء کو انھیں وزیر اعظم پاکستان نواز شریف نے اپنا مشیرِ خاص بھی مقرر کر دیا۔ قبل ازیں اپنی ''خدمات'' کے عوض ہلال امتیاز بھی اینٹھ چکے ہیں۔ بہت مسجع و مقفیٰ اُردو لکھتے ہیں۔ بعض اوقات روانی میں زبان دانی آگے نکل جاتی ہے اور مواد پیچھے رہ جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب کو دنیا جہاں کے نقائص اور خرابیاں تحریکِ انصاف، مسلم لیگ (ق) اور دیگر جماعتوں میں نظر آتی ہیں۔ وہ ق لیگ کو فرزندانِ وقت کا کنبہ ٹھیک ہی قرار دیتے ہونگے ((15 لیکن فرزندانِ وقت کے اسی کنبے سے لگ بھگ 30 ایم پی اے ساتھ ملا کر شہباز شریف نے پانچ سال پنجاب میں حکومت کی۔ اس بے اصول سیاست پر صدیقی صاحب نے کبھی اپنی زبان دانی کے جوہر نہیں دکھائے۔

طاہر القادری کی ڈرامے بازی تو قاسمی اور صدیقی صاحب کو بہت کھلتی رہی مگر شہباز شریف کے حوالے سے انھیں کچھ یاد نہیں۔ سستی روٹی سکیم کے حوالے سے خادمِ اعلیٰ نے فرمایا تھا کہ اگر میں اس کام کو کامیاب نہ بناؤں تو میرا نام بھی شہباز شریف نہیں۔ پھر لاہور میں منعقدہ ایک تقریب کے دوران مائیکروفون گراتے، لہراتے اور جاتے جاتے چھوٹے میاں صاحب کا یہ کہنا کہ:

''میں جلد آپ کو وہ باتیں بتاؤں گا جس سے پاکستان عظیم ملک بن سکتا ہے''۔

دونوں صاحبانِ دانش قاسمی و صدیقی نے کسی کالم میں شہباز شریف سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ حضور آپ نے آج تک وہ بات کیوں نہیں بتائی جس سے پاکستان عظیم ملک بن سکتا ہے؟ اتنا قیمتی وقت آپ کیوں ضائع فرما رہے ہیں؟ اور نہ ہی سستی روٹی سکیم کی ناکامی کے بعد انھوں نے خادمِ اعلیٰ سے اُن کا نیا نام دریافت کیا؟

ایک اور حوالے سے میاں برادران کا کہنا تھا کہ کچھ ہو جائے پارٹی چھوڑنے والوں کو واپس نہیں لیا جائے گا مگر پھر 2013ء کے الیکشن سے قبل ''فرزندانِ وقت کے کنبے'' سے دھڑا دھڑ 'ن' لیگ میں واپس آنے والوں کو والہانہ خوش آمدید کہا گیا۔ لیکن عرفان صدیقی صاحب کا قلم اس حوالے سے بھی بالکل خاموش رہا۔

قاسمی صاحب تو پھر بھی اپنی قصیدہ گوئی اور حاشیہ برداری کے لئے جواز تراشتے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رہتے ہیں۔ مگر صدیقی صاحب ایسا کوئی تکلف نہیں کرتے بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر میاں صاحبان کی ترجمانی اور دفاع میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اصغر خاں کیس کا فیصلہ آیا تو انھوں نے کئی کالموں میں وضاحت کی کہ میاں صاحبان کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ اس زمانے میں ایجنسیاں سیاست میں سرگرم عمل تھیں اور وہ کسے فائدہ یا نقصان پہنچانا چاہتی تھیں؟

تبدیلی کا نعرہ چونکہ عمران خان سے وابستہ سمجھا جاتا ہے لہٰذا ایک دفعہ کہیں چیف الیکشن کمشنر فخر الدین جی ابراہیم 2013ء کے عام انتخابات سے پہلے کہہ بیٹھے کہ ''اگلے انتخابات تبدیلی لانے کا آخری موقع ہیں''۔ چنانچہ صدیقی صاحب کو فخرو بھائی کی غیر جانبداری مشکوک نظر آنے لگی اور اس بات کا ''سیاپا'' انھوں نے اپنے دو کالموں میں کیا۔(16

مسلم لیگ (ن) کے حوالے سے صدیقی صاحب کو اکثر ہرا ہی سوجھتا ہے۔ ہاں البتہ اپنے ایک کالم (4 فروری 2013ئ) میں انھوں نے (ن) لیگ اور دیگر جماعتوں کی طرف سے اسلام آباد میں الیکشن کمیشن سے یکجہتی کے لئے دیئے گئے دھرنے کو ''تماشائے بے آب و رنگ'' قرار دیا، مگر یہاں بھی وہ میاں صاحبان کی مدح سرائی کرنا نہیں بھولے۔(17

ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ اگر آج میاں برادران بالفرضِ محال کسی وجہ سے یا رضا کارانہ طور پر مسلم لیگ (ن) سے علیحدگی اختیار کر لیں تو کیا قبلہ قاسمی صاحب اور صدیقی صاحب اسی طرح مسلم لیگ (ن) کی شان میں رطب اللسان رہیں گے؟ ہرگز نہیں، کیونکہ درحقیقت ان دونوں حضرات نے کبھی مسلم لیگ کے منشور یا وژن پر بات نہیں کی بلکہ میاں برادران کی قصیدہ گوئی اور اُن کے سیاسی مخالفین کی بدخوئی میں مصروف رہنے کو ہی اپنا اولین فریضہ سمجھا۔ ایک اچھا کام عرفان صدیقی صاحب نے یہ کیا کہ وزیر اعظم کا 'مشیر خاص' بنتے ہی کالم لکھنا بند کر دیا۔

سیاستدان بھی عام لوگوں کی طرح خوبیوں، خامیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ بھی اچھے برے کام کرتے ہیں، درست یا غلط فیصلے کرتے ہیں لیکن وہ چونکہ عوامی نمائندگی کے زیر بار ہوتے ہیں لہٰذا وہ تنقید یا تعریف کے بھی زیادہ سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ البتہ تعریف یا تنقید کرتے ہوئے مبالغہ آمیزی کے بجائے توازن ہی پیش نظر رہنا چاہئے۔ مزید برآں ہر فرد کو اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق نقطۂ نظر کے اختیار اور اظہار کا مکمل حق ہے اور یہ نقطۂ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نظر درست ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ اعتراض دانشورانہ بد دیانتی اور محض ایک درباری بن جانے پر ہے، کیونکہ اس طرزِ عمل سے عام لوگوں کی رائے سازی کے بجائے گمراہی کا احتمال لامحالہ ہوتا ہے۔

مجموعی طور پہ ہمارا قومی مزاج بھی جارحانہ اور جذباتی ہے لہٰذا کچھ کالم نگار بھی ہر وقت جذبات کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں۔ تجزیہ اور غیر جانبداری جائے بھاڑ میں، قوم کا فائدہ ہو یا نقصان انھیں محض اپنا سودا بیچنے سے غرض ہے۔ ملّت کے ایسے ہی ایک ہمدرد جناب اوریا مقبول جان ہیں۔ حضرت پیشے کے اعتبار سے بیوروکریٹ ہیں۔ بہت خوبصورت اور رواں نثر لکھتے ہیں۔ پی ٹی وی کے لیے نا صرف کئی ڈرامے لکھے بلکہ خود اداکاری کے جوہر بھی دِکھا چکے ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے کالم لکھ رہے ہیں اور ایک وسیع حلقہ قارئین رکھتے ہیں۔ شاعر بھی ہیں۔ علامہ نے چونکہ ایک مخصوص مذہبی اور سیاسی جماعت کی فکری راہداریوں سے گزر کر ہی تربیت پائی ہے، لہٰذا تقریر و تحریر پر کمال ملکہ حاصل ہے مگر مذکورہ جماعت ہی کی طرح فکری طور پر کنفیوژ ہیں۔ اُن سے حالات حاضرہ پر بھی کوئی سوال پوچھا جائے تو وہ تاریخ کی بھول بھلیوں کی سیر کراتے ہوئے کنفیوژن اور الجھاؤ میں مزید اضافہ کر دیں گے۔ کسی ٹاک شو میں دس لوگ بھی بیٹھے ہوں تو اِن کی کوشش ہوتی ہے کہ محض وہی بولتے رہیں۔ ان کی باڈی لینگوئج چیخ چیخ کر علمی تفاخر کا اظہار کرتی ہے۔ اور یا صاحب نام نہاد نشاۃِ ثانیہ کے داعی اور موید ہیں۔ اپنے کالموں میں مبہم اور ماورائی طرزِ تحریر سے کام لیتے ہیں۔ جہاں کمزور پڑتے ہیں نامعلوم بزرگان کی بشارتوں، وعیدوں یا مذہب کے نام کو استعمال کرتے ہیں۔ اکثر اُن کا کالم پڑھنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ ان سے پوچھا جائے ''حضور آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ وضاحت فرمادیں''۔

وہ باطل کے مٹنے کی نوید اور ''اللہ کے بندوں'' کی وعید بذریعہ ''بذاتِ خود'' سناتے ہیں۔ اور اللہ کو یوں ''میرے اللہ'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں جیسے وہ صرف انھی کا ہو۔ اُن کے اندازِ بیان سے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنی ذات کے حوالے سے عنقریب کوئی ''آفاقی'' دعویٰ کر بیٹھیں گے۔

آپ جمہوریت کے سخت خلاف ہیں اور رائج نظام ہائے حکومت کی ہزاروں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خامیاں گنواتے ہیں۔ 2013ء کے عام انتخابات کے دوران روزنامہ دنیا میں ان کے جمہوریت کے خلاف زہر اُگلتے کالم چھپ رہے تھے تو دوسری طرف وہ دُنیا ٹی وی کی خصوصی الیکشن نشریات کے سلسلے میں میزبانی اور تجزیہ کاری کے فرائض سرانجام دے کر پیسے بھی کما رہے تھے۔

وہ خلافت کا نظام قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔ (اور شاید خود خلیفہ بننے کے) مگر انتقالِ اقتدار کا کوئی فارمولا نہیں بتاتے۔ اسی طرح کارہائے مملکت چلانے کے لیے عہدِ جدید سے کوئی مثال پیش نہیں کرتے بلکہ 'تاب ناک' ماضی میں لے جاتے ہیں (اور کوشش کرتے ہیں کہ بندہ کسی طرح وہاں سے واپس نہ آسکے) جب وہ اپنے تئیں یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان عالمی سازشوں کے نرغے میں ہیں اور اس وقت پوری دنیا پر باطل کا نظام قائم ہے، تو پھر یقیناً یہ سوال اُٹھتا ہے کہ اس ساری صورتحال کا حل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے اوریا صاحب نے دسمبر 2011ء کو چار اقساط پر مشتمل کالم بعنوان ''حل کیا ہے'' تحریر کیا۔ اس کالم میں انھوں نے حسبِ روایت ماضی کے بے مثال اور تابناک طرزِ حکومت، عدل وانصاف اور تعلیم وتربیت کا ڈھول پیٹا اور آخر میں یہ کہہ دیا کہ ''اب ضرورت ہے ایک ایسے تھنک ٹینک کی جو محنت کے ساتھ مسلم اُمہ کے آئین کا خاکہ تیار کرے، معاشی نظام، بینک کے طریق کار، ضابطہ فوجداری اور دیوانی سے لے کر ایک ایک قانون کو شق وار مرتب کرے۔ جس میں ماہرین اس امت کے اہم دماغوں کی سربراہی میں یہ سب کام سرانجام دیں تاکہ اگر ایک دفعہ کسی ریاست سے غنڈوں کا قبضہ چھڑوالیا جائے تو یہ سب نافذ کرنے کے لئے ایک لمحے کی دیر نہ ہو۔'' (18)

بظاہر تو یہ آئیڈیا کمال لگتا ہے مگر اوریا صاحب نے یہ واضح نہیں کیا یہ سب ''ماہرین'' کون ہونگے۔ ''مسلم اُمہ'' کے ''اہم دماغ'' قرار پانے کے لیے کن شرائط کا حامل ہونا لازمی ہوگا اور یہ شرائط کو کون طے کرے گا اور سب سے بڑھ کر ''ریاست سے غنڈوں کا قبضہ'' کون چھڑائے گا۔ غالباً یہ فریضہ طالبان یا ان جیسا کوئی لشکر سرانجام دے گا اور اگر نجات دہندہ طالبان ہونگے تو کیا وہ اوریا صاحب سے فکری راہنمائی لیں گے؟

کالموں کی مذکورہ سیریل کے بعد اپنے ایک اگلے کالم میں انھوں نے ''العلم ٹرسٹ'' کے نام سے ایک تھنک ٹینک کا اعلان کر دیا ((19 اور پھر ایک اور کالم میں حضرت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صاحب نے الحمرا میں اسی حوالے سے ایک اجتماع کا اعلان کر دیا۔ 18 فروری 2012ء کی شام اُس اجتماع میں دور و نزدیک سے کالم پڑھ کر سینکڑوں لوگ آ گئے۔ علامہ اور یا نے حسب روایت ایک دھواں دھار لیکچر دیا تو حاضرین میں سے غالباً نصف درجن تو کھڑے ہو کر اپنا اپنا تیار شدہ نفاذِ اسلام کا طریقہ اور نسخہ بتانا شروع ہو گئے جو چار و ناچار انھیں سننا پڑا۔

وہ ایک ''اسلامی جامعہ'' بنانے کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں اور موٹروے پر 'سکھے کی' کے قریب انہیں پچاس ایکڑ زمین بھی کسی صاحب دل کی طرف سے عطیہ ہو چکی ہے۔ غالباً وہ منصوبے کی تکمیل کے بعد اپنی طرز کے ڈاکٹر اسرار یا طاہر القادری بن کر اُبھریں گے؟ اب یہ اندازہ نہیں کہ وہ تاریخ کا دھارا موڑ کر رکھ دیں گے یا خود تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔

اور یا صاحب اپنی تحریر و تقریر میں روایتی ملا کی طرح فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے بہت Judgemental اور Statemental ہو جاتے ہیں اور دعوے کرتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کا مؤقف ہے کہ پاکستان میں ذریعہ تعلیم ہماری اپنی زبان کو ہونا چاہئے کیونکہ دنیا میں کسی قوم نے دوسروں کی زبان میں علم حاصل کر کے ترقی نہیں کی ((20۔ اپنی زبان سے ان کی مراد یہاں کی مقامی زبانیں یعنی سندھی بلوچی، یا پشتو، پنجابی وغیرہ نہیں بلکہ صرف اردو ہے۔ ویسے بھی اور یا صاحب اور ان کے ممدوحین مقامی ثقافتوں کو کسی قابل نہیں سمجھتے۔ چونکہ حضرت زمینی حقائق کو بالکل اہمیت نہیں دیتے اور نہ ہی اُن کا ادراک رکھتے ہیں لہٰذا معروضی تجزیہ نگاری کے وصف سے یکسر محروم ہیں۔ وہ خود ساختہ خلائی دنیا کا نقشہ کھینچ کر اُڑان بھرتے ہیں اور زمین پر آنے کا نام تک نہیں لیتے۔

ریڈیو پاکستان کے دینی پروگراموں کے ایک نامور مقرر اور عالمِ دین شاہ بلیغ الدین اپنی تقریروں کا آغاز کچھ یوں کیا کرتے تھے:

''سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کے سموں سے اُٹھنے والی گرد میں خیمہ زن لشکر کے سپاہیوں کو ایک ہیولا اپنی طرف بڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ امیرِ لشکر کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ گرد کا یہ ہیولا کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔''

کچھ ایسا ہی طرزِ تحریر عہدِ حاضر کے ایک اور نمایاں کالم نگار جاوید چودھری صاحب کا بھی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''ڈاکٹر ہرمن بورہیو کے انتقال کے بعد ان کا سامان کھولا گیا۔ لکھنے کے چار قلم، کاغذوں کے درجنوں دستے، ایک رائٹنگ ٹیبل، ایک آرام کرسی اور مخملی غلاف میں لپٹی ایک کتاب۔۔۔ غلاف کھولا گیا۔۔۔'' ('زندگی کا کھویا ہوا سرا'۔ اکتوبر 2014ئ)

پچھلے دس، پندرہ سالوں میں، کہانی یا افسانے کی طرز پر شروع ہونے والا، ان کا 'زیرو پوائنٹ' غالباً سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم ہے۔ آپ نے کالم نویسی کو ایک نئی جہت اور انفرادیت دی، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو کے کسی اخبار کا ادارتی صفحہ ملاحظہ کیا جائے تو کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا جاوید چودھری مل ہی جائے گا۔

جاوید چودھری خوبصورت اور رواں نثر لکھتے ہیں۔ اُن کی تحریر ایک خاص قسم کا مضبوط تاثراتی انداز اپنے اندر سموئے ہوتی ہے جو قاری کو عموماً پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اُن سے اختلاف رائے رکھنے والا بھی افسانوی دلچسپی کا حامل اُن کا آدھا کالم تو رواروی اور روانی میں پڑھ ہی جاتا ہے۔ جبکہ بعض اوقات کالم کا دوسرا حصہ بورنگ، یاوہ گوئی اور اوٹ پٹانگ منطق پر مبنی ہوتا ہے۔ جب وہ کالم کے پہلے حصے میں بیان کردہ کہانی کو حالاتِ حاضرہ سے جوڑنے اور مخصوص نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی کبھی اُن کا تیر تکا چل جاتا ہے جب کہ اکثر مضحکہ خیزی قاری کا منہ چڑاتی ہے۔

جاوید چودھری چونکہ خود فکری طور پر واضح نہیں لہٰذا اپنے کالموں کے ذریعے مسلسل معاشرے میں کنفیوژن انڈیل رہے ہیں۔ ان کے لگاتار چھپنے والے پانچ، چھ کالم اکٹھے سامنے رکھ کر باری باری پڑھے جائیں تو اُن میں مربوط فکر کی عدم موجودگی اُن کے مبہم نظریات اور کنفیوژن کو واضح کر دیتی ہے۔ چونکہ وہ انسانی بہتری اور فلاح کے کسی بلند تر نظریے یا آدرش سے محروم لکھاری ہیں لہٰذا بنی نوع انسان کے مسائل اور ان کی نشان دہی کی حقیقی صلاحیت سے بھی محروم ہیں۔ وہ کالم برائے کالم لکھتے ہیں اور اکثر اُن کا کالم سستی تفریح کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ بنیادی طور پر کہانی کے محتاج کالم نگار ہیں۔ پہلے تو انھیں اپنا کالم شروع کرنے کے لیے ایک کہانی درکار ہوتی ہے اور کہانی لکھ لینے کے بعد بقیہ کالم اُس کے مطابق لکھنے کے لیے وہ مجبورِ محض ہیں۔ لہٰذا وہ ابلاغ کی بے پناہ صلاحیت رکھنے کے باوجود فکری اور ابلاغی طور پر محدود اور بے دست و پا محسوس ہوتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہا جاتا ہے جاوید چودھری اپنے کالم کی تیاری پر سات، آٹھ گھنٹے صرف کرتے ہیں۔ وہ ذاتی لائبریری اور انٹرنیٹ کے علاوہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے کئی مراحل میں کئی کالم مکمل کرتے ہیں۔ پھر سات آٹھ مرتبہ کالم کی تصحیح اور حقائق کی درستی کرتے ہیں۔ ((21 مگر پھر بھی بعض اوقات اُن کے کالم میں اغلاط کی بھرمار اور لاعلمی کی یلغار ہوتی ہے۔

موصوف نے اکتوبر، نومبر 2012ء میں چھ کالموں کی ایک سیریز ''عوام اصل مجرم ہیں'' کے عنوان سے تحریر کی۔

پہلی قسط ہی عجیب و غریب تضادات پر مبنی ہے:

''آپ نور جہاں، مہدی حسن، استاد امانت علی خاں، ریشماں، پٹھانے خاں اور نصرت فتح علی خاں کو چھوڑ دیجیے۔ یہ لوگ واقعی صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ آپ غلام علی، شوکت علی، محمد علی شہکی، طفیل نیازی، نیرہ نور، نازیہ حسن، راحت فتح علی خاں، عاطف اسلم، عدنان سمیع خاں اور علی ظفر کو دیکھ لیجیے، ہمارے استاد اِن میں سے اکثر کو گلوکار ہی نہیں مانتے۔''

پتا نہیں چودھری صاحب نے گلوکاروں کی یہ درجہ بندیاں موسیقی کے کس معیار کو مدنظر رکھ کر بنائی ہیں۔ پھر وہ نہ جانے کون سے استاد ہیں جو غلام علی، شوکت علی، طفیل نیازی، نیرہ نور، راحت فتح علی خاں یا عدنان سمیع خاں کو گلوکار نہیں مانتے۔ برصغیر میں غزل گائیکی کی طرف نظر ڈالتے ہی مہدی حسن کے ساتھ دوسرا نمایاں نام غلام علی کا نظر آتا ہے اور وہ غزل گائیکی میں اپنی علیحدہ پہچان رکھتے ہیں۔ شوکت علی خاں اعلیٰ ترین فوک سنگر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ طفیل نیازی لوک موسیقی کا وہ روشن ستارہ اور بڑا نام ہے جو عوام اور خواص کے ساتھ اساتذہ کے ہاں بھی یکساں طور تسلیم شدہ ہے۔ نیرہ نور اپنی منفرد اور سریلی آواز کی بنا پر آج بھی معروف ہیں۔ نازیہ حسن کو برصغیر میں پاپ میوزک کی Pioneer سمجھا جاتا ہے اور ان کی دلوں کو موہ لینے والی آواز آج بھی تازہ محسوس ہوتی ہے۔ راحت فتح علی خاں کا تعلق نامور قوال گھرانے سے ہے اور وہ اپنے مخصوص رنگ میں گانے کا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔

جاوید چودھری کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ''ہمارے تھیٹر کے ان پڑھ اداکار بوبو برال، امان اللہ، معین اختر، عمر شریف اور شکیل صدیقی نے انڈیا کے ناقدین کو ناکوں چنے چبوا دیے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جہاں تک تھیٹر کی بات ہے، انڈیا میں سنجیدہ تھیٹر کی روایت ہم سے کہیں توانا ہے۔ ہمارے مذکورہ فنکار کامیڈین کے طور پر شہرت رکھتے ہیں اور اسی حوالے سے انھوں نے بھارت میں عزت کمائی۔ ناقدین کو چنے چبوانے والی بات محض مبالغہ ہے۔ پھر موسیقاروں کے حوالے سے بھی جاوید چودھری صاحب کا فرمان بالکل لاعلمی پر مبنی ہے۔ فرماتے ہیں ''دنیا میں ہمارے موسیقاروں کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی، آپ کو پورے ہندوستان میں بابا چشتی، وجاہت عطرے اور خورشید انور جیسا ایک موسیقار نہیں ملے گا''۔

چودھری صاحب مزید فرماتے ہیں ''بھارت کی سوا ارب آبادی اور وسیع رقبے پر بیسیوں برسوں میں ایک اے آر رحمان، ایک آر ڈی برمن، ایک سونو نگم، ایک الکا، ایک کشور کمار، ایک کمار سانو پیدا کرتا ہے جبکہ چند کروڑ آبادی کا پاکستان تمام تر معاشی جبر، موسیقی، اداکاری، فلم اور ٹیلی وژن کے خلاف سینکڑوں فتوؤں اور خاندان سے عاق کی درجنوں دھمکیوں کے باوجود ہر سال ایسے بیسیوں نوجوان پیدا کر دیتا ہے جو انڈیا کی موسیقی، گلوکاری اور اداکاری کی انڈسٹری کو جڑوں سے ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ حد ملاحظہ کیجئے، اس مردم خیز ملک میں مہدی حسن جیسا شخص علاج کے لئے حکومت کا راستہ دیکھتے دیکھتے مر جاتا ہے اور نور جہاں ''میں ہوں حسن کی کلاشنکوف'' جیسے معرکہ آراء گانے، گانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ موسیقاروں کو مراثی اور کنجر کی گالی پڑتی ہے۔ یہ ملک کبھی فلم، موسیقی، تھیٹر اور گلوکاری میں برصغیر کا لیڈر تھا۔ مولا جٹ کے نام سے ایک لچر اور واہیات فلم بنی اور اس نے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیئے، عوام سلطان راہی اور مصطفی قریشی کے گنڈاسے اور انجمن کی اُچھل کود دیکھنے سینماؤں پر اُمڈ آئے اور اس کے ساتھ ہی اچھی اور معیاری فلم کا جنازہ نکل گیا۔ بڑے غلام علی خاں کراچی سے انڈیا چلے گئے اور لوگوں نے دیکھا، انڈیا کے وزیراعظم لال بہادر شاستری ان کا ستار اٹھا کر ان کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ آج اس ملک میں اگر انڈین فلم دیکھی جا رہی ہے یا بھارتی موسیقی سنی جا رہی ہے یا بھارتی ڈرامے مقبول ہیں یا پھر ہمارے چینلز پر چھ چھ گھنٹے بھارتی اداکاروں کی آخری رسومات دکھائی جاتی ہیں یا کرینہ کپور اور سیف علی خاں کی شادی دکھائی جاتی ہے یا راجیش کھنہ اور ریش چوپڑا کو کوریج ملتی ہے یا محمد رفیع کی برسی پر رپورٹ چلتی ہے یا پھر بھارتی فلموں کے ٹریلر چلائے جاتے ہیں تو اس کے ذمہ دار آپ لوگ ہیں کیونکہ آپ نے اس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ملک میں معیاری فلم، ڈرامے، تھیٹر، موسیقی اور گلوکاری پر لچر اور واہیات چیزوں کو فوقیت دی، آپ نے نصیبو لال کو نور جہاں اور عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو مہدی حسن پر اہمیت دی چنانچہ آج سونو نگم، راجیش کھنہ اور رام گوپال ورما ان لوگوں کی جگہ لے چکے ہیں اور آپ چیخ رہے ہیں، آپ اب چیختے کیوں ہیں؟ آپ مجرم ہیں لہٰذا آپ اب خاموشی سے برداشت کریں۔''

پتا نہیں چودھری صاحب ''مولا جٹ'' کو کس حوالے سے لچر اور واہیات فلم کہہ رہے ہیں۔ مزید برآں اس فلم میں انجمن نے تو کام ہی نہیں کیا۔ فلمی شعبے کی زوال پذیری میں ریاست کی عدم سرپرستی، بھیڑ چال اور چربہ سازی نمایاں وجوہات ہیں۔ موسیقی کی تھوڑی سی شدھ بدھ رکھنے والا بھی یہ علم رکھتا ہے کہ بڑے غلام علی خاں کا ستار سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ خاں صاحب کا جو ستار شاستری کو چودھری صاحب نے اٹھوایا ہے وہ غالباً تانپورہ ہوگا (تانپورے اور ستار کی شکل میں عام آدمی کے لئے تفریق نسبتاً مشکل ہے) کیونکہ کلاسیکل گویے عموماً تان پورے، سُرمنڈل یا باجے کے ساتھ ریاض کرتے ہیں نہ کہ ستار سے۔

ہمارے ہاں کسی نے نصیبو لال کو نور جہاں اور عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو مہدی حسن پر فوقیت نہیں دی۔ نصیبو بے چاری تو آج بھی میڈم کا انداز کاپی کر کے یا اُن کے گانے گا کر اپنی روٹی روزی چلاتی ہے۔ رہ گئی بات عطاء اللہ اور مہدی حسن کی تو دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ ہے اور نہ موازنہ۔ عطاء اللہ عوامی فنکار کے طور پر نامور ہوئے تو مہدی حسن غزل کے شہنشاہ کہلائے اور پلے بیک سنگر کے طور پر بھی خاص و عام میں عزت و منزلت پائی۔ اُن کے علاج کے لیے حکومت نے نہ صرف بہت مدد کی اور مختلف اداروں اور حکومتی عہدیداروں نے کئی بار انھیں خاطر خواہ رقوم نذر کیں۔

میڈم نور جہاں کو میں آں حسن دی کلاشنکوف' گانے پر کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ پاکستان فلم انڈسٹری میں کام کرنے والے جانتے ہیں کہ میڈم کس دھانسو مزاج کی حامل تھیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے بہت خوشحال زندگی بسر کی اور لواحقین کے لیے وسیع ترکہ چھوڑ کر گئیں۔ اُن کی کسی مجبوری کا سراغ البتہ چودھری صاحب کو ملا ہے تو اور بات ہے۔

غالباً یہ ساری معلومات جاوید چودھری کے ساتھ کام کرنے والی ٹیم نے اُنھیں مہیا کی ہوں گی۔ اُن بے چاروں نے تو اپنا کام کر دیا۔ اب یہ چودھری صاحب پر منحصر تھا کہ وہ ان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

معلومات کو درست انداز میں بیان کرتے مگر انھوں نے اس کالم میں حقائق کو بے دریغ مسخ کیا۔فن وثقافت سے تھوڑی شناسائی رکھنے والا فرد بھی شاید ایسے کوڑ پن کا مظاہرہ نہ کرتا جیسا چودھری صاحب نے کیا۔لیکن وہ چودھری آدمی ہیں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔بنیادی بات یہ ہے کہ انڈیا اور پاکستان بعض اختلافات کے ساتھ تقریباً مشترکہ ثقافتی ورثے کے حامل ممالک ہیں۔لہٰذا فلم ہو یا دیگر فنونِ لطیفہ، دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے کے اچھے کام کو سراہتے ہیں اور بلاتفریق ملک، فن سے حظ اٹھاتے ہیں۔تقسیم کے بعد کئی سالوں تک ہمارے ہاں بھی مختلف ثقافتی شعبوں میں، خواہ موسیقی ہو یا فلم، تقریباً ہندوستان کے مقابلے کا کام ہوتا رہا مگر پھر ریاست کی عدم دلچسپی اور دیگر بے شمار وجوہات کے ساتھ ہمارے فکری کنفیوژن نے ہمارے ثقافتی ادراک کو بھی دھندلا دیا اور تاحال یہ عمل جاری ہے۔لہٰذا دیگر شعبہ ہائے زندگی میں زوال کے ساتھ فن وثقافت کے میدان میں بھی ہمیں ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہے۔تاہم اس سلسلے میں کوئی دورائے نہیں کہ فنونِ لطیفہ کی ترویج اور فنکاروں کی بہبود کے لیے مزید حکومتی اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔

کالموں کے اسی سلسلے میں آگے چل کر چودھری صاحب فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ ''ہمارے ملک میں غربت، مہنگائی اور بے روزگاری کی ستر فیصد جڑیں عوام کی ضد اور ہٹ دھرمی میں گڑھی ہیں۔''

''ہم روایت سے لے کر مذہب اور تعلیم سے لے کر خوشحالی تک کنفیوژن کا شکار ہیں۔سوال یہ ہے کہ اس کنفیوژن کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کے ذمہ دار عوام ہیں۔کیونکہ کوئی ریاست، کوئی حکومت فرد کو کنفیوژن سے نہیں نکال سکتی''۔''مگر ہم عوام مایوس ہو کر ریاست اور ملک کو گالی دیتے ہیں''۔((22

جزوی طور پر تو شاید اپنی پسماندگی اور زوال کا باعث خود عوام ہو سکتے ہیں مگر اُن کا حصہ بہت تھوڑا ہے۔کیونکہ وہ ایک استعماری، سامراجی اور استحصالی نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔عوام کی اکثریت ہمیشہ اچھی ہوتی ہے لیکن عملی طور پر آگے بڑھنے کے اجتماعی عمل کی عدم موجودگی میں اُن کی انفرادی یا گروہی کاوشیں کلی طور پر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ ریاست اپنے حصے کا کام نہ کرے لہٰذا معاشرہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا چاہے انفرادی طور پر افراد جو بھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

معجزے برپا کرتے رہیں۔ (عمران خان کا قائم کردہ شوکت خانم کینسر ہسپتال اس حوالے سے ایک مثال ہے۔ انفرادی طور پر یہ منصوبہ یا ایسے دیگر کارِ خیر بہت سے افراد سرانجام دیتے ہیں مگر ان اقدامات سے معاشرے محض جزوی طور پر مستفید ہوتے ہیں)۔

چھ قسطوں میں عوام کو مجرم ثابت کرنے کے بعد آخری قسط میں انھوں نے مسائل کا حل دینے کا اعلان کیا اور پھر وقفے وقفے سے اپنے تئیں معیشت، غربت، تعلیم، صحت اور انصاف وغیرہ کے حوالے سے حل پیش کیے اور پوری ذمہ داری سے فارغ ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ محض مسائل کے بیان کرنے اور اُن کا اوپری تجزیہ کرنے سے کام نہیں چلتا بلکہ مسائل کے پس پردہ محرکات اور وجوہات کی تشخیص کرنی پڑتی ہے پھر کہیں جا کر ان مسائل کے امکانی حل کی ترکیبات کا مصالحہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ ویسے تو جاوید چودھری صاحب نے دولت اور شہرت بہت کمالی ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ خود کو مشین سے مفکر میں تبدیل کریں۔ مہینے میں سولہ کالم لکھنے، بیس ٹی وی ٹاک شو کرنے اور روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنے کی بجائے بے شک آدھا وقت ہی غور و فکر کو دیں۔ تاکہ وہ خود بھی ٹھوس نتائج تک پہنچ سکیں اور عوام الناس کو بھی درست رہنمائی دے پائیں۔ 29 جون 2014ء کو روزنامہ ایکسپریس میں انھوں نے جوائنٹ فیملی سسٹم کے خلاف ایک بھرپور کالم داغا جس میں اشوک سے لے کر اورنگزیب عالمگیر تک کامیاب بادشاہوں کا تذکرہ کیا۔ انگریزوں کی کامیابی کے اصول گنوائے اور یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ ''ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس خطے کا سب سے بڑا مسئلہ جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔ پھر فرمایا کہ ''ہمارا دوسرا المیہ سماجی بوجھ ہے،'' ہم میں سے کوئی ایک شخص ایڑھیاں رگڑ کر خوشحالی کے دروازہ تک پہنچتا ہے اور اس کے بعد پورا خاندان اپنی خواہشوں کی گٹھڑیاں اس کے سر پر رکھ دیتا ہے۔ جاوید چودھری صاحب کے جوائنٹ فیملی کے خلاف پیش کردہ حقائق اور بیان کردہ دلائل بے شک سو فیصد درست ہی کیوں نہ ہوں مگر یہ جزوی سچ اور ادھورے دلائل ہیں۔ ممکن ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام آج کے دور میں مادّی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہو مگر یہ بات جزوی سچ تو ہو سکتا ہے پوری حقیقت نہیں۔ مغربی معاشروں کے کامیاب افراد یا ممالک کے خاندانی امور کے حوالے سے طرزِ عمل کا ہمارے سماجی رویوں اور معاشرے سے موازنہ نہیں ہو سکتا۔ ترقی یافتہ معاشروں میں سماجی اقدار، تعلیم، صحت، انصاف اور دیگر بنیادی انسانی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حقوق کی ضمانت فرد کو باشعور اور ذمہ دار شہری بناتی ہے اور اُسے آزادی کا احساس فراہم کرتی ہے۔ جبکہ پسماندہ معاشروں میں ہر طرح کے عدم تحفظ کا احساس ہی شہریوں کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ دشمن ہی شہریوں کو گروہ بندی پر مجبور کرتا ہے اور وہ ریاست کی بجائے اپنے قبیلے، گروہ، یا خاندان سے وابستگی میں پناہ محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے چودھری صاحب کے درست حوالہ جات اور دلائل غلط تجزیے کی نذر ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

دنیا بھر میں صحافی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے اور مسائل کی تشخیص کے لیے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھ کر معاشرے کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ وہ جاوید چودھری اور دوسرے پاکستانی کالم نگاروں کی طرح محض اپنے کالموں کے مجموعے نہیں چھپواتے۔ جاوید چودھری بھی بے شک اپنی پسندیدہ جگہ دریائے نیل میں کھڑے جہاز کے عرشے پر چاندنی رات میں لیٹ کر عقل و دانش کے گھوڑے دوڑائیں اور اوٹ پٹانگ باتیں کرنے اور رنگ برنگی کہانیاں سنانے کی بجائے قوم کو اپنی پختہ فکر سے نوازیں تاکہ وہ تادیر یاد رکھے جائیں ورنہ بڑے سے بڑا کالم نگار بھی پاپ سنگر کے کیریئر جتنی عمر رکھتا ہے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل اور اگر کہانی اُن کا عشق ہے تو بات کرنے اور کہانی کہنے کا سلیقہ انھیں ویسے بھی خوب آتا ہے، جزیات، جذبات اور منظر نگاری میں بھی وہ کمال ملکہ رکھتے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ وہ افسانے اور ناول لکھیں۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنی کالم نگاری سے زیادہ اس میدان میں نام کمائیں۔ آزمائش البتہ شرط ہے۔

جاوید چودھری اشرافیہ میں نئے نئے داخل ہوئے ہیں لہٰذا وہ ککھ پتیوں کے لکھ پتی اور ارب پتی بننے کی متاثر کن کہانیاں لکھتے رہتے ہیں اور قارئین کو یہ سمجھاتے رہتے ہیں کہ ''دولت بری چیز نہیں'' (23) اس ضمن میں وہ کئی کالم تحریر کر چکے ہیں۔ اُن کی بات بالکل بجا ہے واقعی دولت بری چیز نہیں اگر مخلوقِ خدا میں اس کی منصفانہ تقسیم ہو۔ نو دولتیے دولت کا بھونڈا اظہار نہ کریں۔ سرمایہ دار مزدور کا حق نہ ماریں اور سب سے بڑھ کر اگر دولت دونمبری اور ہیرا پھیری سے اکٹھی نہ کی گئی ہو۔ چودھری صاحب نے شاید ہی کبھی کسی دانشور، مصلح، فلاسفر یا نبیؐ کے بارے میں تحریر کیا ہو کہ کیسے ان بڑے لوگوں نے فقر و افلاس اور بُرے حالات کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

باوجود اپنی فکر اور کاوش سے تاریخ کا دھارا موڑا اور بنی نوع انسان کے محسن کہلائے۔ حالانکہ چودھری صاحب کا آئیڈیل (دولت مند) بننا ان کے لئے کونسا مشکل تھا۔

جاوید چودھری، عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور چند دیگر ''اہل دانش'' سٹیٹس کو (Status quo) کے شدید حامی ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ رسماً کہتے ہیں کہ حالات آئیڈیل نہیں مگر ساتھ ساتھ سب اچھا کی بلند آہنگ آوازیں بھی لگاتے رہتے ہیں۔ یہ دلائل دیتے ہیں کہ ایک ایک مرلے والے پلازوں کے مالک بن گئے ہیں۔ کاروں کی بہتات کی وجہ سے ٹریفک کے مسائل پیدا ہو گئے۔ آج ہر تیسری گاڑی نئی ہے۔ سو کے قریب ٹی وی چینل ہیں۔ شہروں میں بے شمار کافی ہاؤسز اور بین الاقوامی ریستورانوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا حالات اتنے بُرے بھی نہیں جتنے ہمارے کچھ لوگ بیان کرتے ہیں ((24۔ ان لوگوں کے فکری اُستاد اشفاق احمد خود ماڈل ٹاؤن میں کنالوں پر محیط داستان سرائے میں قیام پذیر رہے اور لوگوں کو باباجی نور والے کے کچے آستانے کی فیوض و برکات پر مبنی داستانیں سناتے رہے۔ خود اردو سائنس بورڈ کے ڈی جی کے طور پر سالہا سال مدتِ ملازمت میں توسیع کرواتے رہے۔ اور قریباً 20 سال اس عہدے پر براجمان رہے لیکن اور لوگوں کو صبر و توکل کی تلقین کرتے رہے۔ حالانکہ بقول شخصے اُن کا سائنس سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا اردو کا سائنس سے۔

دراصل ان لوگوں نے اپنے حصے سے کہیں زیادہ اس ناہموار معاشرے کی برکت سے وصول کیا ہے۔ انھیں عوام کے مسائل، عام آدمی کی محرومیوں، بے بسی اور عصری ابتری کے تجزیے کا یا تو شعور ہی نہیں یا یہ لوگ جان بوجھ کر ''کچلے اور پسے'' بنے ہوئے ہیں، لہٰذا سب اچھا ہے کے نعرے مارتے ہیں۔

اب ان ''اہل دانش'' کو کون سمجھائے کہ جب تک تعلیم و ترقی کے برابر مواقع، اجتماعی عدل اور سماجی انصاف پر مبنی معاشرہ قائم نہ ہو تو ترقی کے انفرادی یا گروہی اشاریے بے معنی، وقتی اور قومی زوال کی علامت ہوتے ہیں۔

ایک زمانے میں جاوید چودھری افغانستان کی طالبان حکومت کو بھی بہت آئیڈیلائز کرتے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں میڈیا کو عالمی حالات کے تجزیے کے لئے عموماً فرصت ہی نہیں ملتی اور اگر وہ کوئی ایسا شغل کریں بھی تو صورتحال کا درست ادراک اور تجزیہ نہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کر پاتے۔ کچھ یہی معاملہ ہمارے ساتھ لیبیا میں کرنل قذافی کی حکومت کے خلاف بغاوت اور حکومت کی تبدیلی کے دوران رہا۔ ہمارے ہاں تصویر کا وہی رخ اور غالب پہلو نمایاں کیا جاتا رہا جس کا راگ مغربی میڈیا الاپتا رہا۔ جاوید چودھری بھی اس کارِ خیر میں پیش پیش تھے اور اس حوالے سے انھوں نے متعدد کالم بھی داغے حالانکہ استعمار اور سامراج کے ایجنڈے کو سمجھنے والے اہل نظر کو سالہا سال سے ادراک تھا کہ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کے تحت عالمی طاقتیں اپنے مفادات کو حاصل کرنے کے لئے کیا عزائم رکھتی ہیں اور شطرنج کی کیسی بازی لگا چکی ہیں۔ 2003ء کے اوائل میں امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ کولن پاول نے سیکورٹی کونسل میں کہا تھا ''ہمیں مشرقِ وسطیٰ کی شکل بدلنی ہے''۔ اس بیان کے تناظر میں فروری 2003ء میں معروف دانشور اور صحافی احمد بشیر نے مشرقِ وسطیٰ میں امکانی تغیر و تبدل کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ اُن کے کئی اندازے درست ثابت ہوئے اور مذکور خطے میں قریباً ویسی ہی صورتحال بنی جس کی طرف اُنھوں نے اشارہ کیا تھا۔ ''امریکہ کا ارادہ تمام عرب ممالک کو مشرف بہ جمہوریت کرنا ہے۔ یعنی اُن کے نظام ہائے حکومت تبدیل کرنا اور ان پر اپنے آدمی بٹھانا ہے۔ اس لیے ان کی خیر نہیں۔ لیبیا، اردن، شام، سعودی عرب داستان سرائی کے لئے رہ جائیں گے''۔ ''شام کو حکم دیا جائے گا کہ وہ لبنان کی حزب اللہ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے اور اسرائیل کو اُردن اور لبنان کو دبا لینے کا موقع دے''۔ ''بعث پارٹی اور بشر الاسد کو ہٹا، یا مار دیا جائے گا''۔ ''لیبیا اگرچہ مرکز سے دور دراز ہے مگر امریکہ کے نشانے پر ہمیشہ سے رہا ہے۔ اس کا تیل نہایت عمدہ ہے۔ قذافی اب تک زندہ ہیں تو حیرت کی بات ہے مگر ان کے دن گنے جا چکے ہیں''۔ ((25

2011ء میں لیبیا میں آنے والی تبدیلی کے اس پس منظر کا جاوید چودھری نے اپنے کئی کالموں میں کہیں ذکر نہیں کیا البتہ وہ کرنل قذافی اور ان کے خاندان کو ہی محض مطعون ٹھہراتے رہے اور اسی پراپیگنڈے کی جگالی کرتے رہے جو مغربی میڈیا قذافی کے خلاف کر رہا تھا۔ (30,27 اکتوبر، 25 نومبر 2011ئ۔ روزنامہ ایکسپریس لاہور)

جاوید چودھری اپنے کالموں میں ایک اور تکنیک کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ پانچ کالموں میں ہلکے پھلکے انداز میں کسی کی مخالفت میں لکھتے ہیں۔ پھر ایک زبردست کالم اُسی فرد، گروہ یا پارٹی کے حق میں لکھ کر حساب برابر کر دیتے ہیں۔ یوں غیر متوازن ہونے کا الزام بھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نہیں لگتا اور بہادری کے چرچے بھی ہو جاتے ہیں۔

اردو کالم نگاری میں ایک اور بڑا نام ہارون الرشید کا ہے۔ وہ منفرد اسلوب کے حامل کالم نگار ہیں اور ایک وسیع حلقہ قارئین رکھتے ہیں۔ چونکہ کافی عرصے سے وہ عمران خان کے حوالے سے کپتان کپتان کی مالا جپتے آ رہے ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ کچھ عرصے سے عمران خان مسلم لیگ (ن) کی ''چھیڑ'' بن چکے ہیں۔ ہارون الرشید اکثر اپنے کالموں میں عمران خان کی تعریف اور میاں برادران کی کھچائی کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ''ن لیگ'' کے متعلقین کو یہ ''طریقہ واردات'' بہت کھلتا ہے۔ ''جواب آں غزل' کے طور پر، پرویز رشید نے بھی ہارون الرشید کے خلاف کچھ کالم داغے ((26 لیکن ن لیگ کے تلخ زبان سینئر مشاہداللہ خان نے ہارون الرشید کے حوالے سے سخت طرزِ تحریر اپنایا اور ذاتی حملے کیے۔ اُن دنوں ہارون الرشید روزنامہ جنگ میں لکھا کرتے تھے۔ لہٰذا مشاہداللہ خان نے بھی ''کپتان کا کالم نویس اور مسلم لیگ ن'' کے عنوان سے تین اقساط پر مشتمل کالم 'جنگ' ہی میں تحریر کیا۔

''ناتمام'' والے ہارون الرشید ایک صاحب طرز قلم کار ہیں۔ صحافتی انشاء پردازی میں ان کا اپنا انداز ہے ان کی کسی تحریر پر ''ناتمام'' کا ''لوگو'' نہ بھی ہو تو قارئین پہچان جائیں گے کہ صاحب تحریر کون ہے۔ یہی نہیں ان کے سیاسی تجزیے افسانوں کا لُطف دیتے ہیں جبکہ اپنے ممدوح ''کپتان'' کے حوالے سے ان کے دعوے مزاح کی چاشنی لیے ہوتے ہیں۔

ان کا طویل صحافتی کیریئر بھی مختلف تجربات اور مشاہدات کا حامل ہے۔ ایوب خان کے آخری دور میں وہ رحیم یار خان سے لاہور آئے۔ جماعت اسلامی کے روزنامہ کوہستان سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اس کے بعد شاید وہ کسی اور ادارے میں بھی گئے ہوں لیکن ہمیں اتنا ہی یاد ہے کہ بھٹو دور کے آخر میں وہ پیپلز پارٹی کے 'مساوات' میں خدمات انجام دے رہے تھے پی این اے کی تحریک کے نتیجے میں، بھٹو کا انجام نوشتۂ دیوار بن چکا تھا جب اُنھوں نے 'مساوات' کو خیر باد کہا۔ کسی اخبار سے اخبار نویس کا استعفیٰ معمول کا درجہ رکھتا ہے لیکن انھوں نے اس کا اعلان ایک کھلے خط میں کرنا ضروری سمجھا کہ ''اب'' ان سے ''بھٹو فسطائیت'' مزید برداشت نہیں ہوتی۔ ضیاء الحق دور کے افغان جہاد میں وہ اس جہاد کی ترجمان ایک نیوز ایجنسی ''ایجنسی افغان پریس'' سے وابستہ تھے۔ اس دوران جہاد اور مجاہدین کی حمایت میں لکھی گئی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اپنی نظموں اور افسانوں کو پتہ نہیں، آج وہ ''اون'' کرتے ہیں یا نہیں؟

بہاولپور حادثے کے بعد آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمن پر ان کی کتاب ''فاتح'' نے ان کی شہرت میں مزید اضافہ کیا۔ لیکن یہ کتاب جنرل ضیاء الحق اور اختر عبدالرحمن کی اولاد میں غلط فہمیوں کا باعث بھی بنی کہ اس میں افغانستان کی فتح کا سہرا ضیاالحق کی بجائے جنرل اختر عبدالرحمن کے سر باندھا گیا تھا۔ آخر اس پراجیکٹ پر پیسے بھی تو ان ہی کی اولاد نے خرچ کیے تھے اس کے بعد شاید ہی تلافیٔ مافات کے لئے فاضل مصنف نے جنرل ضیاء الحق پر بھی کتاب لکھنے کا اعلان کر دیا اس کا نام بھی تجویز ہو گیا ''غازی''۔ ''تکبیر'' میں اس کا اعلان بھی ہو گیا لیکن ضیاء الحق کے ورثا اس پر سرمایہ خرچ کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس دور ان فاضل قلم کار نے میاں محمد شریف (مرحوم) پر بھی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ''مرد آہن'' لیکن یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ 1993ء کے الیکشن میں وہ قاضی حسین احمد صاحب کے پاکستان اسلامک فرنٹ کی تشہیری مہم کا اہم کردار تھے۔ تب ان کا قلم قاضی صاحب کو قوم کی ڈوبتی ناؤ کا واحد کھیون ہار، قومی امراض کا واحد مسیحا اور حال و مستقبل کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی واحد کرن قرار دے رہا تھا۔ (2007ء کی عدلیہ بحالی مہم کے دوران پنجاب یونیورسٹی میں کپتان کے ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ کی بدسلوکی پر جناب ہارون الرشید نے اپنے کالم میں قاضی صاحب کو جو گالی دی، وہ توکل کی بات ہے)۔

اس دوران ان پر تحریک الاخوان کے ملک اکرم اعوان کی کرامات اور برکات آشکار ہوئیں اور انھوں نے ایک کالم میں ان کی بیعت کا باقاعدہ اعلان بھی فرما دیا۔ اب کچھ عرصے سے وہ ایک اور درویش کے کشف و کرامات سے فیض یاب ہونے کے ساتھ ساتھ کپتان کی ترجمانی فرما رہے ہیں۔ قرآن وحدیث سے شروع ہو کر قرآن وحدیث ہی پر کالم کا اختتام کرتے ہوئے درمیان میں درویش کی پیش گوئی اور تاریخی واقعات کے بیان کے ساتھ کپتان کی تعریف وتوصیف اور اس کے مخالفین کی مذمت وتضحیک بھی فرماتے ہیں''۔ (27)

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت یا فرد کا عائد کردہ الزامات یا زیادتی کا جواب دینا حق بنتا ہے اور ایسا مہذب انداز اور دلائل کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ مگر سینئر مشاہد اللہ والا طریقہ کسی بھی پارٹی کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے چونکہ کالم نگار نے تو ہر دوسرے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چوتھے روز چھپنا ہوتا ہے لہٰذا اپنے آپ کو ذاتی حملہ کر کے نشانے پر رکھوالینا دانشمندی نہیں۔

سنیٹر مشاہداللہ کے جواب میں ہارون الرشید کچھ زیادہ مشتعل نہ ہوئے۔ مختصراً جواب دیا مگر معاہدہ جنگ بندی توڑنے کا اعلان کیا۔ ''نون لیگ کے مضمون نگار نے (اور یہ سنیٹر صاحب نہیں) ماضی کے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا، ان میں سے بعض درست ہیں اور بعض غلط، تعبیر تقریباً تمام غلط۔ اور جو درست ہیں، ان سے سبق سیکھنے اور اپنی اصلاح کرنے کی کوشش صد شکر کہ میں نے کی ہے''۔ ''اگر کوئی روپیہ لے کر سیاستدانوں اور سیاسی پارٹیوں کی حمایت کرتا ہے تو اس پر خدا کی لعنت۔ اگر ایسا نہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ایسا نہیں تو ایک ہزار مضامین بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' ''میاں شہباز شریف کی آرزو پر بعض معاملات میں جنگ بندی کا جو فیصلہ میں نے کیا تھا، آج میں اس کے خاتمے کا اعلان کرتا ہوں۔ زیادتی انشاءاللہ کبھی نہ کروں گا مگر یہ Truce آج ختم ہوا۔ اپنے ترکش میں اب کوئی تیر وہ بچا کر نہ رکھیں''۔ ((28

یہاں کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک صحافی اور سیاسی جماعت کی جنگ اور پھر جنگ بندی؟ چہ معنی دارد؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے کچھ ایسے ایشوز تھے جن پر بات کرنی چاہئے تھی اور آپ بات کرتے بھی رہے پھر اصولوں پر کچھ سمجھوتہ ہو گیا لہٰذا آپ نے اُن ایشوز کو چھیڑنا بند کر دیا۔ دوسرے فریق کی طرف سے حملے کے بعد وہ سمجھوتہ توڑنے کا اعلان کر رہے ہیں؟ اور اب آپ ''مخالف فریق'' پر کسی اصول کی بنیاد پر نہیں بلکہ ذاتی پسند، ناپسند کی بنیاد پر حملے کریں گے؟ اور ان کے کسی اچھے کام کی تعریف بھی نہیں کریں گے؟ اور واقعی بعد ازاں ہارون صاحب کچھ ایسے ہی کرتے رہے۔ 5 فروری 2013ء کو روزنامہ ''دنیا'' میں انھوں نے اپنے کالم میں مضحکہ خیز انداز میں حمزہ شہباز اور دیگر سیاستدانوں کے طرز عمل کو جمہوریت کے لئے خطرہ قرار دیا۔ پھر اسی اخبار میں 8 مارچ 2013ء کو انھوں نے شریف برادران کے لیے بہت سطحی زبان استعمال کی۔ ''آج شریف خاندان جمہورت کا سب سے بڑا چمپئن ہے۔ جنرل محمد ضیاالحق جسے گود میں بٹھا کر دودھ پلاتے رہے، خفیہ ایجنسیوں نے جس کے سر پہ سایہ کیے رکھا۔ جنرل جیلانی جس کے اتالیق اور سرپرست تھے۔ اب بھی جس کے فرستادے جنرل کیانی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نیک چلنی کا یقین دلاتے ہیں۔ عربوں اور امریکیوں کے جو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نیاز مند اور بھارت نواز اخبار نویسوں کے نخرے اٹھاتے ہیں کہ پاکستانی پریس میں وہ موثر ہیں۔ دانشوروں کی پرورش اور کردار کشی، دونوں میں شریف برادران کا ثانی کوئی نہیں"۔ اپنے اسی غیر سنجیدہ طرزِ عمل کے تسلسل میں ایک دفعہ پھر انہوں نے 29 مارچ 2013 کو "دنیا" ہی میں تحریر کیا: "شریف خاندان آئی ایس آئی اور جنرلوں کی گود میں پروان چڑھا ورنہ وہ کہاں کے سیاست دان تھے۔" یہی بات انہوں نے اپنے 26 اپریل 2013ء کے کالم میں بھی دہرائی۔

بے شک یہ باتیں درست بھی ہوں تو بیان کرنے کا انداز مناسب نہیں۔ ماضی کی غلطیوں کو آج کے اچھے عمل پر مٹی ڈالنے کے لئے طعنے کے طور استعمال کرنا، قابل ستائش نہیں لگتا۔ محض اسی طرزِ عمل کے باعث بے شمار لوگ عطاالحق قاسمی، عرفان صدیقی اور ہارون الرشید کے کالم نہیں پڑھتے کیوں کہ عمومی تاثر بن چکا ہے کہ مخصوص راگ الاپنے کے علاوہ ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔

گو کہ مئی 2014ء کے عام انتخابات کے بعد بتدریج ہارون الرشید صاحب نے "کپتان کی گردان" کم کر دی لیکن اچھی بات یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کیا بلکہ آئندہ کے لئے اپنے یک طرفہ رویے پر نظر ثانی کا عندیہ بھی ظاہر کیا ہے۔ "عمران خان کے باب میں یہ ناچیز ایک عظیم الشان حماقت کا مرتکب ہوا۔ اخبار نویس کا کام تجزیہ کرنا ہے، سیاست نہیں۔ خیر، میں نے اس کی قیمت چکائی اور بہت کچھ سیکھا۔ آئندہ سے مگر ارادہ کر لیا کہ خواہ ذاتی دوستی ہو، کسی لیڈر، کسی پارٹی کے قافلے میں کبھی شامل نہ ہونا چاہئے۔ کسی قیمت پر"۔ "آخر کار یہ اندازہ ہو گیا کہ اس لنکا میں سبھی باون گزے ہیں۔ اخبار نویس کے لئے کاروبارِ سیاست کوئلہ کی دلالی ہے۔" (روزنامہ دنیا۔ 12 ستمبر 2014ئ) یہ اقتباس پڑھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ "ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"۔ بہر حال ہارون الرشید صاحب کو تو بات سمجھ آ گئی ہے۔ اور عرفان صدیقی نے وزیر اعظم کا مشیر خاص بننے کے بعد کالم نہ لکھنے کا اچھا فیصلہ کیا ہے اب رہ گئے قاسمی صاحب تو انھیں چاہئے یا تو باقاعدہ مسلم لیگ (ن) میں شامل ہو جائیں۔ گورنر تو وہ بن نہیں سکے کم از کم وزیر ہی بن جائیں تا کہ کھل کھلا کر میاں برادران کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ (ویسے ایمانداری کی بات ہے قاسمی صاحب کا گورنر بننا گورنری کی عزت میں اضافہ کرتا)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کالم نویسوں میں ایک گروپ ''بشارتی یا خوابی'' بھی ہے۔ ان حضرات کو حالات حاضرہ کے متعلق مختلف خواب آتے ہیں یا بشارتیں اور وعیدیں ملتی ہیں، جن کو یہ لوگ پھر اپنے کالموں میں بیان کرتے ہیں۔ ان کالم نویسوں میں سے چند کے بابے بھی ہیں (حالانکہ پہلے صرف اشفاق احمد ہی اس حوالے سے معروف تھے) اس ''بشارتی اور وعیدی'' گروپ میں ہارون الرشید، اور یا مقبول جان اور ڈاکٹر صفدر محمود نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو بعض اوقات تاریخی حوالوں کو بھی اپنے خوابوں کے ذریعے درست کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ مؤرّخ بھی ہیں اور دانشور بھی۔ 17 جولائی 2011ء کو اُنھوں نے روزنامہ جنگ میں ''بے غیرت سیاست'' کے عنوان سے کالم تحریر کیا، جس میں انھوں نے سیاست دانوں کی بے اصولیوں اور سیاسی سمجھوتوں کو برا بھلا اور بے غیرت کہا اور آخر میں اُن کے کالم کی تان اس فقرے پر ٹوٹی ''کیا ڈرون حملے اور ایبٹ آباد آپریشن بھی ہماری بے غیرت سیاست کا ہی شاخسانہ نہیں'' پاکستان کا عام صحافی اور باشعور شہری بھی خوب جانتا ہے کہ ڈرون حملے کس کی اجازت سے ہوتے ہیں اور کون ان حملوں کو روک سکتا ہے۔ رہ گئی بات ایبٹ آباد آپریشن کی تو کیا ڈاکٹر صاحب کو نہیں پتہ اس کی اصل کہانی کیا ہے؟ اس کو روکنا کس کے بس میں تھا اور کون بے بس؟ سیاست اور ''بے چارے'' سیاستدانوں کو تو ڈاکٹر صاحب نے کمزور جان کر بے غیرت کہہ دیا اور بے عزت کر دیا ذرا اُن مقتدر حلقوں کو بے نقاب کرنے کے لئے قلمی جہاد فرمائیں بقول شخصے جن کے قبضہ قدرت میں پاکستان اور ہماری جان سمجھتی جاتی ہے اور جو ہماری قسمت کے نام نہاد مالک بنے بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود جیسے دانشور اور مؤرّخ کے قلم سے سرزد ہونے والے اکثر سطحی کالم پڑھ کر پاکستان کی دانشورانہ کلاس کی علمی و تجزیاتی صلاحیت پر رونا آتا ہے۔

میاں برادران کے ایک اور قصیدہ گو رؤف طاہر کا ذکر نہ کرنا بھی زیادتی ہوگا۔ وہ کام میاں صاحبان کا کرتے ہیں اور تنخواہ سرکار سے لیتے ہیں۔ ان کا پسندیدہ موضوع ''عمران خان کی خامیاں'' اور ''شریف برادران کی خوبیاں'' ہے۔ لیکن انہیں عمران خان کا تذکرہ زیادہ مرغوب ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی کی ذاتی زندگی میں بھی جھانکنے سے باز نہیں آتے۔ عمران خان کی دوسری شادی کے بعد موصوف نے 13 جنوری 2015ء کو روزنامہ جنگ میں ''عمران خاں بہنوں کو منالاتا'' کے عنوان سے کالم تحریر کیا۔ نہ انھیں خود صحافتی اقدار کا پاس ہے اور نہ ہی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اخبار کے ادارتی کرتا دھرتاؤں کو پرواہ ہے کہ موصوف کے نام کے ساتھ لکھ دیا جائے کہ جناب اپنی خدمات کے عوض ''پاکستان ریلویز'' میں بھاری بھرکم معاوضے پر ڈی جی پی آر کے عہدے پر براجمان ہیں۔ قبل ازیں وہ حکومت پنجاب کے محکمہ تعلقاتِ عامہ میں بھی سرکاری عہدے سے نوازے گئے تھے۔

دو نامور شخصیات امجد اسلام امجد اور ڈاکٹر اجمل نیازی بڑھ چڑھ کر بُرا کالم لکھتے ہیں۔ اور بعض اوقات قاری کے لیے یہ فیصلے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس مقابلے میں اوّل اور دوئم کون ہے مگر اکثر اوقات ڈاکٹر اجمل نیازی ہی فاتح قرار پاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کوئی کالم اُٹھا لیں ماشاء اللہ ہر چھ سات فقروں کا اگلے فقروں سے کوئی ربط نہیں ہوگا، مزید اربات یہ ہے کہ پورا کالم اسی تسلسل کا حامل ہوتا ہے۔ ایسا بے ربط کالم لکھنے میں نیازی صاحب یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ جناب امجد اسلام امجد کا شمار جدید نظم کے نمایاں شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ٹی وی کے لیے متعدد مشہور ڈرامے بھی لکھے۔ مگر سمجھ نہیں آتا ''وارث'' جیسے مقبولِ عام ڈرامے کے ڈائیلاگ لکھنے اور خوبصورت گفتگو کرنے والے امجد صاحب اتنا بورنگ اور سپاٹ کالم کیسے لکھ لیتے ہیں؟ شاید سالہا سال سرکاری نوکری کرنے کے بعد اُن میں براہ راست کھل کر بات کرنے کی صلاحیت معدوم ہوگئی ہے یا وہ خود ہی اسے بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ بہرحال اخبار کے صفحات پر چھپنے والی اُن کی تحریر اکثر کالم سے زیادہ اُن کا پھیکا سا سفرنامہ ہوتا ہے، جسے وہ بہت اہتمام سے لکھتے رہتے ہیں۔

منفرد لہجے کے نامور شاعر ظفر اقبال ''دال دلیا'' کے نام سے کالم لکھتے ہیں۔ ان کے فرزند اور مشہور اینکر آفتاب اقبال کسی اور نام سے کالم لکھتے ہیں حالانکہ اُن کا کالم بھی دال دلیا ہی ہوتا ہے۔

خواتین کالم نگاروں میں زاہدہ حنا کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ سماجی اور عصری حالات کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔ اُن کا کالم ادبی چاشنی سے مزین ہوتا ہے۔ وہ گاہے گاہے نواز شریف کی تعریف کرنا اور ان کے مخالفین کی کھچائی کرنا نہیں بھولتیں۔ کشور ناہید کے لکھنے کا ایک مخصوص رنگ ہے۔ اپنی تحریر میں کاٹ دار جملوں اور طنز کا بھرپور استعمال کرتی ہیں۔ ناراضی کا پہلو بھی اُن کے کالموں میں نمایاں نظر آتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حامد میر کا شمار بھی بلا مبالغہ عہدِ حاضر کے بڑے کالم نگاروں میں کیا جا سکتا ہے۔ اُن کا کالم ''قلم کمان'' نئی اطلاعات سے لیس ہونے کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔ اُن کی تحریر میں بلا کی روانی اور بے ساختگی ہوتی ہے۔ مشکل الفاظ اور تراکیب کا سہارا لیے بغیر وہ اپنے نقطۂ نظر کے ابلاغ پر قدرت رکھتے ہیں۔ مگر اپنے والد مرحوم پروفیسر وارث میر کی نسبت اُن کے کالموں میں گہرائی نہیں ہوتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حامد میر ایک عملی صحافی ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں گزشتہ کچھ سالوں سے حامد میر کے کالموں سے ''شوخا''، Loud، آپے سے باہر اور مشتعل ہونے کا تاثر ابھرتا ہے جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شروع ہی سے ایسے ہیں۔ غالباً یہ خیال درست نہیں، البتہ وہ جذباتی ضرور ہیں۔

رؤف کلاسرا بھی اردو کالم نگاری میں ایک اچھا اضافہ ہیں۔ ان کی تحریر، سہل، رواں اور ابلاغ سے بھرپور ہوتی ہے۔ وہ اپنے کالموں میں متنوع موضوعات زیرِ بحث لاتے ہیں۔ بعض اوقات اُن کی تحریروں میں پیپلز پارٹی کی طرف واضح جھکاؤ محسوس ہوتا رہا ہے مگر اُن کا انداز درباری نہیں ہوتا۔ البتہ 19 دسمبر 2010ء کو انھوں نے روزنامہ ایکسپریس میں اپنے تحریر کردہ کالم میں پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین چودھری نثار علی خاں کی طرف سے ڈی جی ریڈیو مرتضیٰ سولنگی سے ایک میٹنگ کے دوران میں روا رکھے جانے والے ہتک آمیز سلوک کی بھرپور مذمت کی۔ بے شک چودھری نثار نے اگر ناروا سلوک کا مظاہرہ کیا تو اس کی مذمت ہونی چاہئے تھی۔ مگر اُسی کالم میں آگے چل کر رؤف کلاسرا نے مرتضیٰ سولنگی صاحب کو ساتویں آسمان پر چڑھا دیا کہ جیسے انھوں نے اپنے کیریئر کی بہت بڑی قربانی دی ہو اور ریڈیو پاکستان کی سربراہی سنبھال کر کوئی قومی احسان کیا ہو حالانکہ ایسا ہرگز کچھ نہیں تھا۔ ان کی کارکردگی کے حوالے سے کالم میں بیان کردہ صورتحال مبالغہ آمیز تھی۔ شاید اس ساری مدح سرائی کی وجہ یہ ہو کہ ان دنوں ڈی جی ریڈیو نے رؤف کلاسرا کے بھائی خضر کلاسرا کی تعیناتی ریڈیو پاکستان میں ابلاغ عامہ کے افسر کے طور پر کی تھی۔

اُردو کالم نگاروں میں ایک اور اچھا اضافہ نصرت جاوید کا ہے۔ وہ انگریزی صحافت کا طویل تجربہ رکھتے ہیں، اپنی تحریر میں ''برملا'' بات کر جاتے ہیں۔ وہ مشکل صورتحال کو بیان کرنا اور بوقت ضرورت طنز کا بھرپور استعمال کرنا جانتے ہیں۔ مگر ہر دوسرے، تیسرے کالم

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں اپنے رپورٹر ہونے اور رپوٹنگ کے لیے اسلام آباد کے ڈرائنگ روموں میں جانے اور سرِ شام ریٹنگ بڑھانے کے لیے اینکرز کا سرخی پاؤڈر لگا کر سکرینوں پر بیٹھ جانے کا بے جا تذکرہ بعض اوقات برملا تو نہیں البتہ بے محل ضرور لگتا ہے۔

عباس اطہر شاندار اور صاحب طرز کالم نویس تھے۔ ان کی تحریر اپنے اندر ایک خاص طرح کا طنز، باریکی اور زبردست ابلاغ سموئے ہوتی تھی۔ وہ بلاؤ کے اپنی بات کیے جاتے۔ اُن کے موضوعات متنوع اور جاندار ہوتے۔ وہ بظاہر سیدھے سادے معاملات میں سے بھی کئی پہلو اور تہہ در تہہ معانی نکالنے پر ملکہ رکھتے تھے۔

اظہار الحق، خورشید احمد ندیم، مقتدا منصور اور وجاہت مسعود دلائل سے بات کرنے والے کالم نگار ہیں۔ ان کی تحریریں عموماً توازن کی حامل ہوتی ہیں۔ مذکور کالم نگاروں کے کالم پڑھ کر اکثر قاری کو سوچ کے نئے زاویے ملتے ہیں۔ وجاہت مسعود خوبصورت اور رواں نثر لکھتے ہیں۔ اُن کی تحریر زبان و بیان کی لذت کے ساتھ ساتھ دلائل سے بھی مزین ہوتی ہے۔

مزاحیہ شاعر کے طور پر معروف، خالد مسعود خاں بھی اچھا کالم لکھتے ہیں۔ کالم نگاری کے میدان میں نئے آنے والوں میں عامر خاکوانی، یاسر پیرزادہ، عمار چودھری، عابد میر (کوئٹہ) اور سعدیہ قریشی اگر اسی طرح محنت کرتے رہے تو آگے چل کر یہ بڑے نام بنیں گے۔

عامر خاکوانی وسیع المطالعہ اور سوچ سمجھ کر لکھنے والے کالم نگار ہیں۔ ان کے بعض کالموں میں بے ساختگی کی کمی محسوس ہوتی ہے اور ان کی تحریر بوجھل اور مصنوعی سنجیدگی کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ یاسر پیرزادہ باصلاحیت شخص ہیں۔ وہ اگر ''انکم ٹیکس'' کی 'انکم' سے توجہ ہٹا کر پوری طرح میڈیا مین بن جائیں۔ تو وہ نہ صرف کئی گنا زیادہ کما سکتے ہیں بلکہ زیادہ بولڈ اور بہتر انداز میں اپنے نقطہ نظر کا اظہار اور تجزیہ نگاری کر سکتے ہیں۔ (یاسر پیرزادہ انکم ٹیکس کے محکمہ میں ایڈیشنل کمشنر ہیں) غیر دلچسپ موضوعات، کھل کر بات نہ کرنے اور مجہول طرز تحریر کی بنا پر بعض اوقات ان کا کالم بورنگ، بے تکی طوالت اور سطحیت کا احساس دلاتا ہے۔ البتہ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال میں انھوں نے کئی اچھے موضوعات پر کالم لکھے۔ اسلامی نظریاتی کونسل، بینکاری، ملالہ، اور دیگر کچھ عنوانات پر اُن کی تحریروں کو بہت سراہا گیا۔ البتہ گول مول انداز میں وہ اپنے والدِ محترم جناب عطاالحق قاسمی کی طرح گاہے بگاہے عمران خان اور ان کی جماعت پر تبرا کرنا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نہیں بھولتے۔

سعدیہ قریشی ''پوری گواہی'' کے خوبصورت عنوان سے کالم لکھتی ہیں۔ اُن کی تحریر میں ادبی چاشنی اور خاص طرح کی نسوانیت سموئی ہوتی ہے۔ وہ ہلکے سے انداز میں بات شروع کرتی ہیں اور بہتی ندی کی طرح ان کا کالم آگے بڑھتا رہتا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں جب سے انھوں نے دوبارہ روزنامہ دنیا میں کالم نگاری شروع کی ہے ان کے کالم کا معیار پہلے سا نہیں رہا۔

اسد اللہ غالب اور تنویر قیصر شاہد کے بعض کالم چیخ چیخ کر پکار رہے ہوتے ہیں کہ وہ کس کے کہنے اور کسی پالیسی کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ایک اچھا کالم نگار جس نے اپنے آپ کو بے دریغ ضائع کیا وہ خوشنود علی خان ہیں۔ آج کل وہ شاید کسی ''کھجور مارکہ'' اخبار میں کالم لکھتے ہیں۔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک فاروق قیصر بھی خوبصورت کالم لکھتے ہیں۔ شاید اُن کی ہمہ جہتی نے ہی اُنھیں نمایاں کالم نگار نہیں بننے دیا۔ نامور اینکر طلعت حسین بھی 'براہ راست' کے نام سے کالم لکھتے ہیں لیکن وہ جتنے بلند پایہ ٹی وی میزبان ہیں ان کا کالم اس کے عشرِ عشیر بھی نہیں۔ ان کے 24 اکتوبر 2010ء کو روزنامہ ایکسپریس میں انجلینا جولی کے حوالے سے تحریر کردہ کالم کا صحافتی حلقوں میں بہت مذاق اڑایا گیا اور آج بھی لوگ اس کالم کو یاد کر کے ہنستے ہیں۔ انگریزی میں لکھنے والوں کے ساتھ بعض اوقات یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اردو میں زیادہ رواں اور ابلاغی نہیں ہوتے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو کر چھپنے والے کالم نگاروں میں ایاز امیر، کلدیپ نیئر اور نجم سیٹھی نمایاں ہیں۔ مرحوم اردشیر کاؤس جی کا کالم بھی ترجمہ ہوتا اور شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ وہ سماجی اور سیاسی ایشوز پر کھل کر اظہار کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے بہادر آدمی کے طور پر جانے جاتے تھے جو بلا خوف و خطر اپنی بات رقم کرتا ہو۔ نجم سیٹھی اعلیٰ پائے کے تجزیہ نگار ہیں۔ مگر ان کے کالم کا اردو ترجمہ اکثر پھسپھسا محسوس ہوتا ہے۔ غالباً وہ یہ کالم اپنے انگریزی ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز کے لئے بطور ایڈیٹوریل لکھتے ہیں جو بعد ازاں ترجمہ ہو کر اردو میں چھپتا ہے۔ کلدیپ نیئر اور ایاز امیر کے کالم بہت رواں اور خردافروز ہوتے ہیں۔ ایاز امیر کے طرزِ تحریر، غیر جانبدارانہ تجزیے اور زیرِ بحث متنوع موضوعات کی جتنی تعریف بھی کی جائے کم ہے۔ وہ پانچ سال مسلم لیگ ن کی طرف سے ممبر قومی اسمبلی رہے مگر عمومی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

طور پر ان کی غیر جانبداری مشکوک نہیں ہوئی۔ البتہ 2013ء کے جنرل الیکشن میں مسلم لیگ (ن) کا ٹکٹ نہ ملنے کے بعد ان کا لہجہ شریف برادران اور مسلم لیگ (ن) کی سیاست کے حوالے سے قدرے تلخ خیال کیا جاتا ہے۔ گذشتہ کچھ عرصے سے وہ اپنے کالم میں ''خاص مشروب'' کا تذکرہ بھی تواتر سے کر رہے ہیں، جو بعض اوقات اضافی اور بے جا محسوس ہوتا ہے۔

ایک اور ہمہ جہت شخصیت مستنصر حسین تارڑ، اخبار جہاں میں سالہا سال سے، ہفتہ وار کالم اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں لکھتے ہیں۔ سینئر صحافی عبدالقادر حسن بھی ایک مدت سے اخبارات کے صفحے کالے کر رہے ہیں۔ چونکہ عرصہ دراز سے اس میدان میں ہیں لہٰذا کبھی کبھی کالم بھی لکھ ڈالتے ہیں۔ احمد بشیر کے بقول ''ہر حکومت کے لیموں نچوڑ'' الطاف حسن قریشی ویسے تو حکمرانوں کی حاشیہ برداری میں باضابطہ مہارت رکھتے ہیں لیکن جنرل یحییٰ، ضیا، پرویز مشرف اور جنرل کیانی کی بے جا خوشامد سے لبریز ان کے کالم پڑھ کر ہنسی آتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکری پرواز کی کیا سطح ہے۔ ((29 ان کی تحریر لفاظی اور تصنع سے مرصع ہوتی ہے۔

منو بھائی سینئر ترین کالم نگار ہیں۔ ان کا کالم ہمیشہ سے قارئین میں مقبول رہا ہے۔ اُن کی تحریر میں ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے ساتھ دانشورانہ چاشنی بھی ہوتی ہے۔ گزشتہ کچھ سالوں سے وہ اپنے کالم میں بعض اوقات اعداد و شمار گھسیڑ دیتے ہیں اور لوگ ان کی روایتی شگفتہ تحریر کے انتظار میں رہتے ہیں۔ سینئر صحافی رحیم اللہ یوسف زئی اور تجزیہ کار ڈاکٹر حسن عسکری کے کالم توازن اور مشکل موضوعات پر مہارت اور غیر جانبدرانہ اظہار خیال کی خوبصورت مثال ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں سامنے آنے والے کالم نویسوں میں ایک نمایاں ترین نام سلیم صافی کا بھی ہے۔ وہ زمانہِ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ کا حصہ رہے اور پہلی افغان جنگ میں عملی طور پر بھی شریک ہوئے۔ مگر ان کی تحریر میں حیران کن توازن ہے۔ اور وہ صورتحال کا گہرائی میں جا کر تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بعض لوگ ان کے طالبان اور مقتدر حلقوں سے قریبی تعلقات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور انھیں میڈیا میں طالبان کا نمائندہ کہتے ہیں مگر یہ درست اندازہ نہیں لگتا۔ ایک صحافی کو پیشہ ورانہ امور بہتر انداز میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سرانجام دینے کے لئے ہر قسم کے لوگوں سے روابط رکھنا پڑتے ہیں۔ محض اُسے کسی کا آلہ کار بننا مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔ جنوری 2013ء کے اوائل میں طاہر القادری کی سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے سلیم صافی کی تحریروں سے محسوس ہوا کہ شاید وہ بھی اکثر دیگر صحافیوں کی طرح توازن برقرار نہیں رکھ سکے۔ شاید مسلکی اختلاف اُن کے آڑے آ گیا ہو۔ بہرحال مجموعی طور پر انھیں ایک سنجیدہ اور متوازن تجزیہ کار کے طور پر تسلیم کر لیا گیا اور انھوں نے قابلِ تقلید حد تک اپنے مضامین کو بہتر بنایا تھا۔ مگر بدقسمتی سے گزشتہ کچھ عرصے سے ان کی تحریر میں ضرورت سے زیادہ تلخی اور جارحانہ پن نظر آتا ہے۔ عمران خان، تحریکِ انصاف، عرفان صدیقی، محمود اچکزئی اور طاہر القادری کے حوالے سے اُن کے کالم عدم توازن کا شکار لگے۔ متوازن تحریر ہی ان کے کالموں کا حُسن تھا مگر لگتا ہے وہ تیزی سے اس خوبی سے کنارہ کش ہوتے جا رہے ہیں، گویا کہ خود کش کالم نگار ہی بن گئے ہیں۔

انتظار حسین اُردو ادب کے صاحب اسلوب اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ وہ کئی سال مشرق اخبار میں بھی کالم لکھتے رہے۔ اُن کے کالم میں ادب کی چاشنی اور زبان کی خوبصورتی اور فقروں کی نشست و برخاست بہت مزہ دیتی ہے۔ وہ بات کرتے کرتے حالات حاضرہ پر بھی بہت ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ کر جاتے ہیں۔ بے شک اُن کا کالم تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔

راجہ انور بھی ایک اچھے کالم نویس ہیں۔ زبان و بیان پر انھیں عبور ہے۔ زندگی کی اونچ نیچ سے بھی وہ پوری طرح آگاہ ہیں۔ گزشتہ کئی سال وہ کالم نگاری کے میدان سے غائب رہے اور اس دوران کسی اخبار نے بھی انھیں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی، لیکن اچھی بات یہ ہے کہ 18 مارچ 2013ء سے انہوں نے دنیا اخبار میں کالم لکھنا شروع کر دیا۔ سعد اللہ جان برق بنیادی طور پر ادیب ہیں، ہلکے پھلکے انداز میں خوبصورت کالم لکھتے ہیں لیکن گذشتہ کچھ عرصے سے وہ پھر ''روپوش'' ہیں۔ مسعود اشعر سینئر صحافی اور ادیب ہیں۔ وہ لطیف پیرائے میں اپنی بات کرتے ہیں۔ امر جلیل کا کالم عموماً علامتی رنگ لیے ہوتا ہے۔ اپنی تحریر میں وہ گہرے طنز کا استعمال برملا کرتے ہیں۔

بعض کالم نگاروں کی طرف سے اپنے کالم میں کسی دعوت یا تقریب میں شمولیت یا بیرون ملک دورے کے حوالے سے بہت سے لوگوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ بالخصوص عطاالحق

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قاسمی اور امجد اسلام امجد اس حوالے سے کافی مشہور ہیں۔ بعض اوقات اس طرز تحریر پر تنقید بھی سامنے آتی ہے۔ اس حوالے سے کالم نگاروں کی مجبوری کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عام لوگوں یا کسی تنظیم کی طرف سے انھیں بطور سیلیبرٹی، دانشور یا شاعر مدعو کیا جاتا ہے اور مختلف طریقوں سے آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ کالم نگار اس حسنِ سلوک کا شکریہ کالم میں تذکرے کی صورت میں کرتے ہیں۔ ویسے بھی کالم نگاروں کو بات سے بات نکالنے کے لیے موضوعات اور کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ اپنے کالم کو محض اشتہار بنانے سے احتیاط بہتر ہے۔

گزشتہ کچھ عرصہ سے کالم نگاری میں ایک اور رجحان آیا ہے۔ غالباً تمام مشہور کالم نگاروں سے ضرورت مند مختلف طریقوں سے رابطہ کرتے ہیں۔ ایک ناہموار سماج میں یہ کوئی انہونی بھی نہیں۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی بھی کوئی جرم نہیں لہٰذا مختلف کالم نویسوں کی طرف سے ایسے لوگوں کا تذکرہ بھی سامنے آتا رہتا ہے۔ مگر روزنامہ ایکسپریس میں سینئر صحافی مرحوم حمید اختر صاحب نے ایسے لوگوں کا نہ صرف تذکرہ کرنا شروع کیا بلکہ اُن کے ٹیلی فون نمبر بھی درج کرنے شروع کر دیئے۔ بعد ازاں دیگر کئی کالم نگاروں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ ماہِ رمضان میں تو ایسے کالموں کی بھرمار ہوتی ہے۔ زمرد نقوی 'ایکسپریس' میں کالم نگاری فرماتے ہیں۔ وہ اپنے کالم کے آخر میں حالاتِ حاضرہ یا کسی معروف شخصیت کے حوالے سے کوئی نہ کوئی پیشین گوئی بھی درج کرتے ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے اُنھوں نے عوام الناس کو کال کر کے اپنے حال احوال پوچھنے کے لیے نمبر اور وقت بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اب بھی مستقلاً اُن کا ذاتی فون نمبر کالم کا حصہ ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں اس طریقہ کار کو معیوب اور پیشہ ورانہ طور پر غلط سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پہلے کالم نگاروں کی تصویریں بھی نہیں چھپتی تھیں۔ روزنامہ جنگ نے چند سال پہلے کالم نگار کی تصویر چھاپنے کا رواج ڈالا بعد ازاں دوسرے تمام اخبارات نے بھی یہ طریقہ اپنا لیا۔

بعض اوقات لوگ یہ گلہ بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ ہمارے کالم کو نہیں چھاپا گیا۔ اس حوالے سے یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کسی بھی اخبار کے نزدیک کسی تحریر کو چھاپنے کی پالیسی ہوتی ہے۔ اخبار کا ایڈیٹر دیکھتا ہے کہ لکھنے والا کون ہے؟ کتنے لوگ اسے پڑھنا چاہیں گے؟ تحریر کردہ موضوع کتنا اہم ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اخبار کے پاس مواد چھاپنے کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لئے جگہ بھی موجود ہے یا نہیں؟ ایک بات بہت واضح ہے کہ مستقل کالم نگاروں کی جگہ نئے لکھنے والے کا تحریری مواد خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو کسی بھی اخبار کے لئے اسے چھاپنا ترجیح نہیں ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ مستقل کالم نگاروں کی ایک فیس اور کمرشل (Face and Commercial) ویلیو بن چکی ہوتی ہے۔ لیکن یہ یقین رکھنا چاہئے کہ اچھی تحریر اپنی راہ خود بنا لیتی ہے۔ اردشیر کاؤس جی ڈان اخبار کے ایڈیٹر کے نام مستقلاً مختلف ایشوز پر خط لکھا کرتے تھے بالآخر اخبار کی انتظامیہ نے انہیں مستقل کالم لکھنے کی آفر کی جو انھوں نے قبول کی اور وہ سالہا سال پڑھنے والوں میں مقبول رہے۔ بدقسمتی سے اُردو اخبارات میں ''ایڈیٹر کے نام خط'' کا گوشہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مختلف اُردو اخبارات میں قارئین کی تحاریر سے چھوٹے چھوٹے اقتباسات ضرور شائع کئے جاتے ہیں لیکن ان اقتباسات سے وہ تاثر قائم نہیں ہوتا جو انگریزی اخبارات میں قارئین کی آراء تفصیلاً شامل کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اور تاریک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض اوقات اخبار کے پالیسی ساز منظر سے ہٹ جانے والے اہل قلم کو نظر انداز بھی کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ کتنا ہی اچھا کالم لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

کچھ بے چارے کالم نگار ایسے بھی ہیں جو غیر مقبول یا کم چھپنے والے اخباروں میں لکھتے ہیں لہٰذا جس دن ان کا کالم شائع ہوتا ہے وہ اپنے دوستوں کو ایس ایم ایس کرتے ہیں کہ آج فلاں اخبار میں میرا کالم پڑھ کر ثواب دارین حاصل کریں۔

ملک کے دو نامور کالم نگاروں نذیر ناجی اور حسن نثار سے کتاب ہٰذا کے لئے انٹرویوز کیے گئے تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ ہمارے کالم نگار عمومی طور پر کسی طرح سوچتے اور لکھتے ہیں۔ دونوں صاحبان سے ان کے متعلق صحافتی و عوامی حلقوں میں زیر بحث رہنے والے مختلف امور پر کھل کر بات ہوئی۔ بلاشبہ نذیر ناجی کا شمار عصرِ حاضر کے بڑے کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں اور خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ وہ حالات وہ واقعات پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کا تجزیہ کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔ عالمی تناظر پر بات کرتے ہوئے وہ صورت حال کے نئے پہلو سامنے لے کر آتے ہیں۔ اور قاری حیران ہوتا ہے کہ تصویر کا یہ رخ بھی ہو سکتا ہے۔ زبان و بیان پر انھیں عبور حاصل ہے اور ذہانت ان کی تحریر سے ٹپکتی ہے۔ نذیر ناجی مختلف رسائل و جرائد کے ایڈیٹر رہے ہیں وہ روزنامہ دنیا کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بانی گروپ ایڈیٹر بھی ہیں۔

نذیر ناجی صاحب کو انٹرویو کے لیے فون کیا تو کہنے لگے میں ذاتی حوالے سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ گزارش کی کہ سوال ہونگے، جواب دینا یا نہ دینا آپ کا حق ہے۔ دو چار مرتبہ فون کرنے کے بعد ملاقات کا وقت طے ہوا۔ مقررہ دن 11 جولائی 2011ء کی سہ پہر ان کے گھر پہنچے تو اُنھوں نے خوش آمدید کہا اور کولڈ ڈرنک سے نہ صرف تواضع کی بلکہ اپنی مصروفیات بھی تج دیں۔ دوران ملاقات انھوں نے کھل کر سوالات کے جواب دیئے۔ انٹرویو کے بعد الوداع کرتے ہوئے ازراہِ مذاق فرمانے لگے: ''کوئی سوال رہ گیا ہو تو ایجنسی یا نیب کے کسی بندے کو بھیج دینا۔''

نذیر ناجی

س: ناجی صاحب، لوگ آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتے ہیں مگر ایک عوامی تاثر (Public perception) غلط یا صحیح، یہ بن چکا ہے کہ حکومت یا حالات کے بدلتے ہی آپ پارٹی بھی بدل لیتے ہیں، اس میں کہاں تک سچائی ہے؟

نذیر ناجی: ریکارڈ تو اس بات کی تصدیق نہیں کرتا لیکن چونکہ میرے مخالفین اللہ کے فضل سے دروغ گوئی کرنے اور مسلسل جھوٹ بولنے کے عادی ہیں۔ عام قارئین ریکارڈ دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے۔ جب کوئی چیز مسلسل لکھی جائے تو وہ عوامی تاثر (Public perception) کا حصہ بن جاتی ہے۔ ورنہ اگر آپ ریکارڈ دیکھیں تو قومی سطح پر میری صحافتی زندگی 67ء، 66ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس دوران بھٹو صاحب زیرِ عتاب آچکے تھے۔ حکومت میں آکر بھی وہ مسائل کا شکار رہے۔ میں نے ان کے حق میں لکھا کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ عوامی قوتوں کے ترجمان ہیں۔ چونکہ استحصالی طبقے غریبوں اور مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں اس لیے بھٹو کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ یہ میرا تصور تھا۔ بھٹو صاحب جیل گئے۔ پھانسی لگنے تک جس طرح میں نے ان کے حق میں لکھا اس طرح تو ان کا اپنا روزنامہ بھی نہیں لکھتا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک بدنصیبی سے مساوات پر جماعت اسلامی کے صحافی قبضہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کر چکے تھے۔

☆ ان صحافیوں میں سے آپ کسی کا نام لے سکتے ہیں؟

○ بہت سے، جیسے اسلامی جمعیت طلبہ کے توصیف احمد خاں، مساوات کے نیوز ایڈیٹر بن کے بیٹھ گئے۔ میرا اپنا اخبار ''حیات'' اتنا پاپولر ہو گیا تھا کہ پیپلز پارٹی کے کارکن بھی اس پر زیادہ بھروسا کرنے لگے، جس پر اشتعال میں آ کر انھوں نے 'مساوات' میں مجھ پر الزام تراشی شروع کر دی۔ میں اپنی دُھن کا پکا تھا۔ مساوات سے تو کوئی گرفتار نہیں ہوا تھا سوائے بدرالدین کے جو بے چارہ رسمی ایڈیٹر تھا۔ ضیاء الحق نے جس صحافی کو سب سے زیادہ تکلیف پہنچائی وہ میں تھا۔ اگر میں حکومت کے ساتھ بدل جانے والا ہوتا تو ضیاء الحق کو مجھ سے اتنی تکلیف نہ ہوتی بلکہ میں تو ارب پتی ہو چکا ہوتا۔ اس کے جو اتنے سارے چمچے تھے وہ سارے مالدار ہو گئے اور میں بالکل ہی قلاش ہو گیا کیونکہ میرا اخبار بھی اس نے بند کیا۔ مجھے جیل میں بھی ڈالا، اور جس طرح مجھے جیل میں رکھا۔ ایسی جیل شاید کسی قلعے کی بھی نہیں ہوتی، اذیت دینے کے لیے کوٹھڑی کے فرش بھی اکھاڑ دیئے گئے تھے اور وہاں کوئی چادر تھی، نہ بستر نہ گدا۔ حکومت کا ساتھ دینے والوں کو یہ اذیت تو نہیں دی جاتی۔ میرے ہی ساتھ الطاف حسن قریشی کو پکڑا گیا تھا وہ کیمپ جیل کے ہسپتال سے ملحق بیرک کے اندر مزے کر رہا تھا۔ خیر مجھے بھی کچھ دنوں بعد ہسپتال سے ملحق اسی بیرک میں بھیج دیا لیکن اس وقت تک جو اذیت میں بھگت چکا تھا وہ خوفناک تھی۔ مجھ پر اور الطاف حسن پر ایک ہی بنیاد پر کیس بنا تھا کیونکہ اس نے اردو ڈائجسٹ میں کچھ ایسی بونگیاں ماردیں تھیں اور میں نے ان کو اپنے اخبار میں Highlight کر دیا۔ فوجیوں نے مجھے پکڑ لیا (ہنستے ہوئے) تو جب اُنھیں پتا چلا کہ میں نے Re-produce کیا ہے تو اُنھوں نے اسے بھی پکڑ لیا۔ بعد میں جب اسے چھوڑا تو مجھے بھی چھوڑنا پڑا۔ اور تب تک میرے سٹاف کے لوگ ادھر ادھر ہو گئے اور 'حیات' بند ہو گیا۔

ضیاء کے سارے دور میں، میں اس کے خلاف لکھتا رہا۔ 1986ء میں جب میں نوائے وقت میں تھا (ہنستے ہوئے) اور مجید نظامی کی جیب سے ٹکٹ کے پیسے لیکر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں بینظیر بھٹو کا انٹرویو کرنے لندن گیا۔ بے نظیر بہت جھنجھلاہٹ اور غصے میں تھیں۔ ان کے سارے انکل ان سے ناراض ہو چکے تھے یا وہ خود انھیں ناراض کر چکی تھیں۔ غلام مصطفیٰ جتوئی، غلام مصطفیٰ کھر اور دیگر سے وہاں ملاقات ہوئی۔ وہ کہتے تھے بے نظیر ہماری بات ہی نہیں سنتی۔ وہ ہمیں اپنے باپ کا قاتل سمجھتی ہے اور ان میں سے کچھ تھے بھی۔

☆ مثلاً کون؟ نام لینا پسند کریں گے؟

○ مثلاً بھٹو کا وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ۔ لندن سے آ کے اپنے سارے تاثرات میں نے لکھے۔ بعد ازاں بے نظیر بھٹو کی دونوں حکومتیں، ناتجربہ کاری، اور بدانتظامی سے پُر تھیں لہٰذا میں ان کے امپیچور طرز حکومت پر تنقید کرتا رہا۔ نواز شریف اپوزیشن لیڈر تھے اور میں بھی بے نظیر بھٹو کے خلاف لکھتا تھا اور جب ایک جیسا نقطہ نظر ہو تو ایک دوسرے کے قریب آنا فطری ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نواز شریف کے قریب ہو گیا۔ نواز شریف نے جب فوج سے پنگا لینا شروع کیا تو میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ ان کو سمجھاؤں کہ زمینی حقیقت یہ ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں اسٹیبلشمنٹ سے پنگا لیکر حکومت نہیں کی جا سکتی اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ نواز شریف نے اسٹیبلشمنٹ کو ناراض کر لیا اور نتیجتاً انہیں حکومت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ نواز شریف کی آخری تقریر کا انتظام بھی ان کے بیٹے حسین نواز نے کیا۔ مشرف کے پورے دور میں، میں اس کے خلاف لکھتا رہا ہوں۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط اور ریکارڈ کے خلاف ہے کہ میں حالات اور حکومت کے بدلنے سے پارٹی بدل لیتا ہوں۔

☆ آپ نے کہا کہ الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ میں کچھ بونگیاں ماریں۔ وہ کیا بونگیاں تھیں؟

○ آپ اس دور کے اردو ڈائجسٹ دیکھ لیں۔ بڑی آسانی سے کسی لائبریری سے مل جائیں گے۔

☆ الطاف حسن قریشی، مجیب الرحمان شامی، مصطفیٰ صادق اور عبدالقادر حسن بھی تو ضیاء

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے بہت قریب رہے ہیں؟

○ یہ چاروں ضیاالحق کے نورتنوں میں شامل تھے اور اُنھوں نے بہت فائدے بھی اٹھائے۔ مصطفیٰ صادق کا اخبار چھوٹا تھا مگر وہ Manouvering کرنے کے ماہر تھے۔

عبدالقادر حسن 'امروز' کے رپورٹر تھے مگر ضیاء الحق نے انھیں اس کا ایڈیٹر بنادیا۔ اور ساتھ ساتھ وہ جنگ میں کالم بھی لکھتے رہے حالانکہ یہ سہولت کسی اور صحافی کو میسر نہ تھی۔

☆ آپ نے کہا کہ بے نظیر بھٹو کے دونوں ادوار حکومت بدانتظامی اور ناتجربہ کاری سے بھرپور تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صدر زرداری نے بے نظیر بھٹو سے بھی بہتر سیاست کی ہے؟

○ نہیں! بے نظیر بھٹو اس دفعہ جب آئی تھیں تو انتہائی میچور، زیرک اور بدلی ہوئی سیاستدان تھیں اور اگر انھیں موقع ملتا تو اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتیں۔

☆ آصف زرداری صدر بننے کے بعد آپ کے گھر آئے اور سنا ہے انہوں نے سیکرٹ فنڈ سے 5 کروڑ روپیہ بھی آپ کو دیا؟

○ آصف علی زرداری کے خلاف سالہا سال کرپشن کے مقدمات عدالتوں میں زیرسماعت رہے اور کوئی بھی الزام ثابت نہ ہوسکا۔ اُنھوں نے طویل ترین جیل کاٹی۔ آپ جن (مجید نظامی) کا ذکر کررہے تھے، اُنھوں نے آصف علی زرداری کو 'مردِحر' کا خطاب دیا۔ میں نے جب دیکھا کہ ایک آدمی کو صرف بے نظیر کا شوہر ہونے کے جرم میں سزا دی جارہی ہے، اُسے بند کیا ہوا ہے اور کوئی الزام اس پر ثابت نہیں ہوا تو میں نے آصف علی زرداری کے حق میں لکھا۔ جیل سے ان کا شکریے کا پیغام آیا، تو میں ان سے جیل میں بھی ملنے جاتا رہا۔ وہاں انھوں نے وعدہ کیا کہ جب وہ رہا ہوں گے تو میرے گھر آئیں گے۔ صدر بننے کے بعد وہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ سیکرٹ فنڈ سے پیسے دینے والی بات بالکل بکواس ہے اور میرے حاسدین کی پھیلائی ہوئی ہے۔ ویسے بھی جب کوئی کسی کے گھر آتا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے تو ہماری معاشرتی روایات کے مطابق نہ کوئی پیسے لے کر آتا ہے اور نہ کوئی لیتا ہے۔

☆ ایک کالم میں آپ نے لکھا تھا کہ اصول، میرٹ کر کے بہت دیکھ لیا۔ ایک عمر گزار دی مگر زمینی حقائق کچھ اور ہیں اور اب میں نے زمینی حقائق سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔

○ میں ایک عام آدمی کا بیٹا تھا۔ ترقی پسند سوچ کا حامل اور سوشلسٹ خیالات کا حامی تھا۔ کیونکہ استحصالی طبقات غریب، مزدور، اور عام آدمی کا استحصال کرتے ہیں اور اسے دبا کر رکھتے ہیں۔ پاکستان میں بھی صورتحال ایسی ہی رہی ہے۔ اور اگر میں نے زمینی حقائق کو سمجھ کر اعتدال پسندی کا راستہ اختیار کیا تو کیا برا کیا؟ اچھا کیا۔

☆ ظہور الٰہی فیملی سے بھی آپ کے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ ضیاء الحق کے دور میں بھی ظہور الٰہی کے گھر آپ نے پناہ لی اور وہ آپ کو ضیاء الحق کے عتاب سے بچاتے رہے۔ اس احسان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ نے کبھی ظہور الٰہی فیملی کے خلاف نہیں لکھا۔ اس بات میں کہاں تک سچائی ہے؟

○ ہاں میرے ظہور الٰہی فیملی سے بہت قریبی مراسم ہیں۔ جہاں تک ضیاء الحق کے عتاب سے بچانے کی بات ہے وہ تو میں بچ نہیں سکا تھا۔ ظہور الٰہی کے گھر میں نے پناہ نہیں لی تھی۔ راولپنڈی میں میرے ایک دوست پروفیسر نذیر تھے اور ان کی بیگم صاحبہ کا ایک سکول تھا جہاں میں ان کے پاس رہا۔ رہی بات ظہور الٰہی فیملی سے تعلقات کی تو یہ آج کی بات نہیں۔ چودھری ظہور الٰہی سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان دنوں نیشنل پریس ٹرسٹ چودھری ظہور الٰہی کی تحویل میں تھا اور امروز اخبار کے مالک چودھری ظہور الٰہی ہی تھے۔ اس زمانے میں، بھٹو صاحب، ظہور الٰہی اور میں بہت قریبی دوست تھے اور ہم کراچی میں اکٹھے اٹھتے بیٹھتے تھے۔ محفلیں ہوتی تھیں۔ اب میرے بیٹے کی پروموشن کا معاملہ تھا تو پرویز الٰہی وزیر اعلیٰ پنجاب تھے تو انھوں نے میری کوئی مدد نہیں کی، حالانکہ میرے ان سے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ جبکہ جونیئر لوگ پروموٹ ہو گئے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ 5 نومبر 2009ء کو حامد میر کے پروگرام کیپٹل ٹاک میں آپ اور انصار عباسی کے درمیان جھڑپ ہوئی اور ایک دوسرے پر ذاتی الزامات بھی لگائے گئے۔ کیا یہ مناسب تھا؟

○ انصار عباسی کا تعلق آئی ایس آئی کے اس ونگ سے ہے جو اس ملک میں نہ جمہوریت کو چلنے دینا چاہتا ہے اور نہ سسٹم کو۔ آپ ان رپورٹس کو دیکھ لیں جو مختلف ایجنسیوں میں تیار ہوتی ہیں۔ وہ دیکھ کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ جو رپورٹس ان کے نام سے شائع ہوتی ہیں وہ اصل میں کہاں تیار ہوتی ہیں۔ میں دو مرتبہ وزیر اعظم کا تقریر نویس رہا ہوں اور مختلف محکموں کی طرف سے وزیر اعظم کی تقریر لکھنے کے لیے مجھے جو مواد ملا کرتا تھا اس میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایسی رپورٹیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ مجھے ایسی رپورٹیں پڑھنے کا تجربہ ہے اور اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ ان کی بیشتر رپورٹیں ایجنسیوں کی فراہم کردہ ہوتی ہیں۔ وہ کوما، فل سٹاپ بدلے بغیر انھیں اپنے نام سے شائع کرتے ہیں۔ ایسے صحافیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے میں اکثر اپنے کالموں میں اشارے کرتا رہتا ہوں۔ جس پر وہ ناراض ہوتے ہیں۔

☆ اس پروگرام میں انصار عباسی نے یہ بھی کہا کہ آپ نے پچاس سال صحافت نہیں کی، حکومتوں کی خدمت کی ہے۔

○ اب میں ایسے آدمی کی بات کا کیا جواب دوں جس کو یہ پتا نہیں کہ میں 'اخبار جہاں' کا بانی ایڈیٹر ہوں، 'شہاب' اور 'مساوات' کا ایڈیٹر رہا ہوں۔ 'حیات' میرا اپنا اخبار تھا اور میں اس کا ایڈیٹر تھا۔

☆ انصار عباسی کہتے ہیں کہ آپ کئی کالموں میں شاہین صہبائی، ڈاکٹر شاہد مسعود اور میرے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔

○ یہ لوگ پاکستانی میڈیا پر پابندیاں لگوائیں گے۔ یہ پاکستان کے ہزاروں صحافتی کارکنوں کی روزی کے دشمن ہیں۔ یہ اشتعال انگیز (Provocative) جرنلزم کرتے ہیں۔ پہلے بھی ایسے لوگوں کی وجہ سے پابندیاں لگیں اور آئندہ بھی انھی کی وجہ سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لگیں گی۔ آپ نے دیکھا ہے برطانیہ میں Provocative جرنلزم کی وجہ سے قدیم ترین اخبار 'نیوز آف دی ورلڈ' بند ہو گیا۔ یہ لوگ بھی اسی قسم کا کام کر رہے ہیں۔

☆ آپ نے کہا کہ آئی ایس آئی کا ایک وِنگ اس ملک میں جمہوریت نہیں چاہتا۔ آئی ایس آئی تو حاضر سروس جرنیل کے ماتحت ہوتی ہے تو یہ وِنگ کہاں سے آ گیا؟

○ افغان جنگ کا ایک پورا بیک گراؤنڈ ہے۔ یہ لوگ افغانستان میں مہم جوئی کرتے رہے اور اعلانیہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ جب اِن کے زیر اثر وہاں لوگ اِن کے مفاد کیلئے کام کرتے تھے تو ان لوگوں کے بھی تو اُن پر لامحالہ اثرات ہونگے۔ تبھی کام چلتا ہے۔ آپ حزبُ التحریر کا لٹریچر پڑھ لیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایٹمی قوت پاکستان پر قبضہ کر لیں اور پھر پوری دنیا کو فتح کر لیں۔ یہاں یہی سوچ اور مہم جوئی پائی جاتی ہے۔

☆ آپ کے بھائی بھی قابل تھے اور خود ہی آگے بڑھے۔ آپ کے بیٹے بھی ٹھیک تھے تو اُنھیں کوٹے پر بھرتی کروانے کی کیا ضرورت تھی؟

○ تو بھوکا مارتا اُنھیں؟ اس وقت الیکٹرانک میڈیا اس طرح نہیں تھا اور اخباروں میں بہت معمولی معاوضہ ملتا تھا۔ 1986ء میں نوائے وقت میں میری تنخواہ 15 ہزار تھی۔ اُس زمانے کے حساب سے بھرتی کروانے کا یہ طریقہ ہی جائز تھا۔ ہر ایم پی اے، ایم این اے کا کوٹہ تھا اور اُنھوں نے کوٹے پر مختلف عہدوں پر نوجوانوں کو بھرتی کروایا جن بے چاروں کو نوکریاں نہیں ملتی تھیں، ان کو نوکری دلواتے تھے۔ اُن میں اپنے رشتہ دار عزیز بھی ہونگے لیکن وہ مختلف لوگ تھے اور آج کی طرح کے نہیں تھے۔ رانا پھول محمد جو موجودہ پنجاب اسمبلی کے سپیکر رانا محمد اقبال کے والد تھے، وہ اور سینیٹر محمد علی خان میرے دوست تھے۔ رانا پھول صاحب تو فوت ہو گئے محمد علی خان صاحب زندہ ہیں، ان سے پوچھ لیں۔ میں نے ان کے کوٹے پر دونوں بیٹوں کو بھرتی کروایا۔ اس وقت یہی طریقہ رائج تھا اور دونوں کی تعلیم ان نوکریوں کے میرٹ کے مطابق تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کچھ غلط کیا۔

☆ آپ نے آج تک کتنے پلاٹ الاٹ کروائے ہیں؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ یہ بھی سن لیں۔ اس حوالے سے بھی میرے مخالفین بہت پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ سب سے پہلا پلاٹ ایک کنال کا مجھے سبزہ زار میں ملا جو آج بھی لاہور کی سب سے تھرڈ کلاس رہائشی کالونی سمجھی جاتی ہے۔ وہ پلاٹ اس زمانے میں 5 لاکھ میں فروخت ہوا۔ وہ بیچ کر اقبال ٹاؤن میں پلاٹ لیا وہ بھی کئی سالوں کے بعد 25 لاکھ میں فروخت ہوا۔

☆ بچے بھی تو کمانا شروع ہو گئے ہوں گے؟

○ نہ جی نہ، تنخواہ سے مکان نہیں بنتے لہٰذا یہ مکان پھر میں نے ویسے ہی بنایا جیسے صحافی بناتے ہیں۔ بحریہ ٹاؤن والے ملک ریاض میرے دوست ہیں ان سے میں نے کہا کہ اللہ نے آپ کو بہت دیا ہے اور آپ لوگوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے میرے مکان کی تعمیر مکمل کروائی۔ ان کا نام آج تک میرے کالم میں شائع نہیں ہوا۔ اس لیے لین دین تو اس میں ہو نہیں سکتا۔ سیالکوٹ سے میرے دوست امتیاز ڈار نے مکان کی تعمیر کیلئے 4 لاکھ بھجوایا۔ اس طرح یہ مکان میں نے مانگ تانگ کر ہی بنایا۔ دس مرلے کا ایک پلاٹ مجھے لاہور میں صحافی کالونی میں دوسرے صحافیوں کے ساتھ ملا چونکہ وزیراعلیٰ پرویز الٰہی نے کوئی پابندی نہیں لگائی تھی کہ جس نے پہلے پلاٹ لیا ہے وہ دوبارہ نہیں لے سکتا۔ اسلام آباد والا پلاٹ میں نے کورٹ میں کیس کر کے لیا۔ کیونکہ مشرف کے دور میں شیخ رشید نے مجھے پلاٹ نہیں ملنے دیا، حالانکہ میرا حق بنتا تھا اور میں نے گورنمنٹ آف پاکستان کے قانون کے تحت اسی کوٹے پر اپلائی کیا تھا۔ بعد میں جب کورٹ نے سات جرنلسٹوں کے حق میں فیصلہ دیا تو اسی فیصلے کی بنیاد پر مجھے یہ پلاٹ ملا۔ انصار عباسی نے بھی پلاٹ کیلئے اپلائی کیا تھا مگر اسے نہیں ملا حالانکہ اس نے اپنی بیوی کا حلف نامہ بھی جمع کروایا تھا کہ اپنے خاوند کے زندہ نہ رہنے کی صورت میں بقایا اقساط وہ دیں گی۔

☆ شیخ رشید کو آپ سے کیا مسئلہ تھا؟

○ وہ بہت مطلب پرست آدمی ہے۔ جب کام ہو یا اپوزیشن میں ہو تو ہر ایک سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جھک کر ملتا ہے۔ حکومت میں ہو تو آنکھیں پھیر لیتا ہے۔

☆ محمد احمد نورانی جو دی نیوز اسلام آباد میں انصار عباسی ہی کے ماتحت انوسٹی گیشن سیل میں کام کرتے ہیں، انھوں نے جب آپ کو پلاٹ لینے کے حوالے سے فون کیا تو آپ نے انھیں بہت گالیاں دیں۔ یہ ریکارڈنگ یوٹیوب پر بھی موجود ہے۔

○ دو کالز اس نے انٹرنیٹ پر دی ہیں مگر اس سے پہلے بھی وہ دو کالیں مجھے کر چکا تھا۔ مجھے دوستوں نے بتایا کہ اس کے پیچھے انصار عباسی ہے تو پھر مجھے غصہ آ گیا چونکہ وہ مجھے مسلسل اشتعال دلا رہا تھا۔

☆ کیا ایک دانشور کو زیب دیتا ہے کہ وہ یوں کسی کو گالیاں دے، آپ آرام سے بھی جواب دے سکتے تھے؟

○ آپ آغا حشر اور شورش کاشمیری کو کس کھاتے میں ڈالیں گے؟ گالی ایک Expression ہے۔ جوانی میں تو میں مارا بھی کرتا تھا، اب صرف گالیاں دیتا ہوں۔

☆ اور لوگ بھی پیتے ہیں مگر آپ کی شراب نوشی کے قصے اتنے مشہور کیوں ہیں؟

○ (ہنستے ہوئے) اچھا نہیں ہے؟ لوگ مجھے غالب، منٹو اور مجاز سے ملاتے ہیں۔

☆ پچھلے دنوں لاہور میں ایم کیو ایم نے آپ کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی۔ کیا یہ ٹھیک تھا؟

○ اگر کوئی آپ کو عزت دیتا ہے تو کیا وہ عزت لینے سے انکار کر دینا چاہئے۔ اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ انہوں نے میری عزت افزائی کی ہے تو یہ اچھی بات ہے۔

☆ اُردو میڈیا اتنا جذباتی کیوں ہے؟

○ جماعت اسلامی کی بنیاد انگریزوں نے رکھی۔ یہ امریکہ کی حمایت کر رہی ہو یا مخالفت، دونوں صورتوں میں امریکہ کی حمایت کر رہی ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کی انھوں نے مخالفت کی۔ بعد میں یہ پاکستان کے ٹھیکیدار بن گئے۔ انھوں نے یونیورسٹیوں میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ذریعے قبضہ کر لیا اور تشدد کو رواج دیا اور مکالمے کی راہ روکی۔ یہ باقاعدہ اخباروں کے دفتروں پر حملے کرتے رہے اور پھر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

منصوبہ بندی سے باقاعدہ اپنے لوگ میڈیا میں داخل (Induct) کیے۔ آج میڈیا پر جماعت اسلامی کے مائنڈ سیٹ کا قبضہ ہے۔ بات اور مکالمہ کرنا بھی مشکل ہے۔ آج ہم لوگ جو دہشت گردی بھگت رہے ہیں اور ہمارا وجود خطرے میں ہے، یہ بیج انھی لوگوں نے بویا اور باقاعدہ اس کی آبیاری کی۔

☆ پہلے صرف اشفاق احمد کا بابا تھا، آج کئی کالم نگاروں کے بابے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

○ جاہلیت! اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ دلیل اور جواز سے بات کرنا نہ آئے تو پھر ایسے سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اکثر کالم نگاروں نے بابے پالے ہوئے ہیں۔ صرف میرا کوئی بابا نہیں۔

☆ آپ بابا لیس (Less) ہیں؟

○ (ہنستے ہوئے) ہاں میں بابا لیس ہوں۔

☆ کیا آپ کو کالمسٹ مجید نظامی نے بنایا؟

○ اگر مجھے اُنھوں نے کالمسٹ بنایا ہے تو وہ خود کیوں نہیں بن گئے، یہ ایسے ہی گپ شپ ہے۔

☆ مجید نظامی صاحب کہتے ہیں کہ آپ کرائے کے کالم نگار ہیں؟

○ میں اگر کرائے کا کالم نگار ہوں تو وہ کرائے کے ایڈیٹر ہیں کیونکہ وہ نواز شریف کی حمایت مجھ سے زیادہ کرتے رہے ہیں۔ لوگوں کو باتیں کرتے ہیں، یہاں ٹھوکر نیاز بیگ پر جوہر ٹاؤن میں اُنھوں نے نہایت قیمتی، 80 کنال زمین الاٹ کروائی ہے، اس ادارے کے نام پر جس کے وہ سربراہ ہیں۔

☆ مجید نظامی صاحب کا لہجہ آپکے حوالے سے اتنا سخت کیوں ہے؟

○ (نہایت غصے سے) وہ جی ایچ کیو (GHQ) کا ایڈیٹر ہے۔

☆ آپ میاں نواز شریف کے سپیچ رائٹر رہے۔ کسی دانشور کا حکمرانوں کی تقریریں لکھنا ٹھیک ہے؟

○ کیا حرج ہے اس میں؟ میں اپنے لیے یہ باعث عزت سمجھتا ہوں کہ اللہ نے مجھے یہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عزت دی۔ حاسدین اور مخالفین ایسے ہی بغض میں باتیں کرتے ہیں حالانکہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔

☆ شہباز شریف سے آپکی کیا مخاصمت ہے، آپ ان کو اپنے کالموں میں رگڑتے رہتے ہیں؟

○ (ہنستے ہوئے) نہیں اب تو ایسی کوئی بات نہیں۔ پہلے ایسا تھا۔ اب بھی اگر وہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں تو ان کا ذکر ہو ہی جاتا ہے۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ میں بیرونی امداد نہیں لوں گا اور پھر لے بھی لی۔

☆ آپ اشرافیہ کے خلاف لکھتے رہے، اب خود اس کا حصہ بن گئے ہیں؟

○ (غصے میں) کون سی اشرافیہ کا حصہ بن گیا ہوں میں؟ بھوکا مرجاتا؟ رہنے کو چھت، آنے جانے کے لیے سواری یا بچوں کا روزگار، اس سے بندہ اشرافیہ میں تو شامل نہیں ہو جاتا۔

☆ جب آپ اکادمی ادبیات کے چیئرمین بنے تو اچانک پتہ چلا کہ آپ ادیب بھی ہیں؟

○ لوگ اگر جاہل اور ان پڑھ ہیں تو میرا کیا قصور ہے؟ میں ایک زمانے میں ادب لطیف میں چھپتا رہا ہوں جب وہاں چھپنا ایک مشکل کام سمجھا جاتا تھا۔ سب پرانے لوگوں کو پتا ہے۔ لوگ اگر نہیں پڑھتے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

☆ جب آپ اکیڈمی کے چیئرمین تھے تو علی اکبر عباس کے کہنے پر امجد طفیل نے آپ پر کتاب لکھنی شروع کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لاہور کے کئی ادیبوں کے پاس گئے مگر کوئی آپ کے حق میں دو لفظ بھی بولنے کو تیار نہ ہوا۔ اس بات میں کہاں تک سچائی ہے؟

○ بالکل غلط ہے۔ نہ میں نے کبھی علی اکبر عباس کو کتاب لکھوانے کیلئے کہا نہ مجھے اس بارے میں علم ہے۔ البتہ ایک کتاب مجھ پر چھپنے کیلئے بالکل تیار ہے۔ میری تعریف میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی لکھا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

☆ کیا آپ نے کبھی کسی ایجنسی کیلئے کام کیا؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

o (ہنستے ہوئے) اگر کرتا تو یہاں انصار عباسی ٹائپ لوگ میرے خلاف ہوتے؟

☆ آپ ضیاء الاسلام انصاری کے ساتھ معافی کیلئے ضیاء الحق سے ملے اور جب ملاقات ہوئی تو آپ بہت جھک کر ملے؟

o (ہنستے ہوئے) میں نے اس سے معافی مانگنی ہوتی تو جیلوں میں نہ جاتا۔ اپنا اخبار نہ بند کرواتا۔ میری ملاقات ضیاء الحق سے اس کے آخری دنوں میں ہوئی جب وہ کمزور ہو چکا تھا۔ اسلام آباد میں ضیاء الاسلام انصاری نے کہا کہ ضیاء الحق سے ملتے ہیں۔ میں نے کہا چلو مل لیتے ہیں۔ ضیاء الحق اگر حادثے کا شکار نہ بھی ہوتا تو معاملات تیزی سے اس کے ہاتھ سے نکل رہے تھے اور وہ کمزور ہو چکا تھا۔ کمزور آدمی سے ملنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ ملاقات کے چند ماہ بعد وہ حادثے کا شکار ہو گیا۔

☆ آپ کا ضمیر مطمئن ہے؟

o ضمیر کیا ہوتا ہے؟ یہ ایک Relative ٹرم ہے۔ ایسی بات، کنفیوز لوگ کرتے ہیں۔

☆ نذیر ناجی صاحب، حامد میر فوج کے حق میں بہت لکھا کرتے تھے۔ آج کل وہ فوج کے خلاف بہت سخت لائن لیے ہوئے ہیں؟

o یہ بات گھر جا کے سوچیے گا کہ جب تک فوج امریکہ کے ساتھ تھی تو یہ لوگ فوج کے حق میں لکھ رہے تھے۔ اور جب سے فوج نے تھوڑا سا امریکہ کے خلاف موقف (Stance) اپنایا ہے، یہ فوج کے خلاف لکھ رہے ہیں۔

حسن نثار

حسن نثار بھی ہمارے ملک کے بڑے کالم نگاروں میں سے ایک ہیں۔ اُن کی تحریر و تقریر میں ایک خاص قسم کی تلخی اور کاٹ پائی جاتی ہے جس کا وہ بے دریغ اور بکثرت استعمال بھی کرتے ہیں۔ ہارون الرشید کے بقول ''وہ مسلسل ایک ہی کالم لکھ رہے ہیں'' (30) لیکن اس کے باوجود حسن نثار کا ہر کالم پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

انٹرویو کی غرض سے اپنے دوست احمر سہیل بسراء کے ساتھ، شریف فیملی کے جاتی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اُمرا محلات سے آگے حسن نثار کے آباد کردہ بیلی پور پہنچے۔ گاؤں اور شہر کے امتزاج کے حامل اس خوبصورت مکان کی بیٹھک حسن نثار کی جمالیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد عالیشان سیڑھیوں سے حسن نثار نمودار ہوئے۔ بے تکلف سے حلیے اور انداز میں ملے اور اپنے ہی جیسے کھلے ڈلے ''پینڈو'' لگے۔ گفتگو پنجابی میں شروع ہوئی تو پوچھنے لگے انٹرویو پنجابی میں ہوگا یا اردو میں؟ کہا کہ آپ جیسے پسند کریں، کوئی تکلف نہیں۔

اس پوری ملاقات میں اگر کچھ پُرتکلف تھا تو وہ پیش کی جانے والی چائے تھی۔

سوال: حسن صاحب کیا یہ سچ ہے کہ آپ ایکٹر بننا چاہتے تھے۔ ایکٹر نہ بن سکے تو اب وہ شوق پورا کر رہے ہیں؟

حسن نثار: (ہنستے ہوئے) زندگی میں پہلا آدمی ہے جو مجھ سے یہ سوال کر رہا ہے۔ مجھے تو اداکاری سے کبھی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ ہاں، سنگر بننے کا خواب ضرور دیکھا تھا۔ اس کی تھوڑی بہت ٹریننگ بھی لی۔ اس شوق کی ایک وجہ تھی۔ میری نصرت فتح علی خان کی فیملی کے ساتھ بہت زیادہ قربت تھی۔ ان کے بزرگ بھی میرے بزرگوں کے پیچھے پیچھے جالندھر سے آئے تھے گویا کہ ہمارا تعلق پچھلی نسلوں سے تھا۔ نصرت کے والد فتح علی خاں صاحب، جن کو ہم چاچا فتح کہتے تھے، اُن کی خواہش تھی کہ نصرت کا زیادہ سے زیادہ وقت ہمارے گھر میں گزرے کیونکہ ہمارا ماحول ذرا اور ٹائپ کا تھا۔ لہٰذا نصرت کی دیکھا دیکھی مجھے بھی کچھ دیر کیلئے شوق ہو گیا۔ ایکٹنگ کا شوق خیر کبھی نہیں رہا۔

☆ عام طور پر آپ کے کالم ایسے لگتا ہے جیسے نان فوکسڈ ہیں؟

○ مجھ سے زیادہ کوئی فوکسڈ نہیں۔ حیرت انگیز بات ہے؟ اس کا مطلب ہے آپ نے پڑھا ہی نہیں۔ میرا تھیم یہ ہے کہ ماضی کے شاندار سراب سے نکلو۔ تاریخ کو مسخ نہ کرو، سائنس اور ٹیکنالوجی پر توجہ دو۔ ماضی کے شاندار ہونے کی خواہ مخواہ مبالغہ آرائی نہ کرو۔ میں اردو کا غالباً واحد کالم نگار ہوں، جس کے کالموں کا کوئی باقاعدہ مرکزی خیال ہے۔ میرا سیدھا سیدھا فوکس: سائنس اور ٹیکنالوجی ہیں۔

☆ آپ میں اتنا غصہ اور جھنجھلاہٹ کیوں ہے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ یہ غصہ، علیحدہ بات ہے۔ آپ چیزوں کو کنفیوز کر رہے ہیں۔ فوکس کی بات کر رہے ہیں تو وہ مجھ جتنا کسی کا نہیں۔ باقی جہاں تک بات ہے غصے یا جھنجلاہٹ کی تو میں سمجھتا ہوں اس ماحول کو دیکھ کر یا جو لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور مسلسل تریسٹھ سال سے ہو رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر جو آدمی غصے یا جھنجلاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ اُس کی یا تو کھال موٹی ہے یا دماغ۔ آپ کے اچھے خاصے دانشور کہتے اور لکھتے رہتے ہیں کہ یہ ملک قیامت تک رہنے کیلئے بنا ہے۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ قدم قدم پر بکواس کرتے ہیں۔ کسی کو شرم نہیں آتی کہ اس کو ٹوٹے ہوئے بھی عشرے بیت چکے ہیں۔ یہ بات کس بنیاد پر کرتے ہیں اور جہاں اتنا ننگا جھوٹ بولا جا رہا ہو کہ ملک اسلام کے نام پر بنا۔ وہ جعلی کلیموں اور جعلی ڈاتوں سے شروع ہوا اور جعلی ڈگریوں تک پہنچ گیا۔ جس ملک میں معصوم بچوں کو صاف دودھ اور مریض کو دوائی نہ ملے وہاں تو کوئی انتہائی بھڑوا اور بے غیرت ہی ہوگا جو جھنجلائے گا نہیں اور غصے میں نہیں آئے گا۔

☆ لیکن حسن صاحب ایک دانشور کا بھی عام لوگوں کی طرح ردِ عمل ہوگا تو راہ کون سُجھائے گا؟

○ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بھی ایک کلیشے (Cliche) ہے جو آپ دانشور کی بات کر رہے ہیں۔ کئی قوموں میں دانشور پیدا نہیں ہوتے۔ آپ کی صدیوں کی تاریخ میں آپ نے ایک بڑا آدمی پیدا کیا ڈاکٹر عبدالسلام، وہ بھی ایسے اتفاقاً ہو گیا۔ اندھا بھی اگر کسی چیز پر نشانہ مارے تو سو پتھر مارے گا تو ایک آدھ لگ ہی جائے گا۔

☆ لیکن ان کو تو آپ کے نظریاتی ---

○ یہ علیحدہ بات ہے۔ وہ پاکستانی تو تھا۔ اس پر فخر کرو، ایک ہی پڑھا لکھا آدمی ہے۔ باقی دانش دونش گبڑی قوموں میں نہیں ہوتی---

☆ گبڑی قوم سے کیا مراد ہے؟

○ شیوازنیگرز (Arnold Schwarzenegger) کا نام سنا ہے؟ وہ کیلیفورنیا کا گورنر تھا۔ ابھی اس کی طلاق ہوئی ہے۔ وہ دنیا کا ٹاپ سٹار، اور ساڑھے چھ، سات فٹ کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مالک ہے۔ باڈی بلڈر کے طور پر مسٹر یونیورس بھی رہا ہے اس کو آپ تین بائی تین فٹ کے ایک پنجرے میں ڈال دیں اور دس سال کے بعد اسے باہر نکالیں تو کیا ہوگا۔ (تھوڑے توقف سے) اس کا کُبڑا پن دور نہیں ہوگا۔ بہت بڑی سرجری درکار ہوگی۔ تو ہم بحیثیت قوم صدیوں سے پنجرے میں ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہم ذہنی اور فکری طور پر کُبڑے ہیں اور یہ جن زمانوں کی بات کرتے ہیں کہ ''ہماری ہندوستان پر حکومت رہی''۔ ان کی حکومت کہاں سے رہی؟ بے چارے مسلمان عوام کو تو دو وقت کی روٹی نہیں ملتی تھی۔ 'دو وقت کی روٹی' کا محاورہ میں نے نہیں بنایا۔ تین وقت کے کھانے کا تصور ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں میاں چنوں ٹائپ علاقوں میں دیکھا ہے کہ لوگوں کے پاؤں میں جوتی نہیں ہوتی تھی۔ بغل میں جوتا دبا کر شادی والے گھر پہنچتے تھے تو پہن لیتے تھے۔

یہ سلاطین دہلی کی حکومت تھی۔ مغلوں، سوریوں، غوریوں، خلجیوں کی حکومت تھی۔ یہاں کے مسلمان نے تو کبھی پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آج 2011ء میں آپ کے حکمران اتنے بے غیرت ہیں کہ اس ملک کی بیشتر آبادی خطِ غربت پر ہے۔ آج سے چار، پانچ سو سال پہلے حکمران طبقہ کتنا بے غیرت ہوگا اور عوام کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوگا۔ دانشور وغیرہ یہاں نہیں ہوتے۔

☆ آپ اس بات سے متفق ہیں کہ یہاں کا دانشور ذہنی دیوالیہ تھا، یا ہے؟

○ یہاں دانشور ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک ماحول ہوتا ہے جہاں دانش پھلتی پھولتی ہے۔ ربّ العزت نے سارے عالم اسلام کو ٹانگیں، بازو، آنکھیں، کھوپڑی اور اس میں مغز بھی دیا ہے لیکن صدیوں سے ان کا بنی نوع انسان کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ حقیر یا کمتر ہیں! ایسی بات نہیں۔ ان کو وہ ماحول ہی نہیں ملا جس میں یہ آگے بڑھیں۔ جیسے گندگی کا بیکٹیریا ہے وہ گندگی ہی میں پرورش پائے گا، صفائی کرو گے تو مر جائے گا۔ اسی طرح برف کا بیکٹیریا ہے جو برف میں ہی نشوونما پائے گا۔ لہٰذا انسانوں کو جب تک آپ ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت نہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دیتے اور grooming نہیں کرتے، اس وقت تک وہ نیم انسان اور نیم حیوان کے درجے میں رہتا ہے لہٰذا اس میں وہ صلاحیت اور قابلیت پیدا ہی نہیں ہوتی۔

☆ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ جو کوئی آپ سے اختلاف کرے، آپ اس کے خلاف ہو جاتے ہیں بلکہ اس کو کافی رگید تے ہیں۔ مثلاً ایک پروگرام میں آپ کے ساتھ غامدی صاحب تھے جب اُنھوں نے کہا کہ یہ ملک جمہوریت کی بنیاد پر بنا ہے اور یہاں جمہوریت ہی ہونی چاہئے تو آپ نے کہا لگتا ہے آپ الیکشن لڑنا چاہتے ہیں۔ تو کیا واقعی آپ۔۔۔!

○ یہ بالکل غلط بات ہے۔ بالکل بے ہودہ! کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کچھ اختلافات کے باوجود میرا غامدی صاحب سے بہت اچھا تعلق ہے۔ اور جہاں تک بات ہے جمہوریت کی، اس سے تو مسلمان بھاگا ہے۔ پاکستان بننے کے پیچھے ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ہم اقلیت بن جائیں گے۔ اس لیے تو بھاگے ہیں۔ ویسے میں جمہوریت کا کوئی اتنا بڑا مداح بھی نہیں ہوں لیکن یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ خیر، غامدی صاحب کے ساتھ میرا اس طرح کا مکالمہ کبھی نہیں ہوا۔

(دنیا ٹی وی سے 20 ستمبر 2010ء کو نشر ہونے والے پروگرام ''دین و دانش'' میں حسن نثار صاحب نے سوال میں مذکورہ گفتگو کی۔ اس پروگرام کے میزبان ڈاکٹر منیر احمد تھے اور دیگر شرکاء میں اور یا مقبول جان اور جاوید غامدی تھے۔ یہ پروگرام یوٹیوب پر دیکھا جا سکتا ہے۔ شاید حسن نثار صاحب کو یہ پروگرام یاد نہ ہو)۔

☆ آپ جمہوریت کو مسلسل عوام دشمن، غلیظ یا مکروہ کہتے ہیں، اور بعض اوقات آپ کسی جرنیل کے ذریعے انقلاب لانے کی بات کرتے ہیں؟

○ یہ ملک بہت خوفناک 'کھوبے' میں ہے۔ منیر نیازی کا ایک شعر ہے:

اک اور دریا کا سامنا تھا منیرؔ مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

میں نے اس شعر کو تھوڑا تبدیل کیا ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک اور دلدل کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

دریا تو آدمی عبور کر لیتا ہے، دلدل عبور نہیں ہوتی۔ جنھوں نے اس ملک میں گند ڈالا ہے وہی اس کو سیدھا کر سکتے ہیں۔ یہ ملک کسی سیاستدان کے بس کا رہ ہی نہیں گیا۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے اور مجھے بھی۔ آپ یہ بات کہیں لکھ لیں۔ اس کو بہت آہنی ہاتھوں کے ساتھ ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ عوام بھی ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ مادر پدر آزاد ہیں، حکمران طبقہ بھی مادر پدر آزاد ہے اور جس جمہوریت کو میں گالی دیتا ہوں۔ جس میں تھوڑی سی بھی عقل ہوگی وہ گالی دے گا۔ یہ کونسی جمہوریت ہے جس میں مزدور کی نمائندگی سرمایہ دار، ہاری کی سب بڑا جاگیردار اور ننگے پیر اونٹ چرانے والے بلوچ کی نمائندگی وہاں کا سردار کر رہا ہے۔ کوئی خدا کا خوف کرو۔ آپ لوگ اس کو جمہوریت کہتے ہیں، یہ دھوکہ ہے! میں جمہوریت کو نہیں پاکستانی برانڈ جمہوریت کو گالی دیتا ہوں، جو واقعی غلیظ ہے۔

☆ انڈیا اور پاکستان کی جمہوریت کا کس طرح موازنہ کرتے ہیں۔۔۔؟

○ واضح فرق ہے۔ اُن کو برلا، ٹاٹا کی سپورٹ تھی، اِدھر پیٹوں والے اور جاگیردار تھے۔ ہم نے جاگیرداری کا تحفظ کیا، اُنھوں نے جاگیرداری ختم کر دی۔ ایک بڑا اور اہم سوال یہ ہے کہ فوج تو ایک ہی تھی۔ کوئی سوئچ آن آف تو نہیں ہو گیا، کیریکٹر تو تبدیل نہیں ہوتا، 14 اگست کو جو پانچ منٹ میں پاک آرمی ہو گئی۔ انڈیا اور ہماری فوج کا کیریکٹر، ٹریننگ، بیک گراؤنڈ اور Brought up سب کچھ ایک جیسا تھا۔ انھوں نے کبھی مارشل لاء نہیں لگایا اور یہ باز ہی نہیں آتے، وجہ کیا ہے؟ یہ ایک سنجیدہ سوال ہے۔

☆ پھر آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ کوئی جرنیل انقلاب کا باعث بنے۔۔۔؟

○ وہ ایک چانس ہے۔ لوگ جو مرضی کہتے رہیں، مجھے اس کی پروا نہیں کیونکہ میں آج کے ریڈر کے لیے نہیں لکھتا۔ مجھے پتا ہے کیا گند، رطب و یابس، سطحیت اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جذباتیت ہو رہی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میرے کولیگ، ساتھی اور ہم عصر ہی ہیں۔ میں تو لکھ رہا ہوں کہ جب کوئی بچہ پچاس ساٹھ سال بعد آج کے عہد کی تحقیق کرے گا اور دیکھے گا کہ کیا اردو جرنلزم میں کسی نے Sensible بات بھی کی تھی؟ یا نسیم حجازی کے یہ 'چمونے' نری جذباتیت ہی بیچتے رہے۔ میں آنے والی نسل کیلئے لکھ رہا ہوں۔ یہ تو میرا ایشو ہی نہیں ہے۔ یہ تو ایک چانس ہے کہ شاید کوئی مصطفی کمال پاشا جیسا آجائے۔ جھوٹ پر جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ نصاب آپ کا جھوٹا ہے۔ بیسیوں قسم کے نصاب ہیں۔ ایک گلی میں آپ اکٹھے نہیں ہیں۔ یہ بے شرم باز ہی نہیں آتے۔ مسلم اُمہ، مسلم اُمہ کا وِرد کرتے ہیں۔ یہ میری مسجد ہے وہ آپ کی مسجد ہے۔ یہ آپ کی اذان ہے وہ میری ہو رہی ہے۔ چار چار، چھ چھ اذانیں ایک وقت پر چل رہی ہیں۔ جو ایک گلی میں اکٹھے نہیں ہو سکتے وہ بات کرتے ہیں نشاۃ ثانیہ کی؟

☆ اردو میڈیا میں اتنی جذباتیت کی وجہ کیا ہے؟

○ اس کی وجہ جہالت ہے۔

☆ کوئی بیک گراؤنڈ تو ہو گی؟

○ جہالت۔ ان کو علم ہی نہیں ہے۔

☆ کچھ لوگ تو موجد ہوں گے اس کو رواج دینے والے؟

○ جہالت اور جذباتیت آپس میں فسٹ کزن ہیں۔ اردو یا یہاں تک کہ انگریزی میں ایم اے کر کے تاریخ کو ایک سائنس کے طور پر سمجھنا بہت مشکل ہے۔ یاد رکھیں زندگی میں سیکھنا مشکل ہے، سیکھے ہوئے کو Unlearn کرنا اس سے بھی مشکل۔ بچپن سے ماں اور مولوی نے آپ کو جو ٹیکے لگائے ہوتے ہیں ان کے اثر سے نکلنا، ان ہتھکڑیوں کو توڑنا بہت حوصلے کا کام ہے۔

وہ جی ''جب ہم نے سپین پر حکومت کی''۔۔۔۔ بے غیرت۔۔۔۔ عرب ہنستے ہیں۔ میرا عرب دنیا کے ساتھ بہت تعلق رہا ہے۔ اگر کہیں پڑھے لکھے عرب بیٹھے ہوں تو یہ بات تو کریں ذرا؟ ''سپین پر ہماری حکومت تھی''۔ وہ کہیں گے۔ اوہ میرا شیو، تمہاری کہاں سے ہو گئی ہے، وہ تو عربوں کی حکومت تھی''۔ یہ ہے آپ کی دانشوری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کا حال۔ بہت تضادات ہیں۔ بچہ اگر آزاد ذہن سے پڑھے گا تو وہ پوچھے گا نہیں کہ اِدھر حضرت علامہ اقبال انگریز کو تو استعمار کہہ رہے ہیں اُدھر مسجد قرطبہ میں رو رہے ہیں۔ اوہ مسجد قرطبہ کہاں سے آ گئی ہے؟ سپین کہاں سے تمہارا ہو گیا؟ سپین یورپ ہے اور اگر تم وہاں جا کر قبضہ کر سکتے ہو تو انگریز سمندر پار سے آ کر تمہارے ہندوستان پر قبضہ کیوں نہیں کر سکتا۔ کیسا تضاد ہے!

☆ مولانا ظفر علی خاں اور شورش کاشمیری جیسے لوگوں کو Glorify کیا جاتا ہے۔ آپ نہیں سمجھتے کہ کافی حد تک صحافت میں جذباتیت داخل کرنے والے ایسے ہی لوگ تھے؟

○ مجموعی طور پر بے شمار لوگ ہیں۔ آپ کے ہاں ڈھنگ کا کوئی کام ہی نہیں ہوا۔ آپ نے تاریخی طور پر غلط فلمیں بنائیں۔ تاریخی ناولوں کے نام پر آپ نے گند گھولا۔ زہر بیچا ہے۔ مبالغہ آمیزی کی حد تک تابناک ماضی کی بات کرتے ہیں۔ میں ایک اور بات کرتا چلوں، یہ جسے اسلامی تاریخ کہتے ہیں وہ قطعاً اسلامی نہیں ہے۔ مسلمان حکمرانوں یا جرنیلوں کی تاریخ ہے ہمارے تین خلفاء شہید ہوئے۔ ان کے بعد براہ راست ملوکیت آ گئی۔ بنواُمیّہ آئے ان کے بعد بنوعباس آئے اور انھوں نے بنواُمیّہ کے خلفاء کی لاشیں قبروں سے نکال کر چوراہوں پر لٹکائیں۔ اندازہ لگائیں یہ کیسی عجیب وغریب قوم ہے، جن کے ہتھیاروں کے نام حملہ آوروں (Invaders) کے ناموں پر ہیں۔ اس رویے نے ہمیں برباد کیا ہے۔ جس زاویے سے آپ نے جو کچھ بھی کیا وہ سارا بربادی کی طرف سفر ہے۔ چیزوں کو سائنٹیفک طریقے سے دیکھا جانا چاہیے۔ صدیوں سے ہمارا زوال رُکنے میں نہیں آ رہا۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا غلط کیا۔ آپ کی ناکامی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے کوئی کام ٹھیک طریقے سے کیا ہی نہیں۔

☆ بطور حسن نثار آپ اس سارے کنفیوژن کا حل تجویز کرتے ہیں؟

○ کچھ بھی نہ کیا جائے۔ منطقی انجام کا انتظار کیا جائے۔ ایک انسانی جسم جس کا کوئی عضو کام ہی نہیں کر رہا، اعصاب ناکارہ اور ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں تو وہ کیا کرے گا؟

☆ یعنی آپ کو بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آتی؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

○ مجھے تو دور دور تک نظر نہیں آتی۔ اندازہ لگائیں آلِ سعود، سعودی خاندان کا۔ کل خبر آئی ہے کہ محرم کے بغیر عورت کو سفر کی اجازت مل گئی ہے۔ وہ بھی اِس لیے کہ اُنھوں نے احتجاج شروع کر دیا تھا اور پورے خطے کے حالات خراب ہیں۔ یہ کس دنیا میں رہ رہے ہیں؟ قرآن حکمت ہے۔ مومن کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ''مومن کی فہم و فراست سے ڈرو'' اور دوسری کیا مومن کی تعریف ہے سبحان اللہ ''مومن اپنے عصر سے ہم آہنگ ہوتا ہے'' یعنی اپنے عہد کے تقاضوں کو مومن سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ یہ سن 2011ء میں کون لوگ ہیں؟

احمر سہیل بسراء: بعض لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان بننا تاریخی طور پر برصغیر کی ایک بہت بڑی غلطی تھی؟

○ یہاں یہ ایک چیز بھی بربادی کا باعث ہے کہ آپ کوئی اکیڈمک (Academic) بات بھی نہیں کر سکتے، اور نہ سوال اُٹھا سکتے۔

احمر سہیل بسرائ: سیکھنے کے نقطۂ نظر سے بھی کوئی بات نہیں کر سکتے؟

○ کوئی بے غیرت کھڑا ہو کر کہہ دے گا کہ غدار ہیں۔ کوئی کہہ دے گا وطن دشمن ہیں۔ بکواس شروع کر دیں گے۔ یہ جو آپ نے بات کی ہے میں اکثر سوچتا ہوں۔

احمر سہیل بسرا: آف دی ریکارڈ تو لوگ باتیں کرتے ہیں۔

○ نہیں، آف دی ریکارڈ نہیں۔ میری بات تو ریکارڈ پر ڈالیں۔ میں بعض اوقات سوچتا ہوں یار ہم نے کیوں دوڑ لگائی۔ سترہ اٹھارہ کروڑ اِدھر ہیں۔ لگ بھگ اتنے ہی انڈیا میں اور تقریباً اتنے ہی بنگلہ دیش میں۔ پچاس پچپن کروڑ لوگ، 'نتھ' نہ ڈال دیتے ہم؟ اِس معاملے کو دیکھنے کا یہ بھی ایک زاویہ ہے۔ یہ پاکستان کی مخالفت یا حمایت نہیں ہو رہی۔ یہ ایک نصابی (Academic) سوال ہے۔ اِس سے ہوتا یہ ہے کہ جب آپ سوالوں کو شہہ دیتے ہیں تو آپ کُھل کر بات کرنے کا ایک ماحول بناتے ہیں۔ اِس طرح جس کی بات میں دَم ہوگا اُسی کا اثر ہوگا یا وہی بات مانی جائے گی۔ یہ چُھری یا چاقو نکال لینا، اس عمل سے نقصان کِس کا ہوگا؟ اپنا ہی!۔ اجتماعی نقصان ہے۔ ہم برباد ہو گئے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ جس بنیاد پر بنگلہ دیش علیحدہ ہوا تھا، زبان اور معیشت کے حق پر وہ شناخت تو ہم اپنے صوبوں میں اپنے لوگوں کو بھی نہیں دے رہے۔

○ ایک منٹ رُک جائیں۔ غیر منصفانہ طرزِ عمل سے ایک گھر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اگر اپنی اولاد کے ساتھ ڈنڈی مارنا شروع کر دوں تو آپس میں نفرت بڑھ جائے گی کہ باپ نے اُس کو یہ دے دیا، مجھے نہیں دیا۔ یہ حقیقت ہے۔ میں ایک بات بہت دیر سے کہتا آ رہا ہوں کہ اگر وسائل نہیں ہیں تو بے غیرتو بھوک ہی برابر بانٹ لو۔ غیر منصفانہ طرزِ عمل دیر تک نہیں چلتا کیونکہ وہ جھوٹ اور غلط ہوتا ہے۔

یہ لوگ تاریخ کو مسخ کرتے ہیں۔ اب سوچیں بے غیرتی کا نقصان کیا ہوتا ہے؟ اگر آپ ایک غلطی مان ہی نہیں رہے تو لامحالہ آپ وہی دوبارہ کریں گے۔ میری نسل ایک غلطی کر کے گئی ہے اور ہم بے غیرتوں نے مانا ہی نہیں۔ ہم نے سقوطِ ڈھاکہ دو باتوں میں فارغ کر دیا کہ یحییٰ خان شراب پیتا تھا اور ہندو کی سازش تھی۔ یہ دو لفظ بول کر اُنھوں نے اپنے گناہوں، جرائم اور کرتوتوں پر پردے ڈالے۔ دنیا کے نوّے فی صد ٹاپ کے جرنیل شراب پیتے تھے۔ آئے جس نے مجھ سے بات کرنی ہے، کر لے۔

اچھا! دشمن کی سازش! تم پوچھے ہو؟ سازش کا لفظ منفی معنوں میں ہے۔ یہ تو ذہانت کی بات ہے، سیاست ہے۔ وہ آپ کے بھائی بند تو نہیں ہیں۔ آپ تو بھائیوں کی گردنیں اُتارنے والے لوگ ہیں۔ وہ تو آپ کے حریف ہیں۔

☆ جب مذہب کے نام پر پاکستان بنتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ہماری فتح ہے اور یہ اسلامی ملک ہے اور جب ایسٹ تیمور یا سوڈان میں لوگ اِسی بنیاد پر مطالبہ کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہ امریکہ کی سازش۔۔۔

○ یہ غلط اپروچ ہے۔ خلفائے راشدین کی ہم بات نہیں کرتے۔ بنو اُمیہ، بنو عباس کا میں نے ذکر کیا، تاریخ میں نے تو نہیں لکھی۔ مگر ہوا کیا؟ سپین میں کیا ہوتا رہا؟ غدّاریاں اور ایک دوسرے کی گردنیں۔ سلطنت عثمانیہ، مغلوں اور سلاطین دہلی کے زمانے میں کیا ہوتا رہا؟ ایران کے صفوی کیا کرتے رہے ہیں؟ شیبانی خان کا سر کٹوا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کر اُس کی کھوپڑی پر سونا چڑھا کر اسماعیل صفوی اُس میں شراب پیتا رہا ہے۔ آپ ایک دوسرے کی گردنیں مارتے رہے ہیں۔

انسانوں کو اکٹھا رکھنے کیلئے انصاف کی قدر مشترک ہے، باقی تو نام ہیں۔ میں بھی، آپ اور یہ بھی مسلمان ہیں۔ زرداری صاحب اور نواز شریف بھی مسلمان ہیں۔ ایک کا پیسہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ دوسرے کو روٹی نہیں مل رہی ایک بدہضمی، دوسرا بھوک کا شکار ہے۔ اوپر سے آپ 'ایویں ای' پردہ ڈال رہے ہیں۔ چونکہ نام مسلمانوں والے ہیں۔ سب کے ختنے ہوئے ہیں اِس لئے ہم مسلمان ہیں۔ اوہ بھائی نہیں۔ وسائل اور اقتدار میں شرکت، شراکت اور انصاف بچائے گا۔ یہ ڈنڈی دُور تک نہیں چلتی۔ بلوچستان میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ اِس لئے ہو رہا ہے کہ ایسٹ پاکستان میں Debacle کے بعد سوائے جھوٹ کے آپ نے بولا ہی کچھ نہیں۔

☆ ایک چھوٹا سا ذاتی سوال ہے۔ صحافی حلقوں میں ہی بات ہوتی ہے کہ عطاالحق قاسمی اور آپ نے صحافی کالونی والے پلاٹس کی ڈاؤن پیمنٹ بھی خود نہیں کی حالانکہ وہ بہت تھوڑی سی رقم، شاید 35 ہزار روپے تھی؟

○ وہ 35 ہزار سے بہت زیادہ تھے اور کمال یہ ہے کہ میں ایڈوانس میں دے چکا ہوں شاید تین قسطوں میں۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ پیسے جمع کروانے کی حد کم کر دی گئی ہے۔ میرا تو کلیم بنتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ الحمدللہ میں بہت متمول ہوں۔ میں 1980ء میں سعودی عرب گیا اُس کے بعد ہمیشہ میرے پاس دو، دو گاڑیاں رہی ہیں۔ کچھ سال میں نے جرنلزم نہیں بھی کیا۔ جب 80ء میں سعودی عرب گیا تو ظاہر ہے میں وہاں بیٹھ کر جرنلزم تو نہیں کر رہا تھا۔ میں نے تو اُس وقت بھی بیدیاں روڈ پر کچھ ایکٹر کا فارم ہاؤس بنایا تھا۔ بعض لوگ ایسے ہی بکواس کرتے ہیں۔

☆ آپ کے کالموں میں بیلی پور کا بہت تذکرہ ہوتا ہے۔۔۔

○ میں نے پہلا گھر 1981ء میں سعودی عرب کی کمائی یعنی ریالوں سے بنایا۔ یہاں کا کوئی پیسہ نہیں تھا۔ وہ گھر ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن میں تھا۔ اُس سے میں اُوب گیا۔ پھر میں نے بیدیاں روڈ پر پانچ چھ ایکٹر پر ایڈونچر کیا۔ وہاں میں اپنے ہی ایڈونچر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے تنگ آ گیا۔ نہ کوئی یار نہ دوست، میں نے سوچا میں کدھر آ گیا بھئی؟ بچپن میں میاں چنوں میں اپنے دادا کے ساتھ رہا ہوں۔ لہٰذا شہروں سے ذرا دُور رہنے کا مجھے بچپن سے شوق تھا۔ ویسے بھی اپنے مزاج کی بات ہوتی ہے۔ یہاں ہم نے گھوڑے، مور، چکور اور بھینسیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں تو نہیں رکھ سکتے۔ پینڈو لوگ ہیں، یہ تو ہمارا بچپن کا شوق ہے۔ بیدیاں والے تجربے سے میں نے یہ سیکھا کہ اگر شہر سے باہر جانا ہے تو دو چار قریبی دوستوں کو قائل کر کے ساتھ لے جاؤ۔

الحمدللہ سکول سے لیکر آج تک میرے دوستوں کا مجھ پر اندھا اعتماد ہے۔ میں نے چند دوستوں کو بیلی پور کی تجویز دی تو انھوں نے کہا 'جی موسٹ ویلکم' مگر ہم نے کرنا کچھ نہیں۔ یہ خرید و فروخت، بجلی لگوانی ہے یا کچھ اور وہ ہم نے کچھ نہیں کرنا، بس اپنے اپنے حصے کے پیسے دیں گے۔ میں نے کہا ٹھیک، لہٰذا میرے ذاتی دوست جن میں کوئی بھی صحافی یا سیاست دان نہیں ہے۔ ابرار بھٹی کسٹم میں ہے جس کا میں ذکر کرتا رہتا ہوں۔ ہم نے یہ جگہ وغیرہ لے لی بعد میں محمد علی دُرّانی دوست ہیں بھائی ہیں۔ اُنھوں نے یہاں آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے کہا آ جاؤ۔ شامی (مجیب الرحمن) صاحب اور افضل سندھو کو پتہ چلا تو وہ بھی آ گئے۔ پیسے آتے گئے ہم جگہ لیتے گئے۔ جب ہم نے یہ زمین خریدنی شروع کی تو یہاں چار پانچ لاکھ میں ایکڑ تھا۔ اور یہ زمین ہم نے اکٹھی نہیں لی۔ کبھی بیگھہ کبھی ایک دو ایکڑ لے لی اور میں آپ کو کمال کی بات بتاؤں یہاں کے لوگ ہنستے تھے: ''باؤ پھس گئے''۔ ان سادہ لوگوں کے پاس وژن نہیں تھا۔ جہاں آٹھ دس گھر بن جائیں وہاں زمین کی قیمت ویسے ہی اُوپر چلی جاتی ہے۔ اُن کے نزدیک یہ کلراٹھی زمین تھی جہاں ''باؤ پھس گئے تھے''!

☆ اخباروں میں بھی آتا رہا کہ رستے کا کوئی ایشو ہے، عام دیہاتیوں کا رستہ تھا اور حسن نثار جانے نہیں دیتے؟

○ نہیں، نہیں اِس طرح نہیں ہوتا۔ ناکام لوگ اِسی طرح کہتے ہیں۔ سیدھی سی بات

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے اگر میں نے فرنٹ پر جگہ خریدی ہے تو آپ اُس میں سے گزر کر کیسے جا سکتے ہیں وہ تو میری ذاتی جائیداد ہے۔ ہوا یہ تھا کہ یہاں ایک بندے نے جو میرا دوست ہی تھا چالاکی کر کے، ہماری اجازت کے بغیر، بالا بالا ہی، میرا نام استعمال کر کے پیچھے ایک دو لوگوں کو جگہ بیچ دی۔ تو بیلی پور کا تو مقصد ہی بیلی ہے، یہ کوئی کمرشل جگہ تو ہے نہیں۔ الو کے پٹھے بکواس کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ یہاں بے شمار جانے پہچانے لوگ ہیں۔ یہاں میں نے کئی بار ذاتی نقصان اُٹھایا ہے مثلاً کسی دوست کا بیعانہ ہو گیا مگر باقی رقم کا بندوبست نہیں ہو رہا۔ اسی طرح دیگر معاملات لیکن یہ بستی میرا خواب تھا۔ کسی نے کہا کہ اس کا نام حسن آباد، فلاناڈھمکانا رکھیں۔ میں نے کہا: دوستوں کی بستی ہے اِس کا نام بیلی پور رکھتے ہیں۔ میں نے اِس جگہ کو آباد کرنے میں بہت محنت کی ہے۔ اللہ جنت نصیب کرے ملک معراج خالد کو، جو پیار سے مجھے مرشد کہتے تھے، جب میں نے انھیں یہ جگہ دکھائی تو کہنے لگے "یار اِدھر تو گھاس بھی نہیں ہونی" میں نے کہا:

"میں ارائیاں دا بال آں، مینوں پتا اے ایتھے کیہہ ہونا ایں تے کیہہ نہیں"۔

وہ الحمدللہ میں نے کر لیا۔ یہاں چیکو، آم اور جامن بھی لگتے ہیں آپ جس فروٹ کا نام لیں گے وہ یہاں ہوگا۔

ہم مڈل کلاس کے لوگوں نے پلاننگ کی اور اِس کے پیچھے ذہن تھا۔ یہ جو بھڑوے بکواس کرتے ہیں اِن کو نہیں پتا۔ ایک ایک بات ریکارڈ پر ہے۔ خریدار اور بیچنے والے دونوں یہیں موجود ہیں۔ دوست آتے گئے اور ہم پیسے اکٹھے کر کے ٹکڑوں میں زمین خریدتے رہے۔ بس ایک سٹریٹجی اور وژن تھا۔

☆ اِس منصوبے میں بنیادی طور پر آپ کی سعودی عرب والی کمائی تھی یا کالموں۔۔۔

○ اونہیں بھئی نہیں۔ پیسے والا تو اِس میں کام ہی کوئی نہیں تھا۔ ویسے میں مہینے کا سوا لاکھ روپیہ ٹیکس دیتا ہوں، سال کا نہیں، مہینے کا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اُس وقت یہاں ایکڑ کی قیمت پانچ لاکھ بھی نہیں تھی، جب چودہ پندرہ سال پہلے ہم نے یہ 'پنگا' لیا۔ یہ سارا بیلی پور میرا تو نہیں۔ بے شمار دوست ہیں، جن میں سینیٹر طارق چودھری، سمیع

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صاحب اور میرا چھوٹا بھائی بھی ہے۔

☆ آپ اپنے مخصوص لہجے میں (اے آر وائی کے پروگرام الیونتھ آور جسکے میزبان وسیم بادامی ہیں) سیاستدانوں کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے، تو مسلم لیگ (ن) کے سینیٹر مشاہداللہ نے ذاتی حملے شروع کر دیے۔ فارم ہاؤس کا بھی ذکر کیا۔

○ ہاں وہ کتا ہے!.....

☆ آپ بھی غصے میں آ گئے.....؟

○ جو لوگ میرے کالم پڑھتے ہیں انھیں پتہ ہوگا کہ میں تو صدر کی دعوت پر نہیں جاتا۔ پرویز مشرف کی دعوت پر نہیں جاتا تھا۔ مجھے کسی نے طعنہ دیا کہ کہتے ہو کہ یہ آمریت ہے اور فلاں ہے، یہ ہے وہ ہے اور ساتھ تم اُس کی بریفنگ پر بھی چلے جاتے ہو۔

میں چُپ ہو گیا، اُس وقت کوئی جواب نہیں دیا لیکن اُس کے بعد میں کبھی نہیں گیا۔ تین دفعہ تو کالموں میں معذرت کی بھئی مجھے بلانا چھوڑ دو، میں نے آنا تو ہوتا نہیں۔ جو آدمی ایسے تفاخرانہ طرزِ عمل (Arrogant behaviour) کا مالک ہو۔ ایسے کہنا تو نہیں چاہیے اب منہ سے نکل گیا تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ یاد رکھیں تلخ و تُند آدمی وہ ہوگا جو دیانتدار ہو۔ جن بھڑووں نے پلاٹ کھائے ہیں انھیں ٹی وی پر بیٹھ کر ماننا پڑا ہے کہ ہمارے اُس وقت حالات ٹھیک نہیں تھے۔

☆ حسن صاحب اگر آپ نہ غُصے میں آتے تو.....

○ نہیں.....وہ کتا بکواس کر رہا تھا.....ایک دو ٹکے کا آدمی۔ کسی کی دی ہوئی شان و شوکت (Reflected glory) میں رہنے والے۔ آج اگر نواز شریف اُسے فارغ کر دے تو اُس کی حیثیت کیا ہے؟ تو میرے فارم ہاؤس یا میری گھڑی کی بات کر رہا ہے۔ کُتا آدمی ہے۔

☆ بلکہ وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے آپ نشے میں ہیں، نشہ تو نہیں کیا آپ نے؟ یہ ہے .....وہ ہے.....

○ میں تو نشے میں ہوں۔ میں تو مستقل نشے میں ہوتا ہوں۔ فضول بات.....

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

☆ آپ سمجھتے ہیں کہ اُسے کسی نے پلانٹ کیا تھا کہ آپ پر بات کرے.....

○ آئی ڈونٹ نو.....

☆ یہ بھی ہوتا ہے ناں، ایک بندہ ٹارگٹ پر ہو؟

○ شاید مجھے اتنا ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے یہ بات تھوڑے عرصے بعد محسوس کی۔ آپ یقین کریں میں اس لیے کسی سے ملتا نہیں ہوں کہ بنیادی طور پر میں بہت محبت کرنے والا آدمی ہوں۔ مجھے اپنی کمزوری کا پتا ہے میرا تعلق بن جائے پھر میرے لیے ہر چیز ثانوی ہو جاتی ہے۔ اِس لیے میں سیاستدانوں کو ملنے سے گریز کرتا ہوں۔ میرا اِس معاملے میں بہت زیادہ گریز ہے۔ میرا تعلق ہو تو پھر میں دایاں بایاں نہیں دیکھتا۔ پھر میرا کوئی اصول اصال نہیں۔ یہ ریکارڈ پر جانے دیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ میرا اگر آپ کے ساتھ تعلق ہے تو پھر آپ کا غلط صحیح جائے بھاڑ میں۔ اگر میں نے بھی آپ کو میرٹ پر ہی دیکھنا ہے تو میرا آپ کا تعلق کہاں گیا؟ سو میں ملنے ملانے سے پس و پیش کرتا ہوں اِس لیے کہ مجھے شرم حیا مارتی ہے۔ یہ کتے بلے جب ضیاء الحق کے پیچھے دُم ہلاتے پھرتے تھے تو ہم نے جیلیں منتخب کیں اور کبھی پیپلز پارٹی وغیرہ اور اِن لعنتیوں کو اِس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ تمہارے لیے کتنے ڈیکلریشن منسوخ کروائے اور جیل گئے۔

☆ آپ 'مساوات' کے بھی چیف ایڈیٹر رہے؟

○ وہ تو بعد کی بات ہے۔ 86ء میں بے نظیر بھٹو کے واپس آنے کے بعد کی بات ہے۔ میں تو ضیاء الحق کے زمانے کی بات کر رہا ہوں بعد ازاں پھر میں سعودی عرب چلا گیا۔ پیپلز پارٹی آئی تو کبھی اُن کے پاس نہیں گیا۔ اِن سے لینا دینا کیا ہے۔ اگر کسی کیلئے کلمہ خیر لکھا ہے تو وہ میرٹ پر لکھا ہے، کسی پر احسان تھوڑا کیا ہے۔ تو اِس طرح کے آدمی پر اگر آپ انگلی اُٹھاتے ہیں، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

☆ بادامی صاحب بندے کو تھوڑا Provokel بھی کرتے ہیں۔ یہ اینکرز کا بھی قصور نہیں ہے کہ وہ جان بوجھ کر ایک بات چھیڑتے ہیں اور خود خاموش رہتے ہیں؟

○ وہ تو اپنی اپنی دکانداری کا مسئلہ ہے۔ حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ میں نے آپ کے سامنے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اعتراف کیا ہے کہ مجھ سے یہ زیادتی ہوئی مجھے جنتاری ایکٹ کرنا چاہیے تھا، میں نے اُس سے کہیں زیادہ کیا۔ یہ مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ Provoke کرنے والے کا تو اپنا کام ہے وہ اپنے لیے جوابدہ ہے۔ لیکن جو الو کا پٹھا Provoke ہو رہا ہے اُسے بھی تو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہئے۔ قصور میرا ہے۔ میں بادامی سے زیادہ سینئر آدمی ہوں۔ شاید پڑھا لکھا بھی اُس سے زیادہ ہوں۔ دنیا بھی شاید اُس سے زیادہ دیکھی ہو۔ اگر میں ہی غصے میں آ گیا تو بیوقوف تو میں بنا۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ میڈیا یہی کچھ بیچ رہا ہے۔۔۔؟

○ یہ کاروبار ابھی نیا نیا ہے۔ اِس میں مارجن دینا چاہیے۔ کچھ ایسے لوگ آ گئے ہیں جن کی کوئی ٹریننگ نہیں ہے۔ ہم نے ایک زمانے کی مار کھائی ہوئی ہے۔ 1972ء میں یونیورسٹی میں تھا جب میں نے اپنا کیریئر ''دھنک'' سے شروع کیا۔ چالیس سال کا بیک گراؤنڈ ہے۔ الیکٹرانک میڈیا میں کچھ لوگ آئے ہیں جنھیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے، آہستہ آہستہ میچور ہو جائیں گے۔

☆ آپ شہر کی اِتنی مقبول شخصیت ہیں مگر تقاریب میں بہت کم نظر آتے ہیں؟

○ (ہنستے ہوئے) میں فیلڈ کا صحافی تو ہوں نہیں۔ وہ دور کب کا ختم ہو چکا۔ میں تو اب Opinion making کرتا ہوں جس کے لیے مجھے بہت پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے ٹائم چاہئے۔ میں اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کوئی اِدھر کوئی اُدھر پہنچا ہوا ہے۔ بھئی اتنے متحرک لوگ ہیں۔ سوچتا ہوں یا خُدا یہ پڑھتے کس وقت ہیں۔ کوئی ادھر کوئی اُدھر بھاگا ہوا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں میں مردم بیزار ہوں، مغرور ہوں یعنی اِس طرح کی باتیں۔ حالانکہ اس کی دوسری وجہ میری سُستی ہے۔ کون تیار ہو۔ کون ڈرائیو کرے اور جائے پھر رات کو آئے۔ ضرورت کیا ہے؟ اب میں بیٹھا ہوا ہوں تو بیٹھا ہوں۔ مجھے بالکل یاد نہیں تھا کہ آپ نے آنا ہے۔ میں نے عاصم (منیجر) کو ڈانٹا کہ تمہیں پتا ہے میری عادت کا۔ تم نے یاد نہیں کروایا۔

احمر سہیل بسرائی: سیاست دان یہ بات کرتے ہیں کہ میڈیا صرف ہمارا ہی احتساب کرتا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے۔ یہاں دوسرے بھی ہیں اُن کا احتساب کیوں نہیں ہوتا۔ آپ یہ بتایئے کہ یہ جواز کہاں تک درست ہے کیونکہ وہ تو ملک کے لیڈر ہیں اُن کا احتساب زیادہ ہونا چاہیے؟

o اُن کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن انھیں ایک بات کی سمجھ ہونی چاہئے، میں بلکہ لکھوں گا بھی اچھا ہے آپ کی بات سے مجھے خیال آیا کہ جب ہم سیاستدانوں کو برا بھلا کہتے ہیں تو وہ ہمارے ڈاکٹروں سے زیادہ گندے نہیں۔ جیسے ہمارے جرنیل ہیں، جیسے ہمارے جج رہے ہیں لگا تار پی سی او۔ جتنی بدکاری اور خرکاری جو بھی کہہ لیں باقی شعبوں میں ہے اُتنی ہی سیاست دانوں میں ہے لیکن ڈاکٹر، جرنیل، یا محکمہ آب پاشی کا انجینئر جو حرام کھاتا ہے، ووٹ لیکر نہیں آیا ہوتا۔ بات آپ کی سو فیصد درست ہے اور اُن کا اعتراض بھی درست ہے لیکن اتنا اُن کے ذہن میں ہونا چاہیے کہ وہ ووٹ لے کر آتے ہیں۔ چلیں میں مان لیتا ہوں، بشمول میرے جرنلسٹ بھی اُتنا ہی بُرا ہوگا، جتنا سیاستدان۔ مگر بھئی ہم ووٹ لے کر تو نہیں آئے۔ مجھ پر تیس چالیس ہزار ووٹ اور اپنے لوگوں کی توثیق کا بوجھ نہیں ہے کہ جاؤ بھائی، یہ بہت بڑی بے غیرتی ہے۔ مجھے تو ایک بندہ اپنا نمائندہ بنا لے تو اُسے سنبھالنا مشکل ہوگا۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ میرا تعلق کہیں بن جائے تو میرے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ کجا چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر ہزار یا جتنا بھی بندہ آپ پر ٹھپا لگا کر بھیجتا ہے۔ اور وہ بے غیرت ملک کے مفادات ہی نہیں دیکھتا۔ اِس لیے وہ ہدف ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ باقیوں سے کم یا زیادہ کرپٹ ہے۔ دوسرا اُن کے پاس کرپٹ ہونے اور زیادہ پیسہ بنانے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ بس اتنا فرق ہے۔ اچھا ہے یہ مجھے خیال آیا ہے، یہ میں وضاحت کروں گا۔ ایسا نہیں ہے کہ سیاستدان باقیوں سے کوئی زیادہ کرپٹ ہیں۔ ایسی بات نہیں۔ مسئلہ تو مجموعی طور پر ہے۔ اگر آپ کو بخار ہوگا تو یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کے دائیں ہاتھ کی دائیں اُنگلی کو تو بخار ہو اور باقی سارا جسم ٹھیک رہے۔ سیاست دانوں پر لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ اُن کو لوگوں نے بھیجا ہوتا ہے۔ میں اگر کالمسٹ ہوں یا جو کوئی بھی ہوں میں اپنی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وجہ سے ہوں۔ میں کسی کی وجہ سے شان وشوکت (Reftected glory) کا مالک نہیں ہوں۔ مجھے کسی نے ووٹ دے کر کالمسٹ، سنگر یا ڈاکٹر نہیں بنایا۔ ڈاکٹر اگر میں بنا ہوں تو اپنی 'ہک' (سینے) کے زور پر بنا ہوں۔ بھئی تم تو اُن کے مصلّی ہو جنھوں نے تمہیں ووٹ دیکر بھیجا ہے اور اگر تم اُن کو ہی زچ کر رہے ہو تو پھر تم سیدھے سیدھے بے غیرت ہو۔

☆ لیکن یہ بھی دیکھئے نا ایک عام بندہ کسی حلقے سے الیکشن لڑنا چاہتا ہے اور اگر اُس کے پاس، بیس کروڑ روپیہ نہیں ہے تو اُس کو تو کوئی پارٹی ٹکٹ بھی نہیں دے گی!

○ یہ آپ نے بالکل موضوع ہی اور چھیڑ دیا..... یہ بالکل ہی اور موضوع ہے۔ میں اِسی لیے تو اِس جمہوریت سے نفرت کرتا ہوں اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جس میں موروثیت ہے۔ ایک بات یاد رکھیں۔ بادشاہت اس طرح کی لعنتی جمہوریت سے کروڑ گنا بہتر ہے۔ بادشاہ کا صرف وہ بیٹا آگے آتا تھا جس میں دم ہوتا تھا۔ وہ باقی بھائیوں کو مار کر آگے آتا تھا۔ اورنگزیب اگر آگے آیا تھا تو آپ اُسے جو مرضی کہہ لیں میں اُسے پسند کروں نہ کروں لیکن اُس نے بھائیوں بھتیجوں سمیت سب کو چت کر کے اپنا رستہ بنایا۔ وہ مکڑ آدمی دلیری اور سازش میں بھی لاجواب تھا، ٹھیک ہے۔ یہاں تو بیٹا پاگل نما بھی ہو تو پارٹی اُس کے سپرد۔ یہ سیاسی دُکانیں ہیں۔

☆ حسن صاحب آپ کے شروع والے کالموں میں غریبوں کا بہت رونا پیٹنا ہوتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی آپ کالموں میں اُن کو بھی رگڑا لگا جاتے ہیں کہ یہ اپنی حالت کے خود ذمہ دار ہیں؟

○ ہاں..... ٹھیک ہے..... بہت اچھے..... سچی بات ہے آپ کا پہلا سوال ہے جو بہت اچھا ہے اور جس کے اندر ذہانت ہے۔ جواب دینا بہت آسان کام ہے۔ خوبصورت سوال کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دیکھیں آدمی Grow کرتا رہتا ہے۔ میں ایک زمانے میں پیپلز پارٹی کا بھی عاشق رہا ہوں۔ بھٹو مجھے ایک زمانے میں بڑا زبردست لیڈر لگتا تھا۔ اب مجھے بھٹو درمیانہ لیڈر لگتا ہے خواہ مخواہ لوگوں نے سر چڑھا رکھا ہے۔ وہ کوئی اتنی بڑی توپ نہیں تھا۔ یہ جو آپ بات کر رہے ہیں میں نے ایک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عرصے میں اِس حقیقت کو سیکھا اور محسوس کیا ہے۔ یار اِس ملک کا صرف بالائی طبقہ نہیں بلکہ عام لوگ بھی برابر کے کرپٹ ہیں۔ اِن کو پتا ہوتا ہے کہ کس حرامی کو ووٹ دینا ہے۔ یہ صرف 'ڈنگ ٹپاؤ' لوگ ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کس چور اور بدمعاش کو کہہ رہے ہیں کہ میرے پُتر کو نوکری دِلا دینا، تھانے میں کام ہے۔ میرے گھر میں راشن آجائے۔ اِن کو دُور رس نتائج کا شعور ہی نہیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ آپ کا لیڈر ہی نہیں بلکہ اصل المیہ یہ ہے کہ ووٹر بھی کرپٹ ہے۔

☆ لیکن اُسکے پاس کوئی اور راستہ بھی تو نہیں؟

○ اور راستہ کیوں نہیں ہے۔ مجھ سے پوچھیں میں کیا کرتا ہوں۔ میں کسی کو ووٹ ہی نہیں دیتا۔ جب تک کوئی میرے دل کو نہیں لگے گا میں ووٹ نہیں دوں گا۔

☆ آپ تو اپنے مسئلے مسائل حل کرنے کے خود قابل ہیں۔ عام بندے کے پاس نہ تعلیم ہے نہ روزگار۔

○ تو اسی لیے بہتر بندے کو ووٹ دیں۔

☆ بہتر کوئی ہے ہی نہیں تو کیا کریں؟

○ گھر بیٹھو، اِن لعنتیوں کو تو ووٹ نہ دو۔ یہ بہت خوفناک احتجاج ہے۔ آپ اندازہ لگائیں اگر الیکشن ہو اور صرف پانچ فیصد ووٹ پڑیں تو کہرام نہیں مچ جائے گا۔

☆ ٹی وی پروگرامز اور آپ کے غصے پر بات ہوئی کیا وجہ ہے آپ ہر شو میں ہی غصے میں آجاتے ہیں؟ گالیاں دیتے ہیں، جیسے تھڑدِلے، بے غیرت.....

○ وجہ یہ ہے کہ میں احمق آدمی نہیں ہوں۔ جوانی میں بھی میرے اندر بے ہودہ بات کے لیے برداشت نہیں تھی، اب تو خیر بالکل ہی نہیں رہ گئی۔ ایک موٹی سی بات بھی اگر کسی آدمی کو سمجھ نہیں آرہی۔ یہ عظیم سائنسدان، محسنِ پاکستان، او کچھ حیاء کرو۔ کیوں بچوں کو جھوٹ بتا رہے ہو۔ ایٹم بم کوئی توپ نہیں ہے۔ اِس کو استعمال ہوئے تقریباً 68 سال ہو چکے ہیں۔ تھیوری کسی نے دی، بنایا کسی نے، چلایا کسی نے، آج میں اور آپ ہم تینوں مل کر بالفرض کوئی کار بنا لیتے ہیں تو ہم کیسے آٹو موبائل کے چمپئن ہو گئے؟ بھئی آٹو موبائل کا باپ ہے ہنری فورڈ جس نے پہلی دفعہ موٹر کار

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چلائی تھی۔ ایٹم بم آپ نے بنا کے کونسا معرکہ مارا ہے۔ لوگوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ایٹم بم کو Philosophically دیکھیں۔ یہ بھوکے کی بھوک کی حفاظت کر رہا ہے۔ جنھوں نے حرام کھایا ہوا ہے ان کے حرام کی حفاظت کر رہا ہے۔ ڈیٹرنٹ، ڈیٹرنٹ؟ ڈیٹرنٹ لوگ ہیں بھئی۔ یہ سترہ کروڑ جو تم نے کیڑے مکوڑے چھوڑے ہوئے ہیں۔ اِن کو کھڑا کرو یہ خود سترہ کروڑ ایٹم بم ہیں۔

☆ ہم انڈیا کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں وہ ہمارے وجود کا دشمن ہے اور ہم پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں بھارت سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے جبکہ بعض لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح کی ہماری حرکتیں ہیں وہ شاید دیوارِ چین بنا دے کہ یہاں سے کوئی بندہ اُدھر نہ جا سکے؟

○ آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں، سترہ کروڑ کا آوارہ ہجوم جن کی نہ کوئی سمت ہے نہ ڈائریکشن نہ فلاسفی۔ کبھی آپ کی کرنسی اُن سے بہتر تھی اب ٹکے ٹوکری ہے۔ آپ سے تو بنگلہ دیش کا ٹکا آگے نکل گیا ہے۔ اس طرح کے ہجوم کو اُٹھوں نے لے کر کرنا کیا ہے؟ وہ ہم سے کئی گنا بڑے ہیں، ان کی معیشت ہم سے کئی گنا بڑی، ان کی آبادی ایک ارب سے آگے چلی گئی ہے۔ آپ چونکہ چھیڑ چھاڑ (Pin off) کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان کو یہ نہیں کرنا چاہئے۔ آپ نے اس کو سکیورٹی سٹیٹ بنا دیا ہے۔ بھئی آپ اس کو ویلفیئر سٹیٹ بناتے۔ آپ کے بچوں میں سے کوئی نیوٹن، آئن سٹائن، ایڈیسن، یا مارکونی نکلتا۔ ان چوراُچکوں نے کیا کرنا ہے؟

احمر بسرائی: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان بطور ریاست کے ناکام ہو چکا ہے؟

○ ریاستیں فیل نہیں ہوتیں۔ ریاست کیا ہوتی ہے؟

احمر بسرائی: لوگ۔۔۔؟

○ ہاں۔ عوام کی بات کرتے ہیں۔ ساری کائنات بہت خوبصورت ہے۔ بنانے والا المصوّر چونکہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس لیے اس کا بنایا ہوا ہر ملک اور ہر سیارہ بہت خوبصورت ہے۔ اُس کا بنایا ہوا کھیل بہت خوبصورت اور حیرت انگیز ہے۔ اصل میں فیل یا ناکام ہوتی ہے اشرفیہ اور عوام۔ اِن دو لفظوں: کامیاب اور ناکام

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے درمیان ایک چیز مشترک ہے، کام۔ اگر آپ نے تعمیری کام کیا ہے تو آپ ایک کامیاب ریاست ہیں۔ اگر آپ نے تخریب کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں کیا تو آپ ناکام ہوں گے۔ ناکامی اور کامیابی ایک سیدھی سیدھی بات ہے۔ طاقتور آدمی کو ملک کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ ذہن میں رکھیں۔ پوری دنیا مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ امریکہ، انگلینڈ میں سینکڑوں لوگ ہیں۔ انور پرویز کو اُنھوں نے سر کا خطاب دیا ہے۔ یہاں بھوکا ننگا لارڈ نذیر..... یہاں ہوتا تو اسے جیرا جیرا کہہ کے مار دیتے۔ وہاں وہ ہاؤس آف لارڈز میں بھی پہنچ گیا ہے۔ مطلب جو طاقتور ہے، محنتی ہے۔ دشمن ملک میں یہاں سے عدنان سمیع گیا ہے۔ اُس نے اپنی جگہ بنالی۔

ملک کمزور کی ضرورت ہے۔ میں نصابی (Academic) بات کر رہا ہوں، صرف پاکستان کی بات نہیں۔ ہر وہ ریاست ناکام ہے جو اپنے کمزور کو تحفظ نہیں دے سکتی۔ تحفظ میں سب کچھ آ جاتا ہے۔ اقتصادیات، انصاف، عدالت اور شہری کی عزت بھی۔ جو ملک اپنے کمزور کو تحفظ نہیں دے سکتا وہ کیا ملک ہے، ملک تو ضرورت ہی کمزور کی ہے۔ طاقتور آدمی کا کیا ہے وہ باہر چلا جائے گا۔ میرے اپنے بے شمار دوست ماشاءاللہ باہر بہت سیٹل ہیں۔

احمر سہیل بسرا: یہ جو ابھی صورتحال چل رہی ہے۔۔۔

○ اِس کا بہت سادہ سا جواب ہے۔ ایک دو بہت اہم لوگوں نے اِس پر بہت بُرا بھی منایا، اعتراض بھی کیا اور احتجاج بھی کیا۔ مجھے کسی نے پوچھا تھا: کیا حالات ہیں، آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے تو حالات اِس قسم کے لگ رہے ہیں۔ 'توڑی کی پنڈ' چوک میں کھل گئی ہے اور آندھی چل پڑی ہے۔ یہ ہے آج کا پاکستان۔ اب تیز آندھی میں توڑی کی پنڈ کھل جائے تو جس میں حوصلہ ہے وہ سنبھال لے۔ لیکن اِس میں آپ ایک اور چیز کا اضافہ کریں۔ ہمارے جو اسلاف کی دانش ہے وہ بہت زبردست ہے۔ وہ قرآنی دانش ہے۔

☆ اسلاف سے کیا مراد ہے؟

○ آقا نبی کریمؐ سے شروع کرتا ہوں اور آگے جو اُن کے قریبی ہیں اُن کی بات کرتا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ ''کفر پہ قائم معاشرہ زندہ رہ سکتا ہے، ظلم پر قائم معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا'' کیا خوبصورت اصول ہے۔ اور یہی آفاقی اصول ہے۔ جن کا ہم نام لیتے ہیں اُن کی تعلیمات تو یہ ہیں۔ اگر یہ معاشرہ عدل اور انصاف پر کھڑا ہے تو قائم رہے، نہیں تو پھر آپ اپنے اسلاف سے پوچھ لیں۔

☆ پورے سندھ میں صرف ایک کاوش اخبار تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار کے قریب چھپتا ہے۔ دوسرے کئی سندھی اخبارات کوئی چالیس ہزار کوئی پچاس ہزار چھپتا ہے۔ بلوچستان والے اپنے کلچر اپنی زبان کو اور شناخت کو Own کرتے ہیں۔ خیبر پختون خواہ میں بھی ایسا ہی ہے۔ سکھر میں اردو اخبار جنگ اور نوائے وقت، بارہ ایک بجے پہنچتے ہیں ایکسپریس چونکہ سکھر سے بھی چھپتا ہے، اس لیے کہیں اڈوں وغیرہ پر نظر آتا ہے لیکن کسی گاؤں یا گوٹھ میں نہیں ملتا اور ایک عام سندھی ہی، سندھی اخبار نہیں پڑھتا بلکہ اسلام آباد یا لاہور میں رہنے والے سندھی کے پاس بھی سندھی اخبار ہی آتا ہے۔ اور یہاں یہ صورتحال ہے کہ ملک اور ملت کا سارا ٹھیکہ ہم نے اُٹھایا ہوا ہے۔ آپ وارث شاہ، بلھے شاہ کے نام پر سڑکیں بھی نہیں رکھتے۔ مولانا شوکت علی روڈ رکھتے ہیں۔ سڑک ہو یا ہسپتال، قائداعظم، علامہ اقبال، فاطمہ جناح کے علاوہ آپ کو کوئی نام ہی نہیں ملتا۔ یہ کیا کنفیوژن ہے؟

○ سبحان اللہ کنفیوژن کیا ہے؟ آپ نے بنیادی بات کی ہے پہلے میں اِسی بات کو اور طریقے سے کرتا ہوں۔ آپ کے ہتھیاروں کے نام بھی بیرونی حملہ آوروں (Invaders) کے نام پر ہیں۔ بے شرمی بے حیائی اور کیا ہے؟

☆ دوسرے صوبے اور دوسرے کلچر والے کہتے ہیں کہ یہ پنجابی ہمارے اُوپر مسلط ہیں اور خود پنجاب کے لوگ اپنے کلچر کو تسلیم (Own) نہیں کرتے؟

○ بالکل ٹھیک، مکمل کنفیوزڈ اور حواس باختہ لوگ ہیں۔ قابل غور ہے کہ ہتھیاروں کے نام رکھنے کیلئے بھی ہمارا اپنا کوئی مقامی نام ہے ہی نہیں؟ آپ ایک اور بات پر غور کریں۔ نظام الدین اولیاء سے لے کر حضرت داتا گنج بخش تک جتنے مزارات ہیں، ملتان تک کوئی مقامی ہے؟ آپ کے جرنیلوں سے لے کر روحانی لیڈر تک کوئی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لوکل ہے؟ بتائیں؟ بڑی درگاہیں انڈیا اور ملتان میں ہیں کوئی لوکل بتائیں؟ میوزیشنز آپ دیکھ لیں۔ امیر خسرو سے تان سین تک اِن کا اور یجن کیا ہے۔ غالب کا اور یجن کیا ہے؟ اور بھی بہت تکلیف دہ باتیں ہیں۔ اگر میں مزید تفصیل میں جاؤں گا تو پھر بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔

☆ 16 جون 2009ء کو دن ٹی وی کی مارننگ ٹرانسمیشن کے ایک لائیو پروگرام (Beyond the Headlines) میں حافظ شفیق الرحمن نے ایک کالر کے سوال کے جواب میں کہا کہ حسن نثار اور عباس اطہر ٹائپ لوگ، بوتل اور بلیک لیبل گروپ ہیں۔ یہ لوگ ٹرپل ایجنٹ اور پلاٹو کریسی ہیں، آپ اِس بات کو کیسے دیکھتے ہیں؟

○ وہ بے چارہ ناکام آدمی ہے۔ وہ سایوں پر ہی بھونکے گا اور کیا کرے گا۔ یہ بے چارے مسخ شدہ لوگ ہیں۔ بہت خوبصورت محاورہ یہ ہے ''کاروان گزر جاتے ہیں کتے بھونکتے رہتے ہیں''۔ اِن کا کیا ہے! یہ عباس اطہر کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ یہ جرثومہ فیچر کی لیڈ ٹائپ آدمی ہے، اِس بے چارے کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے آپ کوئی اور بات کریں۔ اِس کو چھوڑیں۔

☆ ناجی صاحب نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ جماعت اسلامی نے باقاعدہ ایک نظریہ اور اپنے لوگ اخباروں اور میڈیا میں پلانٹ کیے؟

○ بالکل.....

☆ ناجی صاحب کہتے ہیں کہ اب وہ ایک طاقت بن چکے ہیں۔ وہ کسی بندے کو صحیح بات ہی نہیں کرنے دیتے۔ اُنھوں نے یونیورسٹیوں پر قبضے کیے اور پھر طالب علموں سے اخباروں کے دفتروں پر حملے کروائے۔ اُنھوں نے صحیح بات کرنے والے لوگوں کو سائیڈ لائن کر دیا ہے؟

○ میں ناجی صاحب کی پوری بات سے متفق ہوں جو انہوں نے کہا ویسے ہی ہوا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ باقیوں کو سائیڈ لائن کر دیا ہے۔ اِن میں سے کیا کوئی ایک بھی ایسا ہے جو نذیر ناجی کے ٹخنوں تک بھی پہنچتا ہو؟ بتائیں؟ جو چھچھوندریں چھوڑی گئی ہیں اُن کی کیا اوقات ہے؟ ایک زمانے میں لوگ جھوٹ بکواس کرتے تھے کہ میری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بہت ڈاک ہے اور فلاں ہے۔ حالانکہ ادارے کو پتا ہوتا تھا کہ کس کی میل کتنی ہے۔ وہ جنگ کے شفیق مرزا کہا کرتے تھے کہ 'جنگ' والوں کو کہیں تمہیں کھوتی ریڑھی لے کر دیں۔ تمہاری اتنی ڈاک ہوگئی ہے۔ اب تو دنیا ننگی ہوگئی ہے۔ جائیں جا کے یوٹیوب پر جس کا آپ نے نام لیا ہے اِس طرح کے جتنے غلیظ ہیں اِن کی اوقات وہاں دیکھیں۔ تو اِن میں سے کوئی ایک بھی ہے جو ناجی صاحب کے پائے کا ہو۔ یہ لوگ ختم ہوگئے ہیں۔ یہ ساری واردات ہوئی ضرور ہے۔ ناجی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اُنھوں نے باقیوں کیلئے کوئی مسئلہ کھڑا کیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ جو ترقی پسند آگے دیکھنے والے ہیں اُن کے قد اور اِن کے قد دیکھ لیں یہ بوزنے اور بونے ہیں۔

☆ ایم کیو ایم نے آپ کے اعزاز میں تقریب پذیرائی کی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کسی سیاسی جماعت کے ایسے فنکشن کے بعد آپ غیر جانبدار رہ سکتے ہیں؟

○ مجھے ایسی چیزوں سے فرق نہیں پڑتا۔ میں ویسے اُن کو Admire کرتا ہوں۔ یہ بالکل مختلف بات ہے۔ کتنے ادارے، ڈیپارٹمنٹس بُلاتے ہیں۔ یہ زندگی کے رکھ رکھاؤ ہیں، ویسے اُنھوں نے مجھے کون سا نشانِ حیدر دے دیا ہے۔

☆ اسلامی جمعیت طلبہ کی بھی آپ اپنے کالموں میں بہت تعریف کیا کرتے تھے؟

○ کسی زمانے میں تھوڑی دیر کیلئے میرا دھیان قاضی صاحب کے مؤقف کی وجہ سے اُن کی طرف گیا تھا۔ پہلی دفعہ اُنھوں نے اپنے لوگوں میں سُرخ رنگ استعمال کیا، حالانکہ سُرخ اور سبز سے فرق نہیں پڑتا۔ ہوتا یہ ہے کہ جہاں تھوڑی سی امید نظر آتی ہے بندہ وہیں دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ شاید یار..... شاید۔ میں دلیل سے بات کرتا ہوں۔ میں پچھلے دو سالوں میں پانچ دفعہ انگلینڈ گیا ہوں اور صرف ایک دفعہ الطاف بھائی سے ملا ہوں حالانکہ وہ مجھ سے بہت پیار محبت کرتے ہیں اور اُن سب کا یہاں آنا جانا ہے۔ جہاں سے امید نظر آئے وہاں بندہ دیکھتا تو ہے۔ وہ ایم کیو ایم ہو، قاضی صاحب ہوں یا عمران خان۔

☆ آپ نے جیو پر پروگرام ''میرے مطابق'' شروع کیا ہے۔ یہ پروگرام ڈاکٹر شاہد

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مسعود صاحب بھی کرتے رہے ہیں۔ اگر آپ نئے نام اور نئے آئیڈیا کے ساتھ کوئی پروگرام شروع کرتے تو بہتر نہیں تھا؟

○ یہ بات ہوئی تھی۔ جیو کی مینجمنٹ کا یہ کہنا تھا کہ یہ ہمارا برانڈ ہے۔ گولڈ لیف کا ایم ڈی یا چیئرمین اگر چلا جائے تو گولڈ لیف کا نام تبدیل کر دیں گے۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ ''میرے مطابق'' نام جیو کی ملکیت ہے۔ لوگ اہم نہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔

☆ ''اخبارِ جہاں'' میں آپ کا کالم بہت رواں اور آپ کے عمومی مزاج کے برعکس ہلکا پھلکا ہوتا ہے؟

○ اس کی وجہ ہے۔ آپ کو اپنی آڈینس یا ریڈرشپ کی تمیز ہونی چاہئے۔ مولویوں کی محفل میں آپ 'پاپ' تو نہیں پیش کر سکتے وہاں تو محفل سماع ہی ہو سکتی ہے۔ بنیادی طور پر 'اخبارِ جہاں' کی ریڈر ہماری گھریلو خواتین ہیں جن کے لیے آپ کو مختلف انداز میں لکھنا پڑتا ہے۔

○

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اردو اور انگریزی صحافت کے امتیازی پہلو

انگریزی اور اردو مزاج، پس منظر، ہیئت اور اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے مختلف زبانیں ہیں۔ بعینہٖ معاملہ ان زبانوں میں صحافت کا ہے۔

انگریزی صحافت کو پاکستان میں عموماً معروضی حقائق کے مطابق، ٹو دی پوائنٹ، لبرل، سنجیدہ، جچا تلا اور متوازن جب کہ اردو صحافت کو جذباتی، نسبتاً غیر حقیقت پسندانہ، معروضی حقائق سے نابلد، رجعت پسند اور غیر متوازن خیال کیا جاتا ہے۔

اردو قارئین کا حلقہ وسیع ہے مگر چونکہ فیصلہ ساز طبقہ انگریزی پڑھتا ہے اِس لیے کم اشاعت اور محدود قارئین کے باوجود انگریزی صحافت کو زیادہ مؤثر تصوّر کیا جاتا ہے۔

اس حوالے سے وَجاہت مسعود بیان کرتے ہیں:

''پاکستان میں بہت سے ادارے بیک وقت انگریزی اور اردو اخبارات شائع کرتے ہیں۔ مشاہدہ یہ ہے کہ ایک ہی ادارے کے اردو اور انگریزی اخبارات میں نقطۂ نظر اور خبروں کی پیشکش میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ انگریزی اخبار میں حقائق اور غیر جانبدارانہ تجزیے کو خاصی جگہ دی جاتی ہے جبکہ اردو پڑھنے والوں کو جذباتی تاثرات اور متعصب تبصرے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ انگریزی میں لکھنے والا اِسی ادارے کے اردو اخبار میں لکھنا چاہے تو اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ کاروباری نقطۂ نظر سے قطع نظر، اس پالیسی کے دو مقاصد ہیں۔ پہلا تو یہ کہ بیرونی دنیا میں جہاں انگریزی اخبار پڑھے جاسکتے ہیں، مقامی صحافت کی آزادی اور غیر جانبداری کا رنگ جمایا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جائے۔لیکن زیادہ اہم مقصد یہ ہے کہ اردو پڑھنے والے عوام کو سیاسی، معاشی اور سماجی حقائق سے بے خبر رکھا جائے۔انگریزی داں طبقہ اپنی مختصر تعداد اور مراعات یافتہ حیثیت کے باعث سیاسی صورتِ حال بدلنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔مزید برآں یہ طبقہ بہتر تعلیمی معیار کی بنا پر خبر اور پراپیگنڈے میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، چنانچہ اسے کسی قدر متوازن خبریں دینے میں کوئی حرج نہیں۔کہیں کہیں تحقیقی صحافت کے کسی غیر معمولی نمونے کو صحافتی آزادی کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔تاہم چائے خانوں اور بسوں ویگنوں میں اردو اخبار پڑھنے والوں کو فوج، مذہبی سیاست، کشمیر اور جہاد کی بھاری خوراک پلانا ضروری ہے۔"(1)

امتیاز عالم سمجھتے ہیں کہ:

"انگریزی اخبارات پر براہِ راست مغربی جرنلزم کا اثر ہے، جس نے رپورٹنگ میں آزاد، تحقیقی اور مشکل رپوٹنگ کی بنیاد رکھی جب کہ اردو جرنلزم کا مزاج جذباتی تقریر کا سا ہے۔ایک رائے یہ بھی ہے کیونکہ اردو اخبارات عوام میں زیادہ پڑھے جاتے ہیں اس لیے عوام کی پسند کے مطابق اس میں جذباتی نعرے، بھڑکتی اور چلچلاتی سرخیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ عوام جاہل ہیں اس لیے انھیں جاہل ہی رکھا جائے۔دوسری جانب انگریزی جرنلزم میں مقابلہ بہت سخت ہے جب کہ اردو صحافت میں اگر ایک کالم نگار اسٹیبلش ہو گیا تو پھر وہ جو مرضی لکھتا رہے، جس کو جو مرضی بنا دے، جس کو مرضی گرا دے۔اردو صحافت میں بڑے ایڈیٹرز کے جانے سے خلا پیدا ہو گیا اور ایسا اُس وقت ہوا جب ایوب خان نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کو نیشنلائز کیا۔ایوب خان نے ایک روشن خیال اخبار 'امروز' پر پابندی لگا دی تو اس سے ادارتی معیارات کا زوال ہوا، پھر امروز کی کالم نگاری دیکھیں، اس کے مقابلے میں آج کے کالم نگاروں کو تو اردو ہی نہیں آتی۔ دوسری جانب نوائے وقت گروپ نے صحافت میں آئیڈیالوجی زیادہ ڈال دی کہ بس آپ نظریۂ پاکستان کا ہنٹر ہاتھ میں پکڑ لیں اور یہاں فسطائیت کا ماحول پیدا کر دیں۔"(2)

سہیل وڑائچ کا کہنا ہے کہ:

"اردو اور انگریزی اخبارات میں بڑا واضح فرق ہے۔اردو اخبارات کی اکثریت میں زیادہ تر دائیں بازو کے نظریات نمایاں ہیں، جب کہ انگریزی اخبار، جن کی اپروچ زیادہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تر ترقی پسند اور لبرل ہے، کی رسائی عوام تک نہیں ہے۔ یقیناً یہ تاثر بڑی حد تک درست ہے کہ اردو برائے اپوزیشن اور انگریزی برائے حکومت۔ ڈان کے مالکان اسی وجہ سے گورنر شپ اور دوسرے عہدے حاصل کرتے رہے اور انگریزی کے جرنلسٹ مشاہد حسین، ملیحہ لودھی وزارتیں اور بڑی مثالیں ہیں جن کو سیاسی عہدے ملے۔ اردو اخبارات اس لیول تک نہیں پہنچ سکے۔"(3)

اپنے ایک انٹرویو میں انگریزی جرنلزم کا وسیع تجربہ رکھنے والے ایڈیٹر عارف نظامی نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ "انگریزی اور اردو جرنلزم میں بہت فرق ہے اور تقابلی جائزہ لینا بڑا عجیب سا ہے۔ ویسے اردو کے صحافی زیادہ محنتی ہیں لیکن اردو جرنلزم میں انگریزی کی نسبت تنخواہیں ہمیشہ کم رہی ہیں۔ اردو صحافت کا کینوس بہت محدود ہے اور لبرل ازم کا فقدان ہے چنانچہ اردو کا کوئی لبرل اخبار کامیاب نہیں ہو سکا۔ روزنامہ 'آج کل' نے بڑا زور لگایا مگر بیٹھ گیا۔ 'جنگ' تو خیر ایک بڑا ڈیپارٹمنٹل سٹور ہے۔ 'امروز' آخری مکمل اخبار تھا جو کامیابی سے چلا۔ اب اردو اخبارات میں ایک مخصوص ذہنیت چلتی ہے جس کی ایک شکل 'نوائے وقت' ہے، باقی اخباروں میں 'ایکسپریس' کا آج تک پتا نہیں چلا کہ اس کی کوئی پالیسی بھی ہے یا نہیں۔

میر شکیل الرحمان کے دور میں جنگ کی ایک سمت مقرر ہو چکی ہے۔ ان کی خبروں سے جھلک رہا ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص لائن لے رہے ہیں جب کہ میر خلیل الرحمان کے دور میں ایسا نہیں تھا۔ انگریزی جرنلزم کا لبرل ازم مختلف طرح کا ہے۔ اس میں وومن اور ہیومن رائٹس ایشوز پر زیادہ زور ہوتا ہے۔"(4)

حامد میر اس حوالے سے رائے رکھتے ہیں:

انگریزی اخبارات میں opinion کی زیادہ اہمیت ہے، جبکہ اردو اخبار میں news کی۔ اردو والے زیادہ محنت کرتے ہیں، انگریزی والے کم محنت کرتے ہیں اور جب کوئی اردو سے انگریزی اخبار میں جاتا ہے تو طوفان برپا کر دیتا ہے۔ اردو اخبارات عوام کے لیے ہیں، انگریزی اخبارات خواص کے لیے ہیں لیکن آنے والے دور میں انگریزی اخبارات کی اہمیت اور سرکولیشن میں اضافہ ہوگا کیونکہ ہماری نئی نسل انگریزی میڈیم ہے۔"(5)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روایتی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو اخبارات میں مقبولِ عام نقطہ نظر سے ہٹ کر لکھنا مشکل ہے کیونکہ اردو اخبارات کی رسائی عوامی سطح پر بہت دور تک ہے۔ لہذا روایتی موضوعات اور مقبولِ عام نظریات پر مبنی خبر یا تحریر کی اشاعت کو ایک طرف بہت پسند کیا جاتا ہے تو دوسری صورت میں مخالفانہ ردِ عمل بھی اسی تناسب سے شدید ہوسکتا ہے۔ مثلاً مذہبی، سماجی، سیاسی، عسکری اور بین الاقوامی امور پر عموماً عوامی آرا کو مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے لکھا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی صحافی یا کالم نگار ایسا نہیں کرتا تو اسے ہر قسم کے سنگین نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔ ردِ عمل کے طور پر گالم گلوچ، مخالفانہ جلسے جلوس، الزامات، تشدد اور قتل بھی بعید نہیں ہے۔

انگریزی صحافت کے ایک معروف تجزیہ کار سے جب پوچھا گیا کہ فلاں فلاں اردو اخبار میں بھی ان کا کالم چھپتا ہے تو تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ اخبارات کے لیے کام کرنے والا ایک سینڈیکیٹ خود ہی ترجمہ کر کے چھاپ دیتا ہے۔ مذکورہ تجزیہ کار انگریزی میں بھی محتاط انداز میں لکھتے ہیں مگر انھوں نے بتایا کہ اردو میں چھپنا وہ پسند نہیں کرتے چونکہ مختلف طبقات کی طرف سے جذباتی ردِ عمل کا خدشہ رہتا ہے۔ انگریزی میڈیا کی رسائی چونکہ ایک محدود، لبرل اور نسبتاً پس منظر کو سمجھنے والی کمیونٹی سے ہے لہذا وہ انگریزی لکھتے ہوئے زیادہ آزادی محسوس کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کے فلسفے اور خیالات کو سمجھنا، ان کے خطبات:

The reconstruction of religious thought in Islam کو پڑھے بغیر ممکن نہیں کیونکہ شعر ایک کیفیت بیان کرتا ہے جو بدلتی رہتی ہے اور شاعری میں ابلاغ اس طرح ممکن نہیں جس طرح کہ نثر میں۔ کسی دانشور کی نثر کے مطالعہ سے ہی اس کے فلسفے یا پیغام کو سمجھا جاسکتا ہے یا رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ لہذا یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ علامہ نے اپنی مختلف کیفیات کو شاعری میں قلمبند کیا جبکہ اپنے فلسفے اور طرز استدلال کو اپنے خطبات میں بیان کیا جو کہ مشکل ترین انگریزی میں ہیں۔ شاید ان کا خیال ہو کہ غیر روایتی نظریات اور موضوعات کو انگریزی ہی میں بیان کرنا موزوں ہے۔ مخصوص علمی معاملات کی بہتر تفہیم کے لیے ذہنی سطح اور تعلیم و تربیت کا مناسب سطح تک بلند ہونا بھی لازم ہے۔ بعینہٖ یہ مثال انگریزی اور اردو میڈیا پر منطبق کی جاسکتی ہے۔ اس بات کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انگریزی جرنلزم

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نقائص یا خامیوں سے بالکل مبرا ہے یا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ عقل و شعور کا پیمانہ اور معیار ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی درست نہیں کہ اردو میڈیا محض لایعنیت یا پسماندگی کا ترجمان اور عکاس ہے۔ اردو پڑھنے لکھنے والے بھی وسیع النظر، مدلل باشعور ہو سکتے ہیں اور ہیں بھی۔ اسی ضمن میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بالخصوص سماجی اور معاشرتی رویوں کے حوالے سے انگریزی صحافت سے وابستہ خواتین و حضرات کا تجزیہ بعض اوقات مبالغہ آرائی کا عکاس ہوتا۔ اس حوالے سے ''غیرت کے نام پر قتل'' زیادہ واضح مثال ہے۔

صدیوں پرانے معاشرتی ڈھانچے کی اونچ نیچ کو سمجھے بغیر ایسے ایشوز پر خامہ فرسائی حقائق کی پڑتال سے زیادہ جذباتیت کا رنگ لیے ہوتی ہے۔ قبیح اور فرسودہ رسم و رواج نہ ہی ایک دن میں پروان چڑھتے ہیں اور نہ ہی یک دم ان کا خاتمہ ممکن ہوتا ہے۔ بنیادی وجوہات کو سمجھے بغیر کسی موضوع پر طبع آزمائی کرنا بے کار مشق ثابت ہوتی ہے۔ سرِ دست محض عمومی تجزیے کی حد تک تقابلی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ پاکستان کے کچھ بڑے انگریزی اور اردو اخبارات کا تعارف پیش ہے۔

ڈان (Dawn)

خبریت، معروضیت، پرنٹنگ اور پیش کش کے اعتبار سے ''ڈان'' نہ صرف انگریزی بلکہ مجموعی طور پر پاکستانی صحافت میں ایک معیاری، مستند اور معتبر حیثیت کا حامل روزنامہ تصور کیا جاتا ہے۔

جس طرح اردو صحافت میں ''روزنامہ جنگ'' کا کوئی مقابلہ نہیں، اسی طرح انگریزی صحافت میں ''ڈان'' کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ ڈان گروپ کے زیرِ اہتمام انگریزی میگزین ''ہیرالڈ'' (Herald)، سپائڈر (Spider) اور 'اروراٗ (Aurora) شائع ہوتے ہیں۔

ہیرالڈ میگزین کا انگریزی پڑھنے والے قارئین کے لئے وہی درجہ ہے جو اردو قارئین کے لئے ''اخبارِ جہاں'' کا ہے۔ یہ کرنٹ افیئرز پر مبنی رسالہ ہے اور ایک وسیع حلقہِ قارئین رکھتا ہے۔ یہ ماہنامہ 1969ء سے چھپ رہا ہے۔ شیری رحمان بھی اس جریدے کی ایڈیٹر رہ چکی ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سپائیڈر پاکستان میں چھپنے والا اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے جو انٹرنیٹ اور انفرمیشن ٹیکنالوجی کے حوالے سے قارئین کو معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ یہ جریدہ دسمبر 1998ء سے شائع ہو رہا ہے اور ہر ماہ 35000 کے لگ بھگ چھپتا ہے۔

'اورا' جولائی 1998ء سے اشاعت پذیر ہے۔ یہ دوماہی رسالہ ایڈورٹائزنگ، مارکیٹنگ اور میڈیا جیسے ایشوز کا احاطہ کرتا ہے۔

ڈان میڈیا گروپ کے زیر اہتمام ایک انگریزی ریڈیو چینل City FM 89 کے نام سے ملک کے چار بڑے شہروں میں اپنی نشریات 2008ء سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ جبکہ ڈان نیوز کے نام سے ایک ٹی وی چینل بھی جولائی 2007ء سے میدان میں ہے۔ اردو ویب سائٹ کے علاوہ ڈان گروپ کا یہ واحد پراجیکٹ ہے جو مئی 2010ء میں مجبوراً اردو زبان میں منتقل کرنا پڑا۔

dawn.com کے نام سے ڈان گروپ کی بھرپور ویب سائٹ بھی موجود ہے جس پر ادارے کی تمام پبلیکیشنز کی تفصیل اور تعارف کے علاوہ ڈان اخبار بھی پڑھا جا سکتا ہے علاوہ ازیں تازہ ترین خبریں، فیچر اور دیگر مواد انگریزی کے علاوہ اردو میں پڑھنے کی سہولت بھی موجود ہے۔ مواد کے اعتبار سے قارئین کے لیے اس روزنامے میں بہت تنوع ہے۔

ڈان میں شامل کالم ایک مستند حوالہ سمجھے جاتے ہیں۔ مرحوم اردشیر کاؤس جی اور شفقت تنویر مرزا بھی ڈان میں سالہا سال مستقل لکھتے رہے۔ مایہ ناز افسانہ نگار انتظار حسین بھی ہفتہ وار کالم، جبکہ ممتاز مؤرخ اور دانشور ڈاکٹر مبارک علی بھی گاہے بگاہے لکھتے رہتے ہیں۔

ڈان مستقلاً مختلف انٹرنیشنل رسائل و جرائد اور روزناموں جیسے انڈیپنڈنٹ، گارڈین، لاس اینجلس ٹائمز اور دی واشنگٹن پوسٹ میں چھپنے والے مختلف مضامین اور آرٹیکلز کو اپنی اشاعت کا حصہ بناتا رہتا ہے۔ جس سے قاری عالمی تناظر سے آگاہی پا سکتا ہے۔

اخبار ہذا، ہفتہ بھر انواع اقسام اور مختلف دلچسپیوں کے حامل قائین کے لئے ایڈیشن اور میگزین شائع کرتا ہے۔ جبکہ اتوار کے روز ڈان اشتہارات کی منڈی بنا ہوتا ہے۔ بلا مبالغہ اس حوالے سے بھی اس کا کسی دوسرے انگریزی روزنامے سے کوئی مقابلہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام دنوں میں تقریباً 26 صفحات پہ چھپنے والا 'ڈان' اتوار کو دوگنا سے زائد صفحات کا حامل

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوتا ہے۔

ڈان گروپ ہارون اور سہگل فیملی کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اور اس کی تمام پبلیکیشنز، پاکستان ہیرلڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ کے زیرِ اہتمام شائع ہوتی ہیں۔ 2008ء میں ملٹی میڈیا کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد ادارے نے ''ڈان میڈیا گروپ'' کا تجارتی نام اپنا لیا۔ گروپ کے موجودہ سربراہ حمید ہارون ہیں۔

ہارون خاندان کی تحریکِ پاکستان کے حوالے سے بھی بہت خدمات ہیں اور قیامِ پاکستان کے بعد اس خاندان کے اثر رسوخ میں مزید اضافہ ہوا اور مختلف ادوار میں ہارون فیملی کے افراد مختلف اعلیٰ حکومتی عہدوں پر خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔

ہارون خاندان کے، محمود اے ہارون نے 17 سال کی عمر میں قائداعظم کے اے ڈی سی کے طور پر کام کرنے کا اعزاز حاصل کیا اور بعد ازاں وہ سندھ کے گورنر بھی رہے۔ جبکہ اُن کے بھائی یوسف ہارون کو برصغیر کے کم عمر ترین میئر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ وہ آسٹریلیا میں پاکستانی ہائی کمشنر کے طور پر بھی فرائض ادا کرتے رہے۔ یوسف اور محمود ہارون کے والد سر عبداللہ ہارون 1942ء میں وفات پا گئے قبل ازیں وہ اپنا گھر حصولِ پاکستان کے مقصد کی خاطر وقف کر چکے تھے۔ ڈان گروپ کے موجودہ سربراہ حمید ہارون تین مرتبہ اے پی این ایس کے صدر رہ چکے ہیں۔ جبکہ ان کے بڑے بھائی حُسین ہارون پیپلز پارٹی کے گزشتہ دورِ حکومت میں پاکستان کے مستقل مندوب کی حیثیت سے اقوام متحدہ میں متعین رہے۔

انگریزی ہفت روزہ ''ڈان'' مسلم لیگ کے ترجمان کے طور پر قائدِ اعظم محمد علی جناح نے 26 اکتوبر 1941ء کو شروع کیا۔ مگر اُنھیں پوری طرح احساس تھا کہ مسلمانوں کے پاس ایک اعلیٰ درجے کا انگریزی روزنامہ ہونا چاہیے۔ لہٰذا قائدِ اعظم نے اس سلسلے میں منصوبہ بندی شروع کر دی اور اس حوالے سے ابوالحسن اصفہانی سے بھی تبادلۂ خیال اور خط کتابت کرتے رہے۔ حسن اصفہانی کلکتہ سے شام کا انگریزی اخبار ''سٹار آف انڈیا'' شائع کرتے تھے۔ قائداعظم کا خیال تھا کہ ''سٹار آف انڈیا'' کو دہلی سے بطور روزنامہ جاری کر دیا جائے جبکہ اصفہانی اس حق میں نہیں تھے۔ بعد ازاں قائدِ اعظم بھی قائل ہو گئے لہٰذا ہفت روزہ ڈان کو ہی روزنامہ کے طور پر شائع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ قائدِ اعظم کی خواہش پر ''سٹار آف

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انڈیا'' کے مدیر پوتھن جوزف کو روزنامہ ڈان کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ بقول حسن اصفہانی: ''پوتھن جوزف انگریزی میں بہت مہارت رکھتے تھے، انھیں قدیم و جدید بائبل دونوں سے گہری واقفیت تھی اور غیر پادریوں میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو کہ انگریزی زبان میں اس کے برابر واقفیت رکھتے ہوں۔ وہ شامی عیسائی تھے اور مالابار کے رہنے والے تھے۔ شراب کے شوقین تھے اور جب خوب چڑھا لیتے تھے تو شاہکار لکھ ڈالتے تھے، لیکن وہ اس جوش اور جذبے سے لکھتے تھے کہ جیسے کوئی کٹر مسلمان ملّتِ اسلامیہ کے موقف کی تائید و حمایت کر رہا ہو۔'' (قائداعظم میری نظر میں، اصفہانی)

''پوتھن جوزف وہ کمال صحافی تھے جنھوں نے برصغیر کے چار بڑے انگریزی اخبارات 'ہندوستان ٹائمز'، 'انڈین ایکسپریس'، 'ڈان' اور 'دکن ہیرلڈ' کی بطور ایڈیٹر بنیاد رکھی۔ وہ اپنا استعفیٰ ہر وقت جیب میں رکھتے تھے۔ اپنے طویل صحافتی کیریئر میں وہ تقریباً 20 اخبارات کے ایڈیٹر رہے۔ وہ جس بھی اخبار سے منسلک ہوئے اسے کامیابی کی راہ پر ڈالا اور خود کسی اگلے اخبار کو سنبھالنے چل نکلے۔'' (Fettered Freedom by Zamir Niazi, P-116)

ڈان بطور روزنامہ 12 اکتوبر 1942ء کو قائداعظم نے لطیفی پریس دہلی سے شائع کروایا۔ غالباً وہ عید کا روز تھا۔ ڈان کامیابی سے اپنے مقاصد کے حصول کی طرف گامزن تھا۔ مارچ 1945ء میں ''پٹنے کے سر سلطان احمد کی تحریص پر پوتھن جوزف نے 'ڈان' کی ادارت چھوڑ دی''۔ ''کیونکہ مالی فائدے کی خاطر اصول قربان کر دینے میں انھیں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔'' ''سر سلطان وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رُکن تھے اور جن کے سپرد نشر و اشاعت کا قلمدان تھا۔''

قائدِاعظم نے اس صورتِ حال میں حسن اصفہانی کو تار بھیجا اور سٹیٹسمین کلکتہ کے ایڈیٹر آرتھر مور سے ڈان کی ادارت سنبھالنے کے لیے معاملات طے کرنے کا کہا مگر 'آرتھر مور' نے بسیار عمری کے باعث معذرت کر لی تاہم اُنھوں نے الطاف حسین کا نام تجویز کیا۔ حسن اصفہانی نے قائدِ اعظم کو آگاہ کیا کہ ''الطاف حسین انگریزی میں نہایت ماہر ہیں، وہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ اور اس وقت حکومتِ بنگال کی وزارتِ تعلیم میں ایک عہدے پر مامور ہیں اور میں انھیں 1933ء سے جانتا ہوں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

الطاف حسین نے قومی مفاد کے پیشِ نظر اپنی سرکاری نوکری تیاگ کر 1944ء میں ''ڈان'' کی ادارت سنبھال لی۔(1965ء میں ایوب خاں کی کابینہ میں وزیر بننے تک وہ ''ڈان'' کے مدیر رہے) قبل ازیں وہ مختلف انگریزی اخبارات میں فرضی ناموں سے مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے مضامین اور کالم لکھتے رہے تھے۔اُن کی زیرِادارت ''ڈان'' مزید پھلا پھولا گو کہ پہلے ہی شمالی ہندوستان اور ملحقہ علاقوں میں اپنا وسیع حلقہ قارئین بنا چکا تھا۔

تقسیم کے دنوں میں فتنہ پردازوں نے ڈان کے دفتر اور پریس کو نذرِ آتش کر دیا۔ لہٰذا بالکل نئے سرے سے 15 اگست 1947ء کو ''ڈان'' نے کراچی سے اپنی اشاعت شروع کی۔اصفہانی بیان کرتے ہیں کہ ''ڈان'' معمولی اُجرت پر ایک نسبتاً بوسیدہ و فرسودہ مطبع (ہیرلڈ پریس) میں چھپ رہا تھا جس کے مالک ہارون خاندان کے لوگ تھے۔یہ پریس نیپئر روڈ پر واقع تھا۔ڈان کی ویب سائٹ پر دعویٰ کیا گیا ہے یوسف ہارون ''ہیرلڈ'' کے نام سے ہی اپنا انگریزی روزنامہ شروع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر قائدِاعظم کے کہنے پر انھوں نے ''ڈان'' اپنے پریس سے چھاپنا شروع کر دیا۔اس کے تین حصے دار: قائدِاعظم، راجہ صاحب محمود آباد اور اصفہانی برادران تھے۔امریکہ میں پاکستانی مشن کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے روانگی سے ایک روز قبل 31 اگست 1947ء کی رات قائدِاعظم نے اپنے گھر کھانے پر حسن اصفہانی کو کہا کہ ''یقیناً آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ ڈان کو ایک قومی ٹرسٹ کی شکل دے دی جائے، میں خود تو ڈان کو ایک مسلم قومی ٹرسٹ میں تبدیل کر کے بہت خوش ہوں گا۔'' جب اصفہانی نے اثبات میں جواب دیا تو قائدِاعظم نے کہا کہ ''اچھا تو آج سے یہ ایک قومی ٹرسٹ ہے، یہ قوم کے نام ایک تحفہ ہے۔''

'ڈان' کے اس وقت کے پبلشر شمس الحسن اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''1946ء کے اختتام پر جب 'ڈان' اور 'منشور' دونوں مالی استحکام حاصل کر چکے تھے، قائد نے ایک دستاویز کے ذریعے، جسے رجسٹرار کے سامنے 19 نومبر، 1946ء کو مہر کیا گیا، ایک خیراتی ٹرسٹ قائم کر کے دونوں اخباروں کی ملکیت اس کو منتقل کر دی۔اس دستاویز میں قائد نے اعلان کیا کہ ایک لاکھ ستاون ہزار کا چندہ جمع ہوا ہے۔۔۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(’پابند سلاسل‘ از ضمیر نیازی، صفحہ 45)

حسن اصفہانی اپنی کتاب ’’قائداعظم میری نظر میں‘‘ لکھتے ہیں کہ مارچ 1950ء میں مجھے اس خبر نے چونکا دیا کہ ڈان نے اپنی اشاعت ختم کر دی ہے اور اس کی جگہ ہیرلڈ وجود میں آ گیا ہے۔ ’’نام کی تبدیلی کی وجہ 19 مارچ کی اشاعت میں بیان کی گئی تھی۔‘‘

اس صورتحال کو جاننے کے لئے اصفہانی نے محترمہ فاطمہ جناح (جو ڈان کی ٹرسٹی بھی تھیں) کو ایک خط 29 مارچ 1950ء کو لکھا:

’’پاکستان ہیرلڈ لمیٹڈ نے اپنی 19 مارچ 1950ء کی اشاعت میں صفحہ 7 پر بہت جلی حروف میں یہ اعلان کیا ہے کہ: ’’ڈان کراچی کے مالک اور شائع کرنے والے میسرز پاکستان ہیرلڈ..... کی اطلاع کے لیے بذریعہ ہذا اعلان کرتے ہیں کہ.....‘‘

’’اگر آپ ازراہِ عنایت مجھے یہ بتا سکیں کہ ڈان ’’پاکستان ہیرلڈ لمیٹڈ کراچی‘‘ کی ملکیت کیسے بن گیا؟‘‘

اصفہانی کے سوال کا جواب محترمہ فاطمہ جناح کے اُس بیان سے ملتا ہے جو 12 اپریل 1950ء کو ہیرلڈ میں چھپا۔ حسن اصفہانی نے اس بیان کا خلاصہ بھی اپنی کتاب میں شامل کیا ہے اور صورتِ حال کی مزید وضاحت بھی کی ہے:

’’آج صبح مجھے یہ معلوم ہو کر افسوس بھی ہوا اور اطمینان بھی کہ ڈان نکلنا بند ہو گیا ہے۔ افسوس اس بات کا کہ وہ اخبار جس کی بنیاد قائداعظم نے ڈالی تھی اور جس نے مسلمانوں کی خواہشوں اور اُمنگوں کے ایک سچے آئینے اور ان کے حقوق کے ایک بے باک حامی کی حیثیت سے جنگِ آزادی اور معرکۂ پاکستان میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا، نو سال کی زندگی کے بعد ختم ہو گیا اور اطمینان اس خیال سے کہ ڈان کے بند ہو جانے سے یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ یہ اخبار قوم کی ملکیت ہے اور یہ وہم جو بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا، دور ہو گیا کہ ڈان چند افراد کے قبضے میں ہے۔ سندھ چیف کورٹ میں ایک درخواست اس مضمون کی دی گئی کہ چونکہ قائداعظم نے جو تنہا ٹرسٹی تھے، اپنا کوئی جانشین نامزد نہیں کیا، جس کے لیے ٹرسٹ کی دستاویز میں گنجائش رکھی گئی تھی، لہٰذا متولّی مقرر کر دیے جائیں، اس درخواست پر تقریباً سال بھر تک کوئی کاروائی نہ ہو سکی اور کوئی دو ہفتے پہلے فیصلے کا اعلان ہوا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جب میں لاہور میں تھی تو میں نے ڈان میں ایک اعلان اس مضمون کا پڑھا تھا کہ اس وقف کو جو ڈان ٹرسٹ کہلاتا ہے کراچی کے اخبار ڈان میں کوئی حق ملکیت حاصل نہیں ہے، میں اس کی پُرزور الفاظ میں تردید کرتی ہوں، ڈان ہمیشہ اس ٹرسٹ کی ملکیت رہا ہے۔

جس غیر رسمی طریقے اور جذبے سے ڈان کی اشاعت کو معطل کر دیا گیا ہے وہ ان لوگوں کے شایان شان نہیں ہے جو قائداعظم کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہیرلڈ کے شائع کرنے والوں کے لئے باعزت طریقہ یہ تھا کہ وہ ٹرسٹیوں سے جو قائدِ اعظم کے جانشین ہیں بات کرتے اور ڈان ان کے سپرد کر دیتے۔ ان کے موجودہ فعل سے یہ صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ وہ ڈان کو گلا گھونٹ کر اسے نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔

افق پر بادلوں کی سیاہی چھا رہی ہے۔ اب یہ عوام کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کوشش کریں کہ یہ بادل جلد چھٹ جائیں اور ڈان ایک مرتبہ پھر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو جائے، قومی دولت کی عوام سے بڑھ کر اور کوئی حفاظت نہیں کر سکتا۔ ڈان ایک قومی اثاثہ ہے جو انھیں قائداعظم نے عطا کیا تھا اور مجھے پورا اعتماد ہے کہ وہ سب مل کر کھڑے ہو جائیں گے، تاکہ اس ورثے کو اُس انجام سے بچا لیں جو اس کے لئے سوچا گیا ہے۔"

13 اپریل کو الطاف حسین نے اس بیان کا جواب اپنے اداریئے میں دیا، لیکن ان کے جواب میں کوئی جان نہ تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس بیان اور اس کے جواب سے لوگوں میں شور مچ گیا اور جذبات اس حد تک برانگیختہ ہو گئے کہ ڈان کے ایڈیٹر اور اشاعت کنندگان کو ایک پریشان کن اور نازک صورت حال کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 14 اپریل کو ہیرلڈ اسی سرعت سے مر گیا جس سے یہ تین روز پیشتر پیدا ہوا تھا اور اسی دن ڈان کی لاش کو قبر سے نکال کر اسے از سرِ نو زندہ کر دیا گیا، چنانچہ زندہ شدہ ڈان کے پہلے صفحے پر ایک سرخ چوکھٹے کے اندر یہ اعلان بھی بہت نمایاں طور پر چھاپا گیا۔

"ڈان زندہ باد"

لوگ ڈان چاہتے ہیں، میں انھیں ان کا ڈان واپس دیتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ مسرت آج کسی اور کو نہ ہوگی۔ نام کو تبدیل کرنے کے اسباب کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں متعلقہ بااختیار لوگ سوچ کر آپس میں کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس اثناء میں ڈان پھر طلوع ہو گیا۔ خدا کرے کہ یہ لوگوں کے دلوں سے بھی ظلمت کو اسی طرح دور کر دے جس طرح کہ میرے دل سے کی ہے۔

ڈان کبھی مرا نہیں تھا، یہ مرنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ نہیں مرے گا۔" (6)

اس صورتحال کی مزید وضاحت ضمیر نیازی نے اپنی کتاب میں یوں کی ہے۔

"راتوں رات 'ڈان' کا نام پاکستان ہیرلڈ میں تبدیل کر دیا گیا۔ مس فاطمہ جناح اور ہارون خاندان کے درمیان 'ڈان' کی ملکیت کے تنازعہ کے باعث ایک بپھرے ہوئے ہجوم نے جنوبی ٹیپر روڈ (موجودہ الطاف حسین روڈ) پر واقع ڈان کے پرانے دفاتر کے سامنے پُرزور احتجاج کیا۔ جبکہ ہاکرز نے اس نئے نام والے اخبار کو تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔ شام کو ایک احتجاجی میٹنگ کراچی میں منعقد ہوئی جہاں اخبار کے بائیکاٹ کی قرارداد بھی منظور کی گئی۔ خوش قسمتی سے اگلے دن اخبار 'ڈان' کے نام سے ہی چھاپا گیا۔"

(The Press Under Siege by Zamir Niazi P-17)

مرزا ابوالحسن اصفہانی تو یہی سمجھتے رہے کہ "ڈان ایک قومی روزنامہ تھا اور اب بھی ہے جسے اس کے تین حصے داروں نے قوم کے نام ہبہ کر دیا ہے۔ اور تمام اخلاقی حقوق کی رو سے وہ قوم کی ملکیت ہے نہ کہ کسی فرد یا کمپنی کی۔" مگر "ڈان" سے "ہیرلڈ" اور "ڈان" کی آنکھ مچولی میں ہارون خاندان نے "ڈان" پر کمال صفائی سے ہاتھ صاف کر لیے۔ ہارون خاندان نے ایسا کیا تو کیوں؟ "ڈان" جیسے اعلیٰ پائے کے اخبار میں اس حوالے سے بھی ایک سٹوری چھپنی چاہیے تاکہ حقائق عوام تک پہنچ سکیں اور ایک صحت مند بحث کا آغاز ہو سکے۔

قصہ 'پاکستان ٹائمز' کا

اپنے عہد کے معیاری اور اعلیٰ پائے کے انگریزی روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اگر اپنی انگریزی بہتر کرنی ہے تو یہ اخبار پڑھیں۔ 'پاکستان ٹائمز' کے تذکرے کے بغیر پاکستانی صحافت کی تاریخ نامکمل تصور کی جائیگی۔ اپنی پرنٹنگ، معیاری خبروں، تجزیوں اور بہترین لے آؤٹ کی بنا پر یہ ایک منفرد اخبار تھا۔ مگر یہ روزنامہ اُفتادِ زمانہ کا ایسا شکار ہوا کہ آخر منظر سے ہی غائب ہو گیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پاکستان ٹائمز ابھی تک چھپ رہا ہے۔ اگر یہ اخبار شائع ہو رہا ہے تو کہیں نظر کیوں نہیں آتا؟ یہ ایک تکلیف دہ سوال ہے۔

پاکستان ٹائمز کی کہانی بھی کچھ پاکستان جیسی ہے۔ 1946ء سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ کے حلقوں میں یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ پنجاب میں جماعت کی نمائندگی کے لیے ایک نمایاں اخبار کی شدید ضرورت ہے۔ لہٰذا مئی 1946ء ہی میں مسلم لیگی سپورٹرز کا ایک گروپ اکٹھا ہوا اور ایک پرائیویٹ کمپنی کے طور پر پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (PPL) کی بنیاد رکھی۔ اس کمپنی کے سات ڈائریکٹر تھے: نواب افتخار حسین ممدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات خاں، رفیع بٹ، ایس اے لطیف، سید امیر حسین شاہ اور میاں افتخار الدین۔

اکتوبر 1946ء میں بڑا شیئر ہولڈر ہونے کی وجہ سے میاں افتخار الدین کو کمپنی کا ایم ڈی منتخب کر لیا گیا بعد ازاں جب مسلم لیگ نے پنجاب میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو 28، 29 جنوری 1947ء کو مسلم لیگی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا تو پی پی ایل نے ''دی پاکستان ٹائمز'' کے نام سے روزانہ انگریزی میں ایک شمارہ شائع کرنا شروع کر دیا جس کا لوگوں کی طرف سے بہت اچھا رسپانس سامنے آیا۔ لہٰذا 4 فروری 1947ء کو پاکستان ٹائمز باقاعدہ روزنامے کی صورت میں 8 صفحات کے ساتھ چھپنا شروع ہو گیا۔ پیشانی پر بانی (Founder) کے طور پر قائدِ اعظم کا نام لکھا ہوا تھا۔ پرنٹ لائن میں افتخار الدین کا نام پبلشر اور پرنٹر جبکہ قائم مقام ایڈیٹر کے طور پر فیض احمد فیض کا نام چھپا ہوا تھا۔ قبل ازیں افتخار الدین نے پی پی ایل کے ایڈوائزر کے طور پر بریگیڈئر ڈیسمنڈ ینگ کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔

فیض احمد فیض نے اپنے ایڈیٹر بننے کی روداد یوں بیان کی:

''افتخار الدین نے مجھے کہا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے، فوج کو چھوڑو اور لاہور آ جاؤ۔ میں پاکستان ٹائمز نکال رہا ہوں اُس کے ایڈیٹر بن جاؤ لیکن میں نے کہا مجھے ایڈیٹر شپ کا کوئی تجربہ نہیں لہٰذا کسی تجربہ کار آدمی کو ایڈیٹر بنائیں۔ میں بطور اسسٹنٹ کام کروں گا اور آہستہ آہستہ سیکھ جاؤں گا۔ میں نے چند نام تجویز کیے جن میں کرنل مجید ملک اور بریگیڈئر ڈیسمنڈ ینگ تھے۔ کرنل مجید لاہور سے ''آؤٹ لُک'' کے نام سے انگریزی اخبار نکالتے رہے تھے۔ جبکہ بریگیڈئر ڈیسمنڈ ینگ فوج میں تعلقات عام کے افسر اور معروف لکھاری تھے۔ وہ بھی فوج

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چھوڑنا چاہتے تھے لہٰذا ہم دونوں دہلی سے اکٹھے لاہور آئے۔ اُنھوں نے 2، 3 ہفتے میرے ساتھ کام کیا اور پھر قرار دیا کہ ''یہ سب جانتا ہے اور آزادانہ کام کر سکتا ہے۔'' پہلے پہل میں نروس تھا لیکن ہفتہ، دس دن بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔''

اس طرح چیف ایڈیٹر فیض احمد فیض اور ایڈیٹر مظہر علی خاں کی توجہ اور محنت سے بہت جلد پاکستان ٹائمز نے ایک معتبر انگریزی روزنامے کی حیثیت اختیار کر لی۔

1948ء میں پی پی ایل ہی کے زیرِ اہتمام اردو روزنامہ اِمروز بھی جاری کیا گیا جو سالہا سال قارئین میں اپنی انفرادیت کے باعث مقبول رہا۔ امروز کے پہلے ایڈیٹر چراغ حسن حسرت تھے۔ بعد ازاں 1953ء سے 1959ء تک احمد ندیم قاسمی اس اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ 1957ء میں ہفت روزہ ''لیل و نہار'' بھی اِسی ادارے نے شروع کیا۔ ''لیل و نہار'' کے ایڈیٹر سبطِ حسن تھے۔

ملک میں پہلے (ایوبی) مارشل لاء کے نفاذ کے چند مہینوں بعد ہی 18 اپریل 1959ء کو پاکستان سیکورٹی ایکٹ کے تحت پی پی ایل کے زیرِ اہتمام پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار کو حکومتی قبضے میں لے لیا گیا۔ جس کے ساتھ ہی پاکستان میں معیاری صحافت کا ایک اور باب بند ہو گیا۔ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خاں، امروز کے احمد ندیم قاسمی اور لیل و نہار کے سبطِ حسن کسی بھی صورت فوجی حکومت کے زیرِ سایہ کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے، لہٰذا ان سب نے اِستعفیٰ دے دیا۔ قبضہ گیری کے اِس ''کارِ خیر'' میں ایوبی مارشل لاء کے کل پرزوں نے حصہ لیا۔ جن میں وزیرِ داخلہ، جنرل کے ایم شیخ، ایوب خاں کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب، وزارتِ اطلاعات کے انچارج بریگیڈیئر ایف آر خاں اور ایوبی کابینہ کے وزیر ذوالفقار علی بھٹو بھی نمایاں تھے۔ اگلے روز پی پی ایل کے اخبارات، پاکستان ٹائمز اور امروز شائع ہوئے تو اُن میں قدرت اللہ شہاب کا تحریر کردہ ایڈیٹوریل نیا ورق (New Leaf) کے عنوان سے چھپا جس میں اُنھوں نے پی پی ایل کے اخبارات پر کئی گھناؤنے الزامات عائد کیے جنھیں کبھی ثابت نہ کیا جا سکا۔ موصوف نے لکھا کہ ''مذکورہ ادارے کے اخبارات سرحدوں کے باہر سے نظریاتی رہنمائی لیتے تھے اور تقسیم کے بعد میاں افتخار الدین پاکستانی سیاست میں اور ان کے اخبارات، اخباری دنیا میں اجنبی دکھائی دیتے تھے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قدرت اللہ شہاب نے اپنی خودنوشت ''شہاب نامہ'' میں اس حوالے سے سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے اپنی مجبوری کا تذکرہ کر کے صفائی بھی پیش کی ہے مگر یہ بات پورا سچ نہیں لگتی۔ کیونکہ سرکاری قبضے کے بعد شہاب کے دستِ راست محمد سرفراز کو پی پی ایل کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا تھا۔ مزید برآں جنرل کے ایم شیخ اور ذوالفقار علی بھٹو، مظہر علی خاں کو پاکستان ٹائمز اور قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی کو امروز کی ادارت سنبھالے رکھنے کے لیے مناتے رہے۔

پی پی ایل پر قبضے کا پس منظر سینئر صحافی آئی اے رحمن یوں بیان کرتے ہیں:

''1954ء میں مشرقی پاکستان میں طویل تاخیر کے بعد انتخابات ہوئے تو ان میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد کامیاب ہو گئے۔ بعد میں جب پاکستان سیٹو میں داخل ہو گیا تو وہاں یہ مسئلہ اُٹھا کہ پاکستان امریکہ کمیونسٹ مخالف مہم میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ وہاں یہ کہا گیا کہ پاکستان کا کمیونسٹ مخالف کردار اس وقت تک مشکوک رہے گا جب تک یہاں ''امروز'' اور ''پاکستان ٹائمز'' جیسے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ان دونوں اخبارات پر شب خون مارنے کے لیے پریس ٹرسٹ بنایا گیا۔ ایوب خاں کے دورِ حکومت میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ذرائع ابلاغ پر سرکاری کنٹرول مضبوط بنایا گیا۔ ایوبی مارشل لاء کے بعد پی پی ایل کو ٹیک اوور کیا گیا۔ 1960ء میں اے پی پی پر قبضہ کیا گیا۔ اور اسی سال پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس آیا۔ یہ سارے کام ہماری خارجہ پالیسی جس کا بنیادی محرک غلام بننے کی خواہش کے نتیجے میں ہوئے۔''

پی پی ایل پر قبضے کے چند روز بعد میاں افتخار الدین، اُن کے بیٹے اور ایک دوسرے شیئر ہولڈر سید امیر حُسین شاہ کو نوٹس ملے کہ حکومت سمجھتی ہے کہ اُنھوں نے پی پی ایل کے شیئرز غیر ملکی امداد سے خریدے ہیں۔ لہٰذا اُن کے شیئرز ضبط کر لیے جائیں گے۔ سید امیر حسین شاہ المعروف ''کاکو شاہ'' ٹریبونل کے سامنے پیش ہوئے اور اُن کے شیئرز بحال کر دیے گئے مگر میاں افتخار الدین اور اُن کے بیٹے کو نہ ٹریبونل کے سامنے صفائی کا موقع دیا گیا اور نہ ہی شیئرز بحال کیے گئے۔ جب اُن کے وکیل میاں محمود علی قصوری نے شنوائی کے لیے سپریم کورٹ سے رجوع کیا تو حکومت نے مارشل لاء ضابطے کے تحت معاملے کو عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر قرار دے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دیا۔ مارشل لاء حکومت نے سالہا سال پی پی ایل کے معاملات کی چھان بین کی مگر انھیں کچھ نہ ملا لیکن افتخار الدین کی وفات تک انھیں حیلے بہانوں سے تنگ کیا جاتا رہا۔ میاں افتخار الدین کا تعلق لاہور کے ایک متمول گھرانے سے تھا۔ وہ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے۔ 1936ء میں اُنھوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور 1937ء میں پنجاب اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ 1945ء تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ انھیں پنڈت جواہر لال نہرو کے بہت قریب سمجھا جاتا تھا۔ وہ مسلم اکثریتی علاقوں کو حقِ رائے دہی دینے کے حامی تھے اور اُن کا خیال تھا کہ مسلم لیگ سے بات چیت کے ذریعے معاملات کا حل نکالا جائے مگر نہرو اور پٹیل کے مخاصمانہ رویے کے خلاف اُنھوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی اور 30 ستمبر 1945ء کو مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1946ء میں وہ دوبارہ پنجاب اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ بعدازاں خضر حیات کی یونینسٹ حکومت کے خلاف پنجاب میں سول نافرمانی کی تحریک میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ مسلم لیگ پنجاب کے پہلے صدر تھے۔ 18 ستمبر 1947ء کو وہ پنجاب کابینہ میں وزیر برائے بحالی مہاجرین بن گئے مگر حکومت سے کچھ اختلافات کی بنا پر وہ صرف دو ماہ بعد ہی وزارت سے علیحدہ ہو گئے۔ 1951ء میں اُنھیں پنجاب اسمبلی میں قابلِ اعتراض تقاریر کرنے کے الزام میں مسلم لیگ سے برطرف کر دیا گیا۔ بعدازاں اُنھوں نے پاکستان آزاد پارٹی کے نام سے اپنی جماعت بنائی جو بائیں بازو کے نظریات کی حامل تھی۔

میاں افتخار الدین پی پی ایل کے اخبارات کی پالیسی پر اثر انداز نہ ہونے کی پالیسی پر کاربند تھے۔ وہ ہر سال اپنے گھر ایک شاندار دعوت کا اہتمام کرتے جس میں ادارے کے ایڈیٹر سے لے کر چوکیدار تک تمام کارکن مدعو ہوتے۔ علاوہ ازیں مری میں ان کی رہائش گاہ پر پی پی ایل کا عملہ گرمیوں کی چھٹیاں گزار سکتا تھا۔ ایوبی مارشل لاء کا شکار ہونے کے بعد وہ صرف 54 سال کی عمر میں مسلسل اذیتوں کا سامنا کرتے ہوئے ہارٹ اٹیک سے انتقال کر گئے۔

حکومتی پھونپو بننے کے بعد پی پی ایل کے اخبارات کی حالت پتلی اور معیار بہت پست ہو گیا۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ یہ ادارہ کسی پرائیویٹ پارٹی کے ہاتھ بیچ دیا جائے لہٰذا اسے کراچی کے ایک گجراتی کروڑ پتی صنعت کار اور تاجر سیٹھ داؤد المعروف مٹھو سیٹھ کے ہاتھوں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

64 لاکھ کے عوض نیلامی چڑھا دیا گیا۔ مگر جلد ہی سیٹھ صاحب کا میڈیا ٹائیکون بننے کا شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ رو پیٹ کر انھوں نے پی پی ایل کو "مزید" بیچنے کے لئے صدر ایوب کو راضی کیا اور ایک نیم خواندہ سیاست دان چودھری محمد حسین کو نئے خریدار کے طور پر گھر لائے۔ چودھری صاحب ممبر اسمبلی اور لاہور کے میئر تھے۔ آج بھی موصوف کی حواس باختگیاں اور لطیفے لوگوں کو یاد ہیں۔ اخبار چلانے کا بکھیڑا چودھری محمد حسین کے بس سے باہر تھا۔ لہٰذا جلد ہی وہ اس "کارِ خیر" سے اُکتا گئے۔ 1962ء میں پی پی ایل چودھری ظہور الٰہی کے ہاتھوں ایک بار پھر بک گیا۔ مگر گورنر پنجاب نواب آف کالا باغ کے ساتھ اختلافات کی بنا پر تنگ آ کر چودھری ظہور الٰہی نے اس ٹائی ٹینک سے جان چھڑانے میں ہی عافیت جانی۔

ان حالات کے پیشِ نظر ایوبی مارشل لاء کے "دماغ" قدرت اللہ شہاب کی ایک پرانی تجویز پر 1964ء میں "نیشنل پریس ٹرسٹ" تشکیل پایا۔ لہٰذا پی پی ایل کے تمام اخبارات اس ادارے کے زیرِ اہتمام چلے گئے۔ مسٹر جی فاروق اس کے پہلے چیئرمین مقرر ہوئے۔ بعد ازاں "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کے علاوہ "مارننگ نیوز" اور "مشرق" بھی این پی ٹی کے دائرہ کار میں آ گئے۔

1991ء تک چار و ناچار "امروز" زندہ رہا جبکہ "پاکستان ٹائمز" کی کشتی بھی پاکستان ہی کی طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ 88-1987ء میں ورکرز کی طرف سے ایک تحریک بھی چلی اور این پی ٹی کے کارپردازوں سے کہا گیا کہ آپ آئے روز نت نئے بہانے کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے پاس عملہ زیادہ ہے اور ذرائع کم لہٰذا یہ ادارہ آپ کارکنوں کو دے دیں۔ ہم خود ادارے کو چلا لیں گے۔

غالباً 1995ء میں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (PPL) اور مشرق پرائیویٹ لمیٹڈ (MPL) کی نیلامی کا اشتہار دیا گیا۔ اس وقت مجوزہ پیکج میں PPL اور MPL کے اخبارات کی مشینری، دفاتر، جائیدادیں اور ڈیکلریشن وغیرہ سب کچھ شامل تھا۔ 1995ء ہی میں سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک سنیٹر یوسف شاہین نے کسی طرح نیلامی میں پاکستان ٹائمز لے لیا۔ یہ صاحب پہلے ہی اپنا اخباری گروپ چلا رہے تھے۔ سنیٹر صاحب نے وزیرِ اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو سے درخواست کی کہ Bid-money کی ادائیگی مؤخر کر دیں۔ پرائیوٹائزیشن کمیشن

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے چیئرمین سید نوید قمر نے اعتراض بھی کیا لیکن وزیر اعظم نے مذکورہ ادائیگی مؤخر کر دی۔ سینیٹر یوسف شاہین ادائیگی کے لیے توسیع در توسیع مانگتے رہے اور محترمہ خصوصی اختیارات کے تحت توسیع دیتی رہیں۔ بالآخر وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے یہ کہہ کر مزید وقت دینے سے انکار کر دیا کہ قانون میں پہلے ہی گنجائش نہیں تھی، لہٰذا مزید رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نتیجتاً پرائیوٹائزیشن کا سارا عمل منسوخ کر دیا گیا اور پانچ چھ ماہ بعد 1996ء میں PPL اور MPL کی نجکاری کا عمل دوبارہ شروع ہوا چنانچہ اخبارات میں پاکستان ٹائمز کے نیلام عام کا اشتہار ''پہلے آیئے، پہلے پایئے'' کی بنیاد پر تھا۔ نجکاری کمیشن کی طرف سے دیگر شرائط کے ساتھ یہ شقیں بھی شامل تھیں۔

(1) خریدار کو اخبار نکالنے کا تجربہ ہو۔

(2) درخواست گزار کی مالی حالت مستحکم ہو اور وہ ڈیفالٹر نہ ہو۔

تقریباً 9، 10 خریداروں کے نام سامنے آئے جن میں ''فرنٹیئر پوسٹ'' کے رحمت شاہ آفریدی، ''روزنامہ پاکستان'' کے اکبر علی بھٹی، ڈان گروپ کے سید ممتاز شاہ اور میاں سیف الرحمان بھی شامل تھے۔ سید ممتاز شاہ نے بعد ازاں بلوچستان کے ایک سیاستدان سردار فتح محمد حسنی کے توسط سے ''روزنامہ مشرق'' قابو کر لیا۔ جبکہ ''پہلے آیئے، پہلے پایئے'' کی بنیاد پر نجکاری کمیشن کو سب سے پہلے موصول ہونے والی درخواست میاں سیف الرحمن کی تھی۔

میاں سیف الرحمن ''دی نیوز'' لاہور میں انویسٹی گیشن ٹیم کے سربراہ اور چیف رپورٹر کے طور پر خدمات انجام دے چکے تھے۔ ''روزنامہ جنگ'' لاہور میں وہ فارن ڈیسک کے انچارج اور 1987ء میں پاکستان ٹائمز میں بطور سب ایڈیٹر بھی کام کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ 1987ء میں ہی جب پی پی ایل کے کارکنوں کی طرف سے ادارے کا کنٹرول حاصل کرنے کی بات چلی تھی تو میاں سیف الرحمن اس تحریک کے نمایاں لوگوں میں سے ایک تھے۔

1994ء کے اواخر میں میاں سیف الرحمن کے خاندان نے اپنی آبائی جائیداد میاں نواز شریف کی والدہ محترمہ شمیم بیگم کے ہاتھوں لگ بھگ ایک کروڑ میں فروخت کی۔

میاں سیف الرحمن نے 40 ہزار سے زائد ویلتھ ٹیکس جمع کروایا تاکہ اُن کی آمدنی کا ریکارڈ رہے۔ دیگر اخراجات کے بعد مسلم کمرشل بنک رائے ونڈ برانچ میں اُن کے اکاؤنٹ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں تقریباً 85 لاکھ روپیہ جمع تھا۔

جب پی پی ایل کے نیلام عام کا اشتہار آیا تو اُنھوں نے یونائیٹڈ نیوز نیٹ ورک (UNN) کے نام سے کمپنی رجسٹرڈ کروائی اور نیلامی میں کود پڑے غالباً اُن کے ذہن میں یہ تھا کہ اپنے ساتھ مزید سرمایہ دار بھی شامل کرلوں گا۔ مزید برآں اُن کے چند تعلق داروں نے بھی سرمایہ کاری میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ اُدھر نیلامی کے معاملات آگے بڑھ رہے تھے۔ اِدھر اُن کے حالات کا دھارا یوں موڑ کھا رہا تھا کہ بڑی سرمایہ کاری کا عندیہ دینے والے قطر میں مقیم دوست نے معاملہ بولی تک پہنچنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ وہ سرمایہ کہیں اور لگا چکا ہے۔ پی پی ایل کے خریداروں کی فہرست میں پہلا نام میاں سیف الرحمن کا تھا لیکن اسی دوران اُن کے بہن بھائیوں نے فروخت شدہ جائیداد کی رقم سے اپنا اپنا حصہ بھی لے لیا تو اُن کے اکاؤنٹ میں موجود رقم کم ہو کر 50 لاکھ کے قریب رہ گئی۔ چنانچہ اندریں حالات گومگو کی کیفیت اور منصوبے کی تکمیل کے حوالے سے خدشات کا پیدا ہونا لازم تھا اور غالب سوچ ناکامی کی تھی۔

لیکن اس مرحلے پر ''جنگ گروپ'' نے انٹری ڈالی اور اُن کے ایک اعلیٰ عہدیدار شاہین قریشی جو میاں سیف الرحمن کے بھی تعلق دار تھے، میر شکیل الرحمن کے ایلچی بن کر آئے اور اُن کے سامنے ''ڈیلی بزنس ریکارڈر'' میں چھپی اُن 9 لوگوں کی لسٹ رکھی جو ''پاکستان ٹائمز'' کی خریداری کے لیے اہل قرار پا چکے تھے۔ سب سے اوپر والا نام میاں سیف الرحمن کا تھا، جس کے گرد میر شکیل الرحمن نے اپنی مخصوص عادت کے مطابق دائرہ لگایا ہوا تھا۔

شاہین قریشی نے میر شکیل کی طرف سے بات چیت آگے بڑھائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ''دِن گروپ'' کے چیف ایگزیکٹو محمود صادق بھی اپنے ایک نمائندے طاہر مجید کے توسط سے میاں سیف سے رابطے میں تھے اور پاکستان ٹائمز کے معاملات میں دلچسپی لے رہے تھے۔ لیکن شاہین قریشی نے دوستانہ تعلقات استعمال کرتے ہوئے میاں سیف الرحمن کو جنگ گروپ سے معاملات طے کرنے پر راضی کرلیا۔ بعدازاں اس معاملے پر شاہین قریشی، میاں سیف اور میر شکیل کے درمیان ملاقات ہوئی تو میر شکیل نے میاں سیف کو آفر کی کہ آپ میرے اسسٹنٹ کے طور پر کام کریں جس پر اُنھوں نے جواب دیا کہ میری خواہش عہدے کی نہیں، بلکہ اپنے شعبے میں پیشہ ورانہ ترقی پانے کی ہے۔ مجھے پاکستان ٹائمز ملنے کی صورت میں اس کا ایڈیٹر بنایا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جائے یا جنگ گروپ میں ہی ترقی دی جائے۔ میر شکیل الرحمن نے کہا کہ مجھے منظور ہے لیکن میں معاہدہ نہیں کروں گا۔ یوں فریقین کے درمیان زبانی طور پر معاہدہ طے پا گیا۔

یہ امر طے شدہ سمجھا جا رہا تھا کہ پاکستان ٹائمز جس پارٹی کو بھی ملے گا وہ اس کے نام کی لاج رکھے گی اور اسے دھوم دھام سے شائع کیا جائے گا۔ کیونکہ پاکستان ٹائمز بین الاقوامی شناخت کا حامل اخبار تھا۔ غالباً میاں سیف الرحمن نے بھی اسی سوچ کے تحت جنگ گروپ سے معاملات طے کیے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ میں اپنے پچاس لاکھ تو خرچنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہا۔ اور جنگ جیسا بڑا گروپ ''پاکستان ٹائمز'' کو دوبارہ شائع کرنا شروع کر دے گا تو میری چیف ایڈیٹر بننے کی پیشہ ورانہ خواہش پیسے خرچے بغیر پوری ہو رہی ہے تو مجھے اپنے خاندان کا سارا پیسہ ڈبونے کی کیا ضرورت ہے۔ بالآخر جب معاملہ نیلامی تک پہنچا تو خریداری کے لیے نجکاری کمیشن میں ''روزنامہ پاکستان'' کے ایڈیٹر اکبر علی بھٹی کی نمائندگی حامد میر اور قدرت اللہ چودھری کر رہے تھے۔ حامد میر اُس زمانے میں ''پاکستان'' اسلام آباد کے ایڈیٹر تھے۔ بولی کے عین درمیان حامد میر نے پرائیویٹائزیشن کمیشن کے ایک جائنٹ سیکرٹری ساجد حسن کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی تو میاں سیف الرحمن کو شک گزرا، اُنھوں نے جائنٹ سیکرٹری سے پوچھا کہ ''حامد میر میرے حوالے سے کچھ مقدمات کا ذکر تو نہیں کر رہے تھے؟'' اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ ''میاں سیف تو بیوروکریٹ (CSP) رہ چکا ہے اور اس پر مقدمہ بھی قائم ہوا تھا۔'' جواباً میاں سیف الرحمن نے کہا کہ میں نہ صرف مذکورہ مقدمے میں باعزت بری ہو چکا ہوں بلکہ میں نے حکومتِ پاکستان اور ایف آئی اے کے ڈی جی پر 10 کروڑ سے زائد کا دعویٰ بھی دائر کر رکھا ہے۔ اور امکان ہے کہ میں یہ مقدمہ بھی جیت لوں گا۔

میاں سیف نے عدالتی فیصلے کی تصدیقی کاپیاں بھی متعلقہ افسر کو دکھائیں۔ دراصل حامد میر نے میاں سیف کو ٹیکنیکل ناک آؤٹ کرنے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام ہوئے لیکن نیلامی کے اس مرحلے پر میاں سیف الرحمن نے نجکاری کمیشن کے چیئرمین نوید قمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میری نمائندگی میری کمپنی کے ڈائریکٹر شاہین قریشی کریں گے۔ بظاہر شاہین قریشی نمائندگی تو میاں سیف کی کر رہے تھے مگر وہ ہدایات میر شکیل الرحمن سے لے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رہے تھے۔ میاں سیف الرحمن کو ان رابطوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا چونکہ معاملات پہلے سے ہی میاں اور میر کے درمیان طے شدہ تھے۔

پی پی ایل کی بولی 1 کروڑ سے 4 کروڑ 70 لاکھ پر آئی تو اکبر علی بھٹی نے پوچھا کہ اس نیلامی میں ''پاکستان ٹائمز'' کے ڈیکلریشن اور پرنٹنگ مشنری کے علاوہ کیا پی پی ایل کے اثاثہ جات یعنی عمارت وغیرہ بھی شامل ہیں؟ تو سید نوید قمر نے کہا کہ یہ چیزیں نیلامی میں شامل نہیں۔ اس دوران شاہین قریشی 4 کروڑ 61 لاکھ کی بولی لگا چکے تھے۔ اکبر علی بھٹی نے کہا کہ اگر اثاثہ جات نیلامی میں شامل نہیں تو پھر پی پی ایل ان کو دے دیں۔

یوں یہ بولی میاں سیف الرحمن کے حق میں ہوگئی۔ بولی کے بعد نیشنل اور انٹرنیشنل میڈیا کے نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے میاں سیف الرحمن اور شاہین قریشی نے اخبار کے حوالے سے تمام تر خدشات کو رد کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان ٹائمز'' کو زور و شور سے چلایا جائے گا۔ ''پاکستان ٹائمز'' کی ملکیت حاصل کرنے والی کمپنی (UNN) کے چیف ایگزیکٹو میاں سیف الرحمن جبکہ شاہین قریشی اور مرزا الیاس بیگ ڈائریکٹر تھے۔ مرزا الیاس بیگ آج کل جنگ گروپ کے ڈائریکٹر فنانس ہیں۔ یو این این کمپنی کے ڈائریکٹرز نے طے شدہ امور کے مطابق رسمی طور پر ایک قرارداد پاس کی اور سارے شیئرز بیگم محمودہ خلیل (والدہ میر شکیل)، میر شکیل الرحمن اور جاوید الرحمن کو منتقل کر دیے لہٰذا جنگ فیملی کے مذکورہ افراد یو این این کمپنی کے مالک بن گئے۔

جنگ گروپ کو حوالگی کے بعد ''پاکستان ٹائمز'' پہلے پہل مارکیٹ میں بھی آیا مگر بعد ازاں یہ سلسلہ بھی موقوف کر دیا گیا۔ البتہ اخبار کی پرنٹ لائن میں سیف الرحمن کا نام بطور ریزیڈنٹ ایڈیٹر چھپتا رہا۔ دنیا کی بہترین پرنٹنگ مشنری میں سے ایک ''پاکستان ٹائمز'' کی تھی جو ڈیکلریشن کے ساتھ ہی جنگ گروپ کو ملی، جو یہ ادارہ استعمال کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی پاکستان ٹائمز کے دفاتر سے بہت سا ساز و سامان جنگ گروپ کے ہاتھ لگا۔ علاوہ ازیں پاکستان ٹائمز ہی کی بدولت ادارہ جنگ کو APNS میں دو ووٹ بھی حاصل ہو گئے۔ جنگ گروپ پچھلے کئی سالوں سے رسمی طور پر ''پاکستان ٹائمز'' چھاپ رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ڈمی اخبار شائع کیا جا رہا ہے۔ جنگ لاہور کے سامنے جس عمارت میں روزنامہ ''آواز''،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''انقلاب'' اور ''جیوٹی وی'' کے دفاتر ہیں، اُسی عمارت میں ''پاکستان ٹائمز'' کا قیمتی ریکارڈ اور نایاب تصاویر کا خزانہ رُلتا رہا، بوریوں میں بند تاریخ کو نہ جانے اب کس کباڑ خانے کی نذر کر دیا گیا ہے۔ بقول حسین نقی ''''پاکستان ٹائمز'' کے ریفرنس سیکشن جیسے قومی اثاثے کو ضائع کرنے کے جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ بھی میر شکیل الرحمن کو معاف نہیں کرے گا''۔

صحافتی حلقے یہ خیال کرتے ہیں کہ ''جنگ گروپ'' کے انگریزی روزنامے ''دی نیوز'' کو کسی ممکنہ چیلنج سے بچانے کے لیے میر شکیل الرحمن نے ''پاکستان ٹائمز'' کو مار دیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس میت کے وارث بھی وہی ہیں۔

دی نیوز انٹرنیشنل (The News International)

جنگ گروپ کے زیرِ اہتمام، روزنامہ 'دی نیوز' 11 فروری 1991ء کو بیک وقت لاہور، کراچی، اسلام آباد اور راولپنڈی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ ڈان کے بعد دوسرا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا انگریزی روزنامہ ہے۔ خبریت، معروضیت، پرنٹنگ اور پیشکش کے اعتبار سے بھی اس کا نمبر ڈان کے بعد ہی آتا ہے۔ ویسے تو جنگ اور دی نیوز دونوں کے حوالے سے ادارے کا دعویٰ ہے کہ ''پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے روزنامے ہیں مگر یہ بات محض 'دعویٰ برائے دعویٰ' ہی ہے۔ ممکن ہے جب یہ دعویٰ کیا گیا ہو تو یہی حقیقت ہو لیکن حقیقی صورتِ حال کے بدلنے کے باوجود ادارے نے دعویٰ بدلنے کا تردّد نہیں کیا۔

لاہور میں دی نیوز کے پہلے ایڈیٹر حسین نقی تھے۔ ابتدائی طور پر انوسٹی گیٹو، جنرل اور فالواپ رپورٹنگ ٹیمیں تشکیل دی گئیں جو بعد ازاں تحلیل ہو گئیں۔ دی نیوز جس زمانے میں چھپنا شروع ہوا اس وقت، ڈان، پاکستان ٹائمز، فرنٹیئر پوسٹ اور دی نیشن مارکیٹ میں تھے اور اخباری حلقوں میں یہ خدشات تھے کہ انگریزی اخبارات کی مختصر مارکیٹ میں 'دی نیوز' شاید اپنی جگہ نہ بنا سکے مگر اس نئے اخبار نے یہ تمام خدشات رد کر دیے اور بہت جلد نہ صرف اپنی جگہ بنالی بلکہ وقت کے ساتھ اُس میں مزید اضافہ بھی کیا۔

اخبار ہفتہ بھر میگزین، سپلیمنٹ، سپیشل ایڈیشن اور دلچسپی کے دیگر امور پر مواد شائع کرتا رہتا ہے۔ دی نیوز ویب سائٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے مگر پرنٹ ایڈیشن صرف کراچی کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہی سائٹ پر موجود ہوتا ہے۔ اخبار کی ویب سائٹ میں بہتری کی بہت گنجائش ہے۔ اخبار کا ایک انٹرنیشنل ایڈیشن لندن سے بھی شائع ہوتا ہے جبکہ ادارہ نیویارک سے بھی ایسا ہی ایڈیشن چھاپنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

دی نیوز کا انوسٹی گیشن سیل بہت فعال ہے، جو گروپ کے تمام اخبارات کو خبریں مہیا کرتا ہے۔ اس سیل کے ایڈیٹر انصار عباسی ہیں۔

دی نیشن (The Nation)

''ڈان'' اور ''دی نیوز'' کے بعد ''نیشن'' سب سے زیادہ پڑھا جانے والا انگریزی روزنامہ ہے۔ لاہور، کراچی اور اسلام آباد سے چھپنے والا یہ روزنامہ، نوائے وقت گروپ کے زیر اہتمام 1986ء سے اشاعت پذیر ہے۔

نیشن کے بانی ایڈیٹر عارف نظامی تھے۔ اپنے چچا اور نوائے وقت گروپ کے چیئرمین مجید نظامی سے اختلافات کے بعد انھوں نے نیشن کی ایڈیٹر شپ چھوڑ دی یا انہیں علیحدہ کر دیا گیا۔ 7 ستمبر 2009ء کو شیریں مزاری کو اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ مگر وہ صرف ایک سال ہی اس عہدے پر براجمان رہیں، جن کے بعد سلیم بخاری اس کے ایڈیٹر بنے۔ اخبار کے چیف ایڈیٹر اور گروپ چیئرمین مرحوم مجید نظامی تھے۔ جنھیں 2012ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے صحافتی خدمات کے عوض پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری دی گئی جس کے بعد اِدارے نے اپنے اخبارات اور جرائد میں اُن کو ڈاکٹر مجید نظامی لکھنا شروع کر دیا۔ غالباً دنیا میں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری کے بعد نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے کی پہلی مثال ہوگی۔ اخبار کی ایم ڈی رمیزہ نظامی ہیں۔

پرنٹنگ کے اعتبار سے اخبار ہذا کو معیاری نہیں کہا جا سکتا۔ اتوار کی اشاعت میں سنڈے پلس کے نام سے چھوٹے سائز کے ساٹھ سے زائد صفحات پر مشتمل میگزین بھی ہوتا ہے، جس میں تقریباً 40 سے زائد صفحات پر اشتہارات شائع ہوتے ہیں۔ گو کہ اس ادارے کے اخبارات میں بھارتی ایکٹرز کی تصویریں چھاپنا ممنوع ہے مگر اشتہارات میں ان کی تصاویر بکثرت دکھائی دیتی ہیں۔ مزید برآں دوسرے اخبارات کی طرح ماڈرن اور لبرل

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

طبقات کی پارٹیوں کی تصویریں کئی صفحات پر اسی میگزین میں شائع کی جاتی ہیں۔ اخبار ویب سائٹ پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

ڈیلی ٹائمز (Daily Times)

19 اپریل 2002ء میں انگریزی روزنامے نے کراچی، لاہور اور اسلام آباد سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ اپنے گیٹ اپ، میک اپ، خبریت اور تنوع کے اعتبار سے یہ اخبار انگریزی جرنلزم میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا محسوس ہوا اور جلد ہی مارکیٹ میں اس روزنامے نے اپنی جگہ بنالی لیکن جہاں سابق گورنر سلمان تاثیر کے قتل سے اُن کے کاروباری گروپ کو دھچکا لگا وہاں اُن کی 'میڈیا ٹائمز لمیٹڈ' کے زیر اہتمام ''ڈیلی ٹائمز'' اور روزنامہ ''آجکل'' پر برے اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں تک کہ ''آجکل'' تو بالکل بند ہی ہوگیا۔ ادارے سے نکالے جانے والے کارکنوں نے اپنے حقوق کے حوالے سے احتجاج بھی کیا مگر بے سود۔ حالانکہ 'آجکل' بھی روزنامہ ''وقت'' کے بعد اُردو جرنلزم میں ایک اچھا اضافہ تھا اور یہ اخبار چل بھی نکلا تھا۔ مگر پھر حالات نے پلٹا کھایا اور اب یہ اخبار ویب سائٹ پر تو پڑھا جاسکتا ہے لیکن مارکیٹ میں موجود نہیں ہاں البتہ ڈمی ضرور چھپتا ہے۔

راشد رحمن سے پہلے نجم سیٹھی بھی طویل عرصہ اس اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ یہ اخبار لبرل اور سیکولر خیالات کے ترجمان کے طور پر جانا جاتا ہے۔ نمایاں لکھنے والوں میں، عشرت سلیم، فریحہ ظفر، نعیم طاہر، ڈاکٹر حیدر شاہ، شمیم مسیح، ڈاکٹر قیصر رشید، مہر تارڑ، لال خاں، شریف الدین پیرزادہ اور ڈاکٹر اشتیاق احمد شامل ہیں۔

پاکستان ٹوڈے (Pakistan Today)

انگریزی کا یہ روزنامہ عارف نظامی کی زیرِ صدارت ''نوا'' (NAWA) میڈیا کارپوریشن کے زیرِ اہتمام 18 اکتوبر 2010ء کو لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ بعد ازاں یہ اخبار کراچی اور اسلام آباد سے بھی چھپنا شروع ہوگیا۔ پاکستان ٹوڈے کے دعوے کے مطابق یہ پاکستان کا پہلا انگریزی روزنامہ ہے جو Berliner فارمیٹ میں شائع ہوتا ہے جبکہ عام اخبار

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

Broadsheet فارمیٹ میں چھپتے ہیں۔ اخبار کی پالیسی ماڈریٹ اور لبرل ہے۔ نمایاں لکھنے والوں میں ہمایوں گوہر، ملک محمد اشرف، آئمہ کھوسہ، سعد رسول، عندلیب عباس، رؤف حسن، نادیہ خواجہ، کلدیپ نیئر، ایم جے اکبر، ڈاکٹر حسن عسکری رضوی اور عارف نظامی شامل ہیں۔ جبکہ غیر ملکی پریس سے بھی تحریریں شامل کی جاتیں ہیں۔ اخبار ویب سائٹ پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

پاکستان ٹوڈے کے حوالے سے اخبار فروش یونین کے صدر چودھری نذیر نے دلچسپ تبصرہ کیا کہ ''یہ اخبار فیل نہیں ہوا بلکہ 33 نمبر لے کر پاس ہوگیا ہے۔''

دی ایکسپریس ٹریبیون (The Express Tribune)

یہ اخبار 12 اپریل 2010 سے لیکسن گروپ (Lakson Group) کی ایک کمپنی ''سنچری پبلیکیشنز'' کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہے۔

یہ پاکستان کا پہلا انگریزی روزنامہ ہے جو نیویارک ٹائمز کے گلوبل ایڈیشن، ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون'' سے منسلک ہے لہٰذا پاکستانی قائین ہفتے کے 6 دن ایکسپریس ٹریبیون کے ساتھ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون کے ایشیاء ایڈیشن کی کاپی بھی پڑھ سکتے ہیں جو انھیں اخبار کے ساتھ ہی ملتی ہے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اخبار عام دنوں میں بھی دوسرے انگریزی اخبارات سے زائد صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایکسپریس ٹریبیون اپنے لے آؤٹ، میک اپ، خبریت اور پیش کش کے اعتبار سے انگریزی اخبارات میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوا ہے۔ اخبار ہذا پاکستان میں لبرل اور سیکولر اقدار کا نمائندہ ہونے کا دعویدار ہے۔ ہفتہ بھر اخبار، شوبز، ثقافتی سرگرمیوں، اکانومی، کرنٹ افیئرز، سیاست اور دیگر موضوعات پر ایڈیشن چھاپتا ہے جبکہ اتوار کو میگزین بھی اخبار کا حصہ ہوتا ہے جس میں تصاویر اور اشتہار تحریری مواد سے کہیں زیادہ جگہ پاتے ہیں۔

اس روزنامے نے بڑی تعداد میں لکھنے والوں کو منسلک کر رکھا ہے۔ جس میں نہ صرف غیر ملکی کالم نگار بلکہ بیرونِ ملک تعلیمی اداروں سے وابستہ اہلِ قلم پاکستان بھی شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں عبداللہ حسین ہارون، عباس راشد، صالحہ رؤف، ماہین اے راشدی، کامران شفیع، شاہد جاوید برکی، ایم ضیاالدین، نسیم زہرہ، بینا شاہ، ائر وائس مارشل شہزاد چودھری،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رضا رومی، ڈاکٹر طارق رحمن، ڈاکٹر عائشہ صدیقہ، اعجاز حیدر، ڈاکٹر اکمل حسین، اور کلدیپ نیّر شامل ہیں۔

اخبار لاہور، کراچی، اسلام آباد اور پشاور سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے پبلشر سلطان لاکھانی کے بیٹے بلال لاکھانی ہیں۔ ''ایکسپریس ٹریبیون'' کو انٹرنیٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اخبار کی ویب سائٹ بہت بہتر ہے۔

بزنس ریکارڈر (Business Recorder)

کاروباری حلقوں کا مقبول اخبار ''بزنس ریکارڈر'' 17 فروری 1965ء میں پہلی دفعہ شائع ہوا۔ ایم اے زبیری اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ انھیں پاکستان میں اکنامک اور فنانشل صحافت کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ وہ CPNE کے بانی ممبر ہونے کی علاوہ تنظیم کے صدر بھی رہے۔ 1945ء میں قائداعظم کے روزنامہ ڈان دہلی سے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز کرنے کے بیس سال بعد ''بزنس ریکارڈر'' کے نام سے مسلم دنیا کا پہلا بزنس روزنامہ شروع کیا۔ حکومتِ پاکستان نے اُن کی خدمات کے اعتراف میں انھیں ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا۔ زبیری گروپ کے زیرِ اہتمام ہی آج ٹی وی اور میوزک چینل پلے (Play) بھی نشریات جاری رکھے ہوئے ہیں۔

روزنامہ بزنس ریکارڈر کے کاغذ اور پرنٹنگ کو معیاری نہیں کہا جا سکتا۔ اخبار ویب سائٹ پر پڑھا جا سکتا ہے۔

پاکستان آبزرور (Pakistan Observer)

انگریزی کا یہ روزنامہ یکم نومبر 1988ء سے ''حرمت گروپ آف پبلیکیشنز'' کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ زاہد ملک اس اخبار کے مالک اور چیف ایڈیٹر ہیں۔ 1950ء میں جن طلبہ نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے جرنلزم کی پہلی کلاس میں داخلہ لیا تھا زاہد ملک اُن میں سے ایک تھے۔ 1962ء میں ایم اے کرتے ہی وہ وزارتِ اطلاعات میں انفرمیشن آفیسر بھرتی ہو گئے۔ 1977ء میں سرکاری نوکری چھوڑنے کے بعد وہ چند ماہ روزنامہ نوائے وقت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پنڈی کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر رہے۔ لیکن بعد ازاں اپنا ہفت روز ''حرمت'' جاری کیا جو ایک وقت تک خاصا مقبول رہا۔ 1966ء میں انھوں نے اُردو روزنامہ ''الاخبار'' شائع کرنا شروع کیا۔ یہ روزنامہ بھی کافی مقبول ہوا مگر مالی مشکلات کے سبب ایک سال بعد ہی بزرگ صحافی اور اشتہاری کمپنی ''میڈاس'' کے کرتا دھرتا غلام اکبر کو بیچ دیا گیا۔

کہنے کو تو پاکستان آبزرور، کراچی، لاہور اور اسلام آباد سے شائع ہوتا ہے۔ لیکن یہ زیادہ اسلام آباد، راولپنڈی میں ہی پڑھا جاتا ہے۔ خبریت، پیش کش، پرنٹنگ اور کاغذ کے اعتبار سے یہ درمیانے درجے کا اخبار ہے۔

زاہد ملک کے تین بچے بھی پاکستان آبزرور سے منسلک ہیں۔ معروف صحافی سلیم بخاری اس حوالے سے کہتے ہیں کہ ''زاہد ملک سے ایک خامی نکال دیں تو وہ بہت اچھے اخباری مالک ہو سکتے ہیں اور وہ خامی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی پوری فیملی کو دفتر میں Involve کیا ہوا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ اور اُن کے بیٹے اپنے رنگ میں بہت بڑے ایڈیٹر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اخبار اتنا مضبوط نہیں ہو سکا۔ اگر یہ کام وہ پروفیشنل لوگوں پر چھوڑ دیتے تو جتنے وسائل اُن کے پاس ہیں، یہ بھی بہت بڑا اخبار ہوتا۔'' (رازداں صحافی از مظفر محمد علی۔ صفحہ 242)

زاہد ملک کا بڑا بیٹا فیصل پاکستان آبزرور کا ایڈیٹر جبکہ گوہر ایڈمنسٹریٹر اور بیٹی سعدیہ ملک اخبار کے سنڈے میگزین کی ایڈیٹر ہیں۔ چونکہ وہ نوائے وقت کے پرانے ''متاثرین'' میں شامل ہیں لہٰذا اسلام آباد میں اُنھوں نے بھی ایک نظریہ پاکستان کونسل بنا رکھی ہے، جس کے نہ صرف وہ چیئرمین ہیں بلکہ اسی ادارے کے زیر اہتمام نکلنے والے جریدے ماہنامہ ''نظریہ'' کے بھی مدیر اعلیٰ ہیں۔

بقول زاہد ملک وہ صدر ایوب خاں کے سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر سے بہت متاثر ہیں (اُنھوں نے اپنے ایک بیٹے کا نام بھی گوہر رکھا) غالباً اسی وجہ سے اُن کا صحافتی مزاج بھی سرکاری طرز کا ہی رہا ہے۔ وہ پاکستان کی روایتی صحافت کے علم بردار ہیں۔ خاص طور پر وہ پاکستان اسٹیبلشمنٹ کے سُروں میں سُر ملانے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ویسے تو انھیں پاکستان کی ''نظریاتی اساس'' کی مضبوطی کا فکر ہر لمحہ دامن گیر رہتا ہے البتہ ایک با اثر شخصیت ہونے کے باوجود اُنھوں نے کبھی اپنے آبائی علاقے یا گاؤں کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کوئی کردار ادا کرنا گوارا نہیں کیا۔ بلکہ اُن کے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کی زرخیز زمینیں نوے کی دہائی میں سرکار نے چھین کر ایکسپورٹ پروسیسنگ زون بنا دیا۔ (جو کہ ابھی تک پوری طرح آباد نہیں ہوا) مگر زاہد ملک صاحب نے اُس معاملے کو کبھی درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ البتہ نیشنل سنٹر کی ڈائریکٹری کے دوران اُنھوں نے اپنے علاقے کے بہت سے لوگوں کو نیشنل سنٹر میں بھرتی کروا کر دعائیں سمیٹیں۔

نیوز ویک پاکستان (News Week Pakistan)

ویکلی ''نیوز ویک'' امریکہ کے قدیم ترین جرائد میں سے ایک ہے۔ یہ 17 فروری 1933ء سے لیکر دسمبر 2012ء تک شائع ہوتا رہا۔ مگر جنوری 2013ء سے اس کی اشاعت بند کر دی گئی اور اب یہ صرف ویب سائٹ پر پڑھا جا سکتا ہے۔ نیوز ویک بیک وقت دنیا کی کئی زبانوں میں شائع ہوتا ہے اور اس کا شمار دنیا کے موثر ترین جرائد میں کیا جاتا رہا ہے۔

نیوز ویک پاکستان (Newsweek/Daily Beast Company) سے معاہدے کے بعد 31 اگست 2010ء سے پاکستان میں Associated Group کے زیرِ اہتمام اشاعت پذیر ہے۔ پرنٹنگ، کاغذ اور لے آؤٹ اور ڈیزائن کے اعتبار سے اس کا معیار وہی ہے مگر مواد کے حوالے سے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ پاکستان سے اشاعت کے بعد یہ ایک مقامی جریدہ بن کر رہ گیا ہے۔ کیونکہ دیگر بین الاقوامی رسائل کی طرح نیوز ویک انٹرنیشنل یا اس کا ایشیاء پیسفک ایڈیشن پڑھ کر دنیا بھر کی سوچ اور اپروچ جاننے کا موقع ملتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ نیوز ویک پاکستان کے پبلشر اقبال زیڈ احمد ہیں جنھیں ایل پی جی کنگ بھی کہا جاتا ہے۔ جبکہ ایڈیٹر اُن کے بیٹے فتح احمد ہیں۔

فصیح احمد وال سٹریٹ جنرل اور نیوز ویک کے لیے بطور رپورٹر بھی کام کرتے رہے ہیں۔ قبل ازیں وہ دی نیوز لاہور اور جیو کا حصہ بھی رہے۔ نیوز ویک پاکستان کے کنسلٹنٹ ایڈیٹر خالد احمد جبکہ ایڈورٹائزری بورڈ میں شوکت فرید، ڈاکٹر پرویز حسن، ڈاکٹر عائشہ جلال، ڈیوڈ والٹرز سابق گورنر اوکلوہامہ (امریکہ) شامل ہیں۔

نیوز ویک پاکستان کا اپنا ایڈیٹوریل سٹاف بھی موجود ہے اور نیوز ویک انٹرنیشنل کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مواد بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

رسالے کے سٹاف میں سابق گورنر سلمان تاثیر کی بیٹی شہر بانو تاثیر بھی شامل ہیں۔

نیوز ویک کو حکومتی دباؤ سے آزاد رہنے کی خاطر سرکاری اشتہار نہیں لیتا۔ اے جی گروپ برازیل کی ایک پبلشنگ کمپنی کے ساتھ مل کر لاطینی امریکہ، افریقہ، مڈل ایسٹ اور یورپ کے 55 ملکوں میں فروری 2013ء سے نیوز ویک شائع کر رہا ہے۔

اے جی گروپ بہت جلد پاکستان کا بڑا میڈیا گروپ بننے کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔

گروپ ہذا کے آئندہ منصوبوں میں ''جنون ایف ایم'' اور ''دیس ٹی وی'' بھی شامل ہیں۔

جنون ایف ایم ایبٹ آباد، جام شورو، کراچی اور مری میں سٹیشن لگا رہا ہے۔ ایک معاہدے کے تحت جنون ایف ایم، بی بی سی کا نشریاتی مواد بھی استعمال کر سکے گا۔

''دیس ٹی وی'' سی این این کے تعاون سے اردو زبان میں شروع کیا جائے گا اور دیس کی نیوز ٹیم کی ٹریننگ بھی سی این این کی ٹیم ہی کرے گی جبکہ دیس ٹی وی سی این این کا نشریاتی مواد بھی استعمال کرے گا۔

فرائیڈے ٹائمز (Friday Times)

یہ انگریزی ہفت روزہ کے معروف صحافی نجم سیٹھی اور جگنو محسن کی ملکیت ہے۔ میاں چیف ایڈیٹر اور بیگم پبلشر ہیں۔ فرائیڈے ٹائمز مئی 1989ء سے شائع ہو رہا ہے۔ پالیسی کے اعتبار سے یہ جریدہ لبرل اور سیکولر اقدار کا حامل ہے۔ مذہبی حلقے مبینہ طور پر اس سے نالاں اور شاکی رہتے ہیں کہ رسالے میں مذہبی اقدار کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔

فرائیڈے ٹائمز معیاری کاغذ، پرنٹنگ، موضوعات میں تنوع اور جامعیت کی بنا پر نسبتاً زیادہ قیمت ہونے کے باوجود انگریزی پڑھنے والے طبقے کا مقبول نیوز میگزین ہے۔

مستقل مقبول سلسلوں میں "Howzzat im the dim", Diary of a social Butterfly, اور Nuggets from urdu press، سچ گپ اور اتفاق نامہ شامل ہیں۔

Nuggets from Urdu Press کے عنوان سے اردو پریس سے مختلف لکھاریوں کے اقتباسات کا ترجمہ اور اسکے مفہوم کے مدِ نظر کارٹون چھاپے جاتے ہیں۔ اس سلسلے کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شروع میں درج ہوتا ہے کہ یہ اقتباسات بلاتبصرہ شامل کئے جارہے ہیں۔ مگر تحریر کے مفہوم پر مبنی کارٹون بذات خود ایک تبصرہ ہی ہوتا ہے۔

اتفاق نامہ میں میاں نواز شریف، "Howzzat im the dim" میں عمران خاں جبکہ Diary of a Social Butterfly میں نو دولتیا آنٹی کی فرضی گفتگو اور طرز تکلم کو شائع کیا جاتا ہے۔ سیاسی و معاشرتی طنز و مزاح پر مبنی یہ تحریر کافی پُرلطف ہوتی ہے۔

فرائیڈے ٹائمز کا مواد انٹرنیٹ پر بھی پڑھا جاسکتا ہے لیکن پورا جریدہ ویب سائٹ پر نہیں ہوتا اور نہ ہی گزشتہ شمارے کے پڑھنے کی سہولت موجود ہے غالباً ان تکلفات کے لیے ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔

جنگ نامہ

مقبولیت کے اعتبار سے ''روزنامہ جنگ'' سالہا سال سے پہلے درجے پر متمکن ہے۔ اردو کے تمام اخبارات جنگ سے مقابلے کی جنگ کے لیے کمربستہ رہتے ہیں مگر جنگ کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں۔ تمام اخبار پڑھنے کے باوصف جب تک ''جنگ'' نظر سے نہ گزرے بالعموم تسلی نہیں ہوتی اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید آج اخبار پڑھا ہی نہیں۔

''جنگ'' لے آؤٹ، میک اپ، پرنٹنگ، خبریت اور پیش کش (Presentation) کے اعتبار سے اپنے معیار میں اضافے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا ہے اور نیا تجربہ کرنے سے نہیں جھجکتا۔ اردو اخبارات میں اسے سب سے زیادہ اشتہار ملتے ہیں۔ بلکہ کئی قارئین تو صرف اس لیے اخبار نہیں لیتے کہ اس میں اشتہارات کی بہتات ہوتی ہے۔ عمومی طور پر اتوار کے دن اخبار کے 30 کے لگ بھگ اور سنڈے میگزین کے تقریباً 18 صفحات مکمل اشتہارات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں جنگ اخبار کا سنڈے/ جمعہ میگزین مواد کے اعتبار سے بہت عمدہ ہوتا تھا۔ جس میں یادگار انٹرویوز، فیچرز اور دیگر کئی مقبول سلسلے شامل اشاعت ہوتے تھے، مگر جب سے میگزین کا زیادہ حصہ کراچی سے تیار ہونا شروع ہوا ہے میگزین کا بزنس تو بڑھ گیا ہوگا لیکن معیار یقیناً گر چکا ہے۔

جنگ گروپ (Independent Media Corporation) بلا مبالغہ پاکستان کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سب سے بڑا میڈیا گروپ ہے جس کے زیرِ اہتمام روزنامہ جنگ، لاہور، کراچی، ملتان، راولپنڈی اور کوئٹہ سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ ڈیلی نیوز کراچی (انگریزی) روزنامہ انقلاب لاہور اور کراچی سے ''عوام'' شام کے اخبار ہیں۔

دی نیوز کراچی، لاہور، پنڈی/اسلام آباد سے بیک وقت شائع ہوتا ہے، جبکہ ''جنگ'' اور ''دی نیوز'' کے انٹرنیشنل ایڈیشن روزانہ لندن سے بھی شائع ہوتے ہیں۔ ''ویکلی میگ'' جبکہ اُردو کا مقبول ترین اور پاکستان میں سب سے زیادہ چھپنے والا ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' بھی یہی ادارہ شائع کرتا ہے۔ جیو ٹی وی نیٹ ورک بھی اسی گروپ کی ملکیت ہے۔

روزنامہ ''وقت'' لاہور اور ماضی میں پاکستان کا معتبر ترین انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' بھی بطور ڈمی یہی ادارہ چھاپتا ہے۔

اخبارِ جہاں کے مقبول ترین سلسلوں میں: تین عورتیں تین کہانیاں، یہ ہفتہ کیسا گزرے گا، بزمِ اطفال، کٹ پیس، نفسیاتی مسائل، قسمت کا حال شامل ہیں۔ پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں اور دنیا کے بڑے ملکوں سے نمائندگان کی رپورٹس اور تصویریں بھی میگزین کا حصہ ہوتی ہیں۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں اخبارِ جہاں سے زیادہ معلوماتی اور جامع اردو میگزین اور کوئی نہیں۔

ایک زمانے میں نئے شادی شدہ جوڑوں کی ملک بھر سے بھیجی تصویریں بھی اخبارِ جہاں کا حصہ ہوتی تھیں مگر اب صرف کراچی میں منعقدہ کسی بڑے یا معروف خاندان کی کسی شادی کی تصاویر شامل ہوتی ہیں۔ شاید یہ بزنس کے نکتۂ نظر سے ایسا کیا جارہا ہو لیکن اگر پرانا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ اس طرح عام قارئین میگزین سے زیادہ اپنائیت محسوس کریں گے۔

جنگ گروپ کے مختلف رسائل وجرائد اور اخبارات کے شروع ہونے کی تفصیل کچھ یوں ہے:

1)	روزنامہ جنگ راولپنڈی		1959
2)	ڈیلی نیوز کراچی (شام کا انگریزی اخبار)	اکتوبر	1962

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

3)	اخبارِ جہاں	1 جنوری	1967
4)	روزنامہ جنگ لندن	15 مارچ	1971
5)	روزنامہ جنگ کوئٹہ	31 مارچ	1972
6)	ویکلی میگ (انگریزی میگزین)	8 مارچ	1980
7)	روزنامہ جنگ لاہور	1 اکتوبر	1980
8)	دی نیوز (انگریزی روزنامہ)	11 فروری	1991
9)	روزنامہ عوام کراچی (شام کا اخبار)	27 اکتوبر	1994
10)	روزنامہ آواز لاہور	اکتوبر	1998

جنگ گروپ کے بارے میں بجا طور پر سینئر صحافی عارف نظامی نے کہا ہے کہ ''یہ ایک بڑا ڈیپارٹمینٹل سٹور ہے''(1)۔ اِس ادارے نے ہمیشہ کچھ نیا کرنے کی کوشش کی ہے اور ایسی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اخباری فورم سے لے کر کمپیوٹر کمپوزنگ تک بلاشبہ جنگ گروپ کو رُجحان ساز کہا جا سکتا ہے۔ ایک زمانے میں کہا جاتا تھا کہ اس اخبار کی کوئی پالیسی نہیں لیکن عارف نظامی کا خیال ہے کہ ''میر شکیل الرحمن کے دور میں ان کی ایک سمت مقرر ہو چکی ہے۔ ان کی خبروں سے جھلک رہا ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص لائن لے رہے ہیں۔ انھوں نے ایک واضح موقف پر سٹینڈ کر لیا ہے جبکہ میر خلیل الرحمن صاحب کے دور میں ایسا نہیں تھا۔ کسی زمانے میں یہ طُرّہ امتیاز صرف نوائے وقت کا تھا مگر اب ایسا نہیں رہا۔ ((2

جنگ اخبار کا پس منظر یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے تناظر میں غالباً 1939ء میں ایک سرکاری اخبار ''جنگ'' کے نام سے جاری کیا گیا۔ اس پرچے میں عالمی جنگ کے حوالے سے تازہ خبریں اور مضامین شائع ہوتے تھے تاکہ پراپیگنڈہ سے رائے عامہ اپنے حق میں ہموار کی جا سکے یقیناً اس پرچے میں جنگ تناظر میں انگریز حکومت کا موقف بیان کیا جاتا ہوگا۔

یہ نصف لاکھ سے زائد چھپتا تھا اور لوگوں میں مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ ملک یوسف العزیز اس کے ایڈیٹر تھے۔ بعد ازاں غالباً 1940ء میں میر خلیل الرحمن نے دہلی سے اسی نام کا اخبار نکال لیا۔((3

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قبل ازیں 1939ء میں میر خلیل الرحمن دہلی سے نکلنے والے فلمی پرچے ''نگار خانہ'' میں شامل صحافتی تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ اس فلمی رسالے کے ایڈیٹر داد اعشرت علی تھے۔((4

میر خلیل الرحمن نے بہت مشکل حالات میں ''جنگ'' اخبار شائع کرنا شروع کیا تھا۔ وہ دفتر کی صفائی سے لے کر اخبار کی تقسیم تک تمام امور خود ہی انجام دیتے تھے۔ اُن کی بے انتہا محنت کی بدولت 1941ء تک اخبار کی اشاعت 3 ہزار تک پہنچ گئی۔ ابتدا میں یہ شام کا اخبار تھا اور صرف 2 اوراق پر مشتمل ہوتا تھا۔ مگر دہلی کے ناموافق حالات کی بنا پر انھیں کراچی آنا پڑا۔ یہاں آ کر بھی حالات چنداں بہتر نہیں تھے لیکن اپنے پختہ عزائم کو ہتھیار بناتے ہوئے وزیر آباد آ کر اپنے سُسر سے 5 ہزار روپے قرض لیے اور 14۔15 اکتوبر 1947ء سے ''جنگ'' شام کے اخبار کے طور پر کراچی سے چھاپنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میر خلیل الرحمن نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنے ادارے کو خالصتاً پیشہ ورانہ بنیادوں پر استوار کیا اور 1992ء تک وہ اپنی زندگی میں ہی جنگ گروپ کو ایک [illegible]ر کی شکل دے چکے تھے۔ اپنے اخبار سے اُن کی اہمیت اور وابستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ ''جنگ'' کو اپنا تیسرا بیٹا کہتے تھے۔

میر خلیل الرحمن کی زندگی میں ہی اُن کے دوسرے بیٹے میر شکیل الرحمن نے باپ کا کاروبار بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی اپنے ادارے کو آگے بڑھانے میں بہت دلچسپی اور سرگرمی سے مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ جنگ گروپ سے وابستہ رہنے والے لوگ بیان کرتے ہیں کہ میر شکیل الرحمان ادارے کی تمام جزیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وقت اور جگہ کی قید سے بے نیاز اپنے ادارے کے مختلف عہدیداروں سے مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔ اگر کسی معاملے کی طرف وہ دھیان نہیں دیتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس سے آگاہ نہیں۔ انھیں پتہ چل جائے کہ فلاں بندہ ادارے کے لیے بہتر ہو سکتا ہے تو اس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے وہ خود چل کر متعلقہ فرد کے گھر تک بھی جانے میں تردُّد نہیں کرتے۔ بعض اوقات وہ کسی کارکن کو سالہا سال کوئی خاص کام دیے بغیر بھی تنخواہ دیتے ہیں۔ اس طرح دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایسا کارکن کسی دوسرے ادارے میں جا کر پیشہ ورانہ طور پر کسی بھی صورت اُن کے ادارے کے لیے نقصان کا باعث نہ بن سکے اور دوسرا کوئی ادارہ اُن کے مدِ مقابل نہ آ سکے مزید برآں کسی بھی مناسب وقت ایسے فرد سے وہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کام لیا جا سکے جس کا وہ ماہر ہو اور اسے بہتر انداز میں کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ جنگ گروپ کے اس طرزِ عمل کو ''بندے کو فریج میں رکھنے'' جیسی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔

جنگ گروپ عمومی طور پر اپنے ملازمین کو بہتر تنخواہیں اور دیگر مراعات بہم پہنچاتا ہے اور کارکنان بھی عموماً نکالے جانے کے خوف کے بغیر کام کرتے ہیں۔ البتہ بعض مخلص کارکنوں کے حوالے سے ادارے نے روشن مثالیں قائم نہیں کیں۔ مظفر محمد علی ''جنگ پبلشرز'' کے آغاز (1990ئ) سے ہی اس سیکشن کے ایڈیٹر تھے۔ اُن کی اُس وقت 12 ہزار روپے تنخواہ مقرر کی گئی جو کبھی نہ بڑھ سکی۔ 2007ء میں جب انھیں ہارٹ اٹیک ہوا تو چند ماہ بعد ہی انھیں ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

اسی طرح ''جنگ'' کے کئی کالم نگار لاکھوں میں معاوضہ پاتے ہیں۔ جبکہ سالہا سال سے ایڈیٹوریل لکھنے والے ایک صاحب اب بھی محض 30 ہزار کے لگ بھگ تنخواہ لے رہے ہیں۔

ادارتی صفحے پر ''جنگ'' نے ہمیشہ مختلف الخیال لوگوں کو چھاپا ہے اور کسی خاص نقطۂ نظر کو نہیں اپنایا۔ اس لیے اخبار کو ہر طرح کے لوگ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اپنے لیے چیلنج بن کر نکلنے والے کسی بھی نئے اخبار کے مقابلے میں ''جنگ'' ہمیشہ زیادہ طاقتور انداز میں سامنے آیا ہے۔ بظاہر ادارے کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ جنگ کے کئی نامی گرامی کالم نگار کئی برس قبل ''روزنامہ ایکسپریس'' کے اجراء کے وقت وہاں چلے گئے تو جنگ کی انتظامیہ نے سہیل وڑائچ اور امتیاز عالم سمیت کئی نئے کالم نگار متعارف کروا دیے۔ ستمبر 2012ء میں روزنامہ ''دنیا'' آیا تو ہارون الرشید، حسن نثار اور نذیر ناجی دنیا میں چلے گئے۔ جنگ نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کئی اچھا لکھنے والوں کو ادارتی صفحے پر شائع کرنا شروع کر دیا۔ جن میں ڈاکٹر منظور اعجاز، شاہین صہبائی اور دیگر کے علاوہ وقار خاں کو بھی متعارف کروایا۔ وقار خاں اعلیٰ معیار کا طنز و مزاح پر مبنی کالم لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ بہت گہرائی میں جا کے بات کرتے ہیں اور اتنا باریک طنز کرتے ہیں کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پچھلی چند دہائیوں میں ''جنگ گروپ'' نے متعدد حکومتوں سے بھی ''پَنگا'' لگائے رکھا۔ بلا مبالغہ یہ گروپ حکومتیں گرانے اور بنانے میں واضح کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اپریل

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

2014ء میں حامد میر پر قاتلانہ حملہ کے بعد ادارے کا یہی تاثر اس کے لیے وبالِ جان بن گیا۔ پاک بھارت تعلقات کو معمول کی سطح پر لانے کے لیے بھی اس گروپ نے ہمیشہ مثبت کردار ادا کیا ہے۔ ''ٹائمز آف انڈیا'' کے اشتراک سے یکم جنوری 2010ء سے ''امن کی آشا'' کے سلوگن کو لیے جنگ گروپ اسی مقصد کے لیے کوشاں ہے۔ گو کہ اس حوالے سے پاکستان میں متعدد طبقات کی طرف سے ادارے کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔

میر فیملی نے ہمیشہ ذاتی تشہیر سے نسبتاً اجتناب برتا ہے۔ جنگ گروپ کی تمام پبلیکیشنز انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔ بلکہ جنگ گروپ کی ویب سائٹ بہت اچھے طریقے سے ڈیزائن کی گئی ہے۔ آرکائیوز میں گزشتہ کئی سالوں کے کالم اور اخبارات پڑھے جاسکتے ہیں۔

جنگ گروپ سے وابستہ ایک سینئر صحافی نے بتایا کہ گذشتہ کچھ عرصے سے اخبار تیزی سے معیار کھوتا جارہا ہے۔ ان کے خیال میں جنگ لاہور کا ایڈیٹر رسمی طور پر اپنے فرائض انجام دیتا ہے جبکہ سارا اخبار کراچی سے تیار ہو کر آتا ہے۔ انہوں نے ایک اور مثال دیتے ہوئے واضح کیا کہ دی نیوز اسلام آباد کے انوسٹی گیشن سیل جیسی سٹوریز لاہور کے رپورٹرز فائل کریں تو نہیں چھپ سکتیں۔ ایک زمانے میں جنگ لاہور سے بہت نامی گرامی رپورٹرز وابستہ تھے جو اپنے کام سے پہنچانے جاتے تھے، لیکن اب یہ صورتحال بدل چکی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عمومی طور پر لاہور میں رپورٹرز کو محدود کر دیا گیا ہے۔ جنگ گروپ ''بول'' کے نام سے ایک نیا روزنامہ بھی شروع کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ''بول میڈیا گروپ'' اور ''جنگ گروپ'' کے درمیان جاری ''جنگ'' کے تناظر میں یہ ایک دلچسپ ڈویلپمنٹ ہے۔

روزنامہ آواز

جنگ گروپ نے لاہور میں شام کے اخبارات کی یلغار کو قابو کرنے کے لیے روزنامہ ''آواز'' اکتوبر 1998ء میں تھوڑی قیمت اور تھوڑے صفحات کے ساتھ چھاپنا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اشاعت ''جنگ'' لاہور سے بھی بڑھ گئی۔ اگر اس اخبار کے ادارتی صفحے پر کالموں اور اتوار کے میگزین کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ ایک مکمل اخبار ہے۔ گو کہ مذکورہ روزنامے کے دوسرے شہروں میں نمائندے موجود نہیں لیکن اپنے رپورٹرز، فوٹو گرافر،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایڈیٹر اور دیگر عملہ موجود ہے مگر چونکہ گروپ نے اپنے تمام اخبارات کو ایک دوسرے سے منسلک کیا ہوا ہے لہٰذا جنگ اخبار بھی ''آواز'' کو خبریں مہیا کرتا ہے۔ جنگ اور آواز کی خبریں اکثر و بیشتر ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ قاری کم قیمت میں یہ اخبار بخوشی خرید لیتا ہے۔

ہیئر سیلونز، چائے کے کھوکھوں اور دیگر ایسی جگہوں پر، جہاں اخبار کی حاضری کو ضروری خیال کیا جاتا ہے، عموماً ''آواز'' ہی نظر آتا ہے۔ ادارہ اگر روزنامہ ''آواز'' کو پروان چڑھانا چاہے تو یہ تیز رفتاری سے ترقی کر سکتا ہے مگر انتظامیہ ''جنگ'' کو کسی قسم کے امتحان میں نہ ڈالنے کی خاطر یا کسی بھی نقصان کے اندیشے سے بچانے کی غرض سے آواز کو کھلی چھوٹ نہیں دیتی۔ ایک زمانے میں آواز میں بازاری حکیموں اور عاملوں کے اشتہار بھی چھپتے تھے لیکن گروپ کے تمام اخبارات اور جرائد میں ایسے اشتہارات پر پابندی کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

روزنامہ وقت

پاکستان تحریک انصاف لاہور کے پہلے منتخب صدر اور پنجاب میں چودھری پرویز الٰہی کی وزارتِ اعلیٰ کے دور میں پانچ سال تک آئی ٹی کی نام نہاد وزارت کے صوبائی وزیر رہنے والے، لاہور کے پراپرٹی ٹائیکون عبدالعلیم خاں نے ''وقت'' کے نام سے ایک روزنامہ 4 جون 2006 کو لاہور سے جاری کیا۔ بانی ایڈیٹر طاہر ملک تھے۔

اچھے کاغذ پر صاف ستھری پرنٹنگ، نئے لے آؤٹ، منفرد میک اپ اور خوبصورت رنگوں سے مزین اپنے انداز کا ایک اخبار جو قارئین کو روایتی اخبارات میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا محسوس ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے اردو میں کوئی انگریزی طرز کا اخبار چھاپ دیا گیا ہو۔ جہاں اس اخبار نے بہت سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا تو وہاں کچھ روایتی چسکے دار خبروں کے عادی قارئین کو یہ روزنامہ پھیکا پھیکا لگتا تھا۔ بعد ازاں سلمان تاثیر مرحوم نے بھی انگریزی کے ''ڈیلی ٹائمز'' کے ساتھ اردو کا روزنامہ ''آجکل'' بھی روزنامہ وقت کی طرز پر ہی شائع کیا۔

''وقت'' اخبار نے پہلی دفعہ خواتین کا صفحہ روزانہ چھاپنا شروع کیا۔ علاوہ ازیں ہر خبر مکمل چھپتی تھی۔ قاری ''بقیہ'' ڈھونڈنے کے چکر سے بچ جاتا تھا۔ یہ اخبار کالم نگاروں کا ایک بہت اچھا پینل بنانے میں بھی کامیاب ہو گیا جس میں ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر مہدی حسن،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

افضل توصیف اور فرخ سہیل گوئندی نمایاں تھے۔ آہستہ آہستہ یہ روزنامہ اپنی جگہ بناتا جا رہا تھا اور کافی حد تک اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ لیکن چونکہ اخباری صنعت میں پراپرٹی کے کاروباری کی طرح دن دگنی رات چوگنی ترقی نہیں ہوتی لہٰذا روایتی سیٹھوں کی طرح عبدالعلیم خاں بھی غالباً ''وقت'' سے اُکتا گئے اور انھوں نے ''وقت'' کو جنگ گروپ کے ہاتھوں بیچ دیا۔

نام کے اعتبار سے روزنامہ ''وقت'' کی مماثلت ''نوائے وقت'' اور ''وقت ٹی وی'' سے تھی چونکہ نوائے وقت اور جنگ گروپ آپس میں بڑے کاروباری حریف سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا میر شکیل الرحمن نے کسی وقت، ''وقت'' کے اچھے استعمال کے لئے ''وقت'' کو خرید لیا۔ اب یہ اخبار چھپتا تو ہے اور کہیں نہ کہیں سٹالوں پر بھی موجود ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ویب سائٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ مگر مالکان کی کوئی دل چسپی نہیں لگتی کہ اُسے کوئی خریدے یا پڑھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے محض خانہ پُری کے لئے چھاپا جا رہا ہے۔ سُنید ہے کہ جنگ گروپ نے ''وقت'' میں دوبارہ جان ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے۔

روزنامہ دنیا

یہ اخبار 3 ستمبر 2012ء کو پہلی دفعہ لاہور سے شائع ہوا۔ اب یہ روزنامہ گوجرانوالہ، سرگودھا، راولپنڈی، کراچی اور فیصل آباد سے بھی شائع ہو رہا ہے۔ پنجاب گروپ آف کالجز کے چیئرمین میاں عامر محمود کا دنیا ٹی وی کے بعد میڈیا کے میدان میں دوسرا کامیاب پراجیکٹ ہے۔

دنیا اخبار کے لیے میاں عامر محمود نے بھاری سرمایہ کاری کی اور اخبار کے لیے اچھی ٹیم بنانے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے جنگ اور ایکسپریس جیسے بڑے اخبارات کے لیے کام کرنے والے صحافیوں کی خدمات بھاری معاوضے پر حاصل کر لیں۔ نذیر ناجی، ہارون الرشید، اور حسن نثار جیسے بڑے کالم نگاروں کو جنگ گروپ سے توڑا جبکہ اوریا مقبول جان، رؤف کلاسرائی، اظہر الحق، عامر خاکوانی، ظفر اقبال، خالد مسعود خاں، خورشید ندیم، سعدیہ قریشی، مجیب الرحمن شامی، انجم نیاز، طاہر سرور میر جیسے لکھنے والوں کو بھی اپنے اداراتی صفحات کی زینت بنایا۔

میاں عامر محمود اخبار کے چیف ایڈیٹر، نذیر ناجی گروپ ایڈیٹر اور ہارون الرشید

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایڈیٹوریل ایڈیٹر بنے۔ بعد میں ہارون الرشید محض کالم نگار ہی رہ گئے کیونکہ نذیر ناجی نے ترقی پسند اور "انقلابی" نظریات رکھنے والے لکھاریوں کو بھی ادارتی صفحے پر لکھنے کا موقع فراہم کیا اور نامعلوم انداز میں اِدارتی صفحے پر بھی اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ایک طرف انتہائی دائیں بازو کے خیالات کے امین اور یا مقبول جان اور دوسری طرف انتہائی بائیں بازو کے نظریات کے مبلّغ ڈاکٹر لال خاں کی تحریریں ایک ساتھ چھپنے سے اخبار کی لبرل پالیسی کا پتہ چلتا تھا۔ اور یا صاحب آج کل ایکسپریس میں لکھ رہے ہیں۔ جہاں کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ ڈاکٹر لال خاں، اکمل علیمی، راجہ انور، حسن جعفر زیدی جیسے ترقی پسند کالم نگاروں سے ادارتی صفحہ بوجھل ہو گیا ہے وہاں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مختلف الخیال لوگوں کے چھپنے سے اخبار میں زیادہ تنوع آیا ہے۔

اخبار ڈائجسٹ کے نام سے بھی ایک صفحہ شائع کرنا شروع کیا جس نے قارئین میں مقبولیت حاصل کی۔ دنیا اخبار کے مارکیٹ میں آنے سے جنگ اور ایکسپریس جیسے بڑے اخبارات کے بھی کان کھڑے ہو گئے اور خاص طور پر جنگ نے اپنے میک اپ اور خبریت کو بہتر بنانے کی سعی کی۔

روزنامہ دنیا کے لے آؤٹ اور میک اپ میں بہتری کی بہت گنجائش موجود ہے۔ گو کہ دنیا اخبار مارکیٹ میں آتے ہی اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا لیکن گزشتہ چند ماہ سے اس کی ترقی کا سفر رُکا ہوا ہے۔ اشتہارات کے اعتبار سے اخبار پہلے دن سے ہی خوش قسمت ہے۔

روزنامہ دنیا انٹرنیٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اخبار کا سنڈے میگزین بھی مواد، پیش کش کے اعتبار سے دیگر اخبارات سے نسبتاً بہتر ہے۔ سرکولیشن کے اعتبار سے، ایکسپریس، جنگ اور نوائے وقت جیسے اخبارات کی موجودگی میں اپنی جگہ پیدا کرنا اخبار کی بڑی کامیابی تصور کی جاتی ہے۔

روزنامہ نئی بات

24 نومبر 2011ء کو یہ اخبار لاہور سے اشاعت پذیر ہوا۔ آجکل یہ روزنامہ لاہور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے علاوہ کراچی، اسلام آباد، پشاور، کوئٹہ، فیصل آباد اور سرگودھا سے شائع ہو رہا ہے۔ سپیریئر گروپ آف کالجز اور یونیورسٹی کے مالک چودھری عبدالرحمن نئی بات کے پبلشر اور چیف ایڈیٹر جبکہ عطاالرحمن بانی ایڈیٹر ہیں۔

24 نومبر کی صبح بہت شاندار طریقے سے اس روزنامے کی رونمائی کی گئی۔ لاہور کی مختلف معروف شاہراہوں اور چوکوں میں سپیریئر یونیورسٹی کے طلباء رنگ برنگے غباروں کے جلو میں کھڑے تھے اور وہ ہر آنے جانے والے کو گلاب کے پھول اور روزنامہ ''نئی بات'' سرخ ربن میں ایک ساتھ بندھے پیش کر رہے تھے۔

قبل ازیں عطاالرحمن، سجاد میر اور ڈاکٹر مغیث الدین شیخ اور دیگر کی تصویروں سے مزین قدآور اشتہار شہر بھر کی شاہراہوں اور بسوں پر 24 نومبر سے پہلے ہی سجا دیے گئے تھے۔ جو روزنامہ ''نئی بات'' کی آمد سے مطلع کر رہے تھے۔

''نئی بات'' مارکیٹ میں کوئی خاص تاثر بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ خبروں میں بھی کوئی انفرادیت نہیں ہے جبکہ ادارتی صفحات پر کافی رونق ہے۔

جہان پاکستان

روزنامہ ''وقت'' اور ''آجکل'' کی طرز پر تیسرا اخبار ''جہانِ پاکستان'' مارکیٹ میں آیا۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں ''نئی بات'' اور ''دنیا'' کے بعد تعلیمی گروپس کی طرف سے نکلنے والا تیسرا اخبار بھی یہی تھا۔ ''جہان پاکستان'' جہاں پبلیکیشنز کے زیر اہتمام 5 نومبر 2012ء کو کراچی سے پہلی دفعہ اشاعت پذیر ہوا۔ بعد ازاں لاہور اور اسلام آباد سے اخبار نے اشاعت کا آغاز کیا۔ اچھے کاغذ، معیاری پرنٹنگ، منفرد لے آؤٹ اور میک اپ کے ساتھ یہ اخبار ایک علیحدہ Look کا حامل ہے۔

اس کے بانی گروپ ایڈیٹر بزرگ صحافی محمود شام تھے جو چند ماہ بعد مالکان سے اختلافات کے باعث اخبار سے علیحدہ ہو گئے۔ مستقل طور پر سینئر ایڈیٹر رانا طاہر کو انتظامیہ نے خود علیحدہ کر دیا۔ لاہور یونیورسٹی کے کرتا دھرتا ایم اے رؤف اس روزنامے کے مالک اور پبلشر ہیں۔ اُن کے فرزند اویس رؤف اس کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

'جہانِ پاکستان' مارکیٹ میں وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا جس کا خواب اس کی انتظامیہ نے دیکھا تھا۔

روزنامہ دن

یہ اخبار مارچ 1997 میں باقاعدہ چھپنا شروع ہوا۔ قبل ازیں 1996ء سے ہی یہ ڈمی کے طور پر چھپ رہا تھا۔ اخبار کے چیف ایڈیٹر اور مالک محمود صادق ہیں۔ پاکستان میں کمپیوٹر کو باقاعدہ رواج دینے میں محمود صادق کا بڑا ہاتھ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی MPA ڈیپارٹمنٹ میں سب سے پہلے انھوں نے کمپیوٹر کے شارٹ کورسز شروع کروائے۔ بعد ازاں ملک بھر میں ''نیشنل کالج آف کمپیوٹر سائنسز'' کے نام سے کمپیوٹر کی تعلیم کے ادارے قائم کئے۔ لاہور میں امریکن نیشنل سکول بھی محمود صادق چلاتے رہے۔ 'یونیورسٹی آف ساؤتھ ایشیا' بھی انھی کی ملکیت ہے۔

روزنامہ دن زیادہ صفحات اور کم قیمت کے ساتھ شروع ہوا اور آہستہ آہستہ اپنی جگہ بناتا گیا۔ انتظامیہ نے بڑے بڑے نام لینے کی بجائے خود اپنی ٹیم بنائی۔ اپنی اشاعت کے چار پانچ سال بعد اخبار ہذا اپنا ایک حلقۂ قارئین بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر 2005ء کے بعد ''دن'' نامعلوم طریقے سے ڈھل گیا اور پھر تیزی سے زوال کی گھاٹیاں اُتر گیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ اخبار سنڈے میگزین نہیں چھاپتا۔ خبروں میں کوئی انفرادیت (Bite) نہیں ہوتی جو قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ کوئی نامور کالم نگار اخبار سے وابستہ نہیں اور یوں لگتا ہے جیسے یہ اخبار خانہ پُری کے لیے چھاپا جا رہا ہے۔ مالکان کی عدم دلچسپی سے یہ باور ہوتا ہے جیسے میڈیا گروپ اُن کا اصل کاروبار نہیں بلکہ محض Face Cover ہو۔

2000ء میں دن گروپ نے بہت زور و شور سے انگریزی اخبار ''دی سن'' شروع کیا۔ دیگر انگریزی اخبارات سے بھاری معاوضے پر نامور صحافیوں کی خدمات حاصل کی گئیں مگر یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی اور چند ماہ بعد ہی اخبار بیٹھ گیا۔ بعد ازاں 2002ء میں دوبارہ ''سن'' کو طلوع کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور اسے ٹیبلائڈ شکل میں چھاپنا شروع کیا گیا۔ غالباً پاکستان میں یہ اپنی طرز کا پہلا تجربہ تھا جب کسی انگریزی روزنامے کو اس صورت میں شائع کیا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گیا مگر جلد ہی یہ روزنامہ مرحومین کی فہرست میں شامل ہو گیا۔

محمود صادق بہت دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے ایک میٹنگ کے دوران ''سن'' کے ایڈیٹر سے کہا کہ ڈاکٹروں کو بطور رپورٹر بھرتی کر لیا جائے۔ ایڈیٹر نے حیرانی سے وجہ پوچھی تو محمود صادق نے جواب دیا کہ ڈاکٹروں کی انگریزی بہت اچھی ہوتی ہے۔

روزنامہ اوصاف

اخبار ہذا پہلی بار 25 دسمبر 1997ء کو اسلام آباد سے شائع ہوا۔ جبکہ 2005ء میں لاہور سے، 15 اپریل 2006ء کو مظفر آباد، 11 اگست 2007ء کو ملتان، 27 مئی 2007ء کو لندن، یکم نومبر 2011ء کو گلگت اور 22 دسمبر 2011ء کو فرینکفرٹ سے اخبار ہذا کے ایڈیشن شائع ہونا شروع ہوئے۔

اخبار کے ایڈیٹر اور پبلشر مہتاب خاں ہیں۔ روزنامہ اوصاف کے پہلے ایڈیٹر حامد میر تھے۔ اُن کی ایڈیٹر شپ کے دوران اخبار نے روز افزوں ترقی کی اور اس کا شمار نمایاں روزناموں میں ہونے لگا تھا۔ جیسا کہ تذکرہ ہوا ہے کہ اب بھی یہ اخبار کافی جگہوں سے چھپ رہا ہے اور اسلام آباد اور کشمیر میں مقبول بھی ہے مگر اخبار اپنے ابتدائی دور والا سفر جاری نہیں رکھ سکا۔ روزنامہ اوصاف ویب سائٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

روزنامہ اُمّت، کراچی

یہ اخبار نامور صحافی صلاح الدین نے شائع کرنا شروع کیا۔ انھیں زیادہ شہرت ہفت روزہ ''تکبیر'' سے حاصل ہوئی جس میں وہ بالعموم ملکی اور بالخصوص کراچی کے حوالے سے کھل کر لکھتے تھے۔ اس جرأت مندانہ طرزِ تحریر کی قیمت انھیں اپنی جان دے کر ادا کرنی پڑی۔ اُن کے قتل کا الزام ایم کیو ایم پر لگا۔ قبل ازیں صلاح الدین جماعت اسلامی کے ترجمان ''روزنامہ جسارت'' کے بھی ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ روزنامہ ''اُمت'' بھی کراچی کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حوالے سے بالخصوص، آزادانہ اور جرأت مندانہ رپورٹنگ کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔ کراچی میں ایم کیو ایم کے خلاف کھل کر اگر کوئی اخبار لکھتا ہے تو وہ اُمت ہی ہے۔

غالباً ایم کیو ایم ''اُمت'' کو جماعت اسلامی کا حامی اور دائیں بازو کا اخبار قرار دیتی ہے۔ یہ روزنامہ کراچی کے علاوہ حیدر آباد ایڈیشن بھی چھاپتا ہے۔ اسی گروپ کے زیر اہتمام ہفت روزہ ''تکبیر'' اور مہینہ وار ''غازی'' بھی شائع ہوتے ہیں۔ روزنامہ ''اُمت'' کے علاوہ یہ دونوں رسائل بھی انٹرنیٹ پر پڑھے جا سکتے ہیں۔

روزنامہ جناح

پراپرٹی کنگ ملک ریاض نے یہ روزنامہ 2005ء میں شروع کیا۔ ابتدائی ایک دو سالوں میں یہ اخبار چل نکلا تھا۔ اخبار کے لیے تجربہ کار صحافیوں کی خدمات حاصل کی گئیں اور انھیں معقول معاوضہ بھی دیا جاتا رہا ہے لیکن اطہر مسعود کے بعد جب خوشنود علی خاں نے اخبار کے معاملات سنبھالے تو یہ روزنامہ بالکل بیٹھ گیا۔ اخبار کی پیشانی کے مطابق یہ ''کئی شہروں سے بیک وقت شائع ہونے والا کثیر الاشاعت مستند اخبار'' ہے لیکن اخبار کی حالت دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ اِسے محض خانہ پُری کے لیے چھاپا جا رہا ہے۔

اخبار سے وابستہ ''بڑے'' کالم نگاروں میں خوشنود علی خاں اور اُن کے بیٹے اویس خوشنود ہی تھے۔ میگزین کی حالت بھی دگرگوں ہے جس میں نمایاں مواد جناتی عاملوں کے اشتہار ہوتے ہیں۔

پچھلے اخبار کو دوبارہ فعال کرنے کی غرض سے سینئر صحافی محمود شام کی خدمات بطور ایڈیٹر حاصل کی گئی ہیں۔

روزنامہ اساس

اخبار ہذا نے 16 جولائی 1995ء کو راولپنڈی سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ یہ روزنامہ دراصل ردِعمل میں شائع ہونا شروع ہوا۔ نوے کی دہائی کے وسط میں روزنامہ خبریں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اپنے عروج پر تھا۔ اور اسلام آباد کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر اور حصہ دار خوشنود علی خاں تھے۔ مبینہ طور پر اُنھوں نے پنڈی کے پراپرٹی ڈیلروں، شیخ افتخار عادل اور ملک ریاض کو "تنگ" کیا تو دونوں نے اپنے اخبار نکال لیے۔

شیخ افتخار عادل نے "اساس" کے نام سے جبکہ ملک ریاض نے کچھ سالوں بعد "جناح" کے نام سے۔ شومئ قسمت دیکھیے کہ خوشنود علی خاں کئی سال "جناح" کے ہی ایڈیٹر رہے۔ ویسے نفسیاتی اور مخشیات کے علاج کے حوالے سے معروف معالج ڈاکٹر صداقت نے بھی اسی طرح ردِعمل میں اپنا اخبار "اُجاگر" نکالا تھا۔ لیکن اخبار ہذا جلد بند ہو گیا بہر حال اپنے اخباروں کے علاوہ مذکورہ تین اخبار نکالنے کا کریڈٹ بھی خوشنود علی خاں کو ہی جاتا ہے۔

نوے کی دہائی کے وسط میں دوپہر کے اخبار 'لشکر' کو روزنامہ 'اساس' کی انتظامیہ نے روزنامے کی شکل میں لاہور سے جاری کیا اور حسن نثار اس کے ایڈیٹر بنے۔ اخبار چل نکلا مگر جلد ہی حسن نثار علیحدہ ہو گئے تو 'لشکر' نے اپنا رُخ نامعلوم منزل کی طرف موڑ لیا اور آج تک اُس لشکر کا پتہ نہیں چل سکا۔ ویسے تو 'اساس' کئی شہروں سے شائع ہوتا ہے اور ویب سائٹ پر بھی موجود ہے مگر اس کی تھوڑی بہت جو بھی ریڈرشپ ہے وہ اسلام آباد میں ہی ہے۔

روزنامہ خبریں کے تتبع میں "اساس" کی ویب سائٹ پر "جہاں ظلم وہاں اساس" درج ہے جبکہ اخبار کی پیشانی پر دی گئی تفصیل یوں ہے۔ "راولپنڈی اسلام آباد، فیصل آباد، کراچی، مظفر آباد آزاد کشمیر سے بیک وقت شائع ہونے والا" پاکستان کی نظریاتی اساس کا علمبردار اور عوام کی اُمنگوں کا عکاس"۔

روزنامہ اِنصاف

یہ اخبار 25 نومبر 1999ء کو لاہور سے پہلی دفعہ شائع ہوا۔ اخبار کے مالک سیالکوٹ کے ایک معروف صنعتکار اور جماعت اسلامی کے رہنما پروفیسر امین جاوید تھے۔ جبکہ بانی ایڈیٹر اُن کے داماد جنید سلیم ہیں جو دنیا ٹی وی پر مقبول کامیڈی پروگرام حسبِ حال کے بھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میزبان ہیں۔ جنید سلیم کے والد مرحوم پروفیسر سلیم اوکاڑہ میں جماعت اسلامی کے رہنما رہے ہیں۔

ابتداء میں روزنامہ انصاف کے ایک مقبول اخبار بننے کے حوالے سے امکانات تھے لیکن جماعت اسلامی کی اپروچ اپنانے اور نوائے وقت کی طرز پر چلنے کی کوشش میں محدود ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ نوائے وقت کے ہوتے ہوئے کسی ایسے ہی دوسرے اخبار کی مارکیٹ میں گنجائش غیر فطری ہے۔ حالیہ سالوں میں یہی مسئلہ روزنامہ ''نئی بات'' کو بھی درپیش ہے۔ گو کہ روزنامہ انصاف جماعت اسلامی کا ترجمان نہیں اور ایڈیٹر جنید سلیم بھی بظاہر ماڈرن آدمی لگتے ہیں۔ مگر شروع سے ہی سٹاف اور زیادہ تر لکھنے والے جماعت اسلامی کے متاثرین محسوس ہوتے ہیں۔

لہٰذا اب اخبار کی پیشانی پر لکھا ہے۔ ''سنجیدہ حلقوں کا مقبول ترین اخبار''۔ اب سنجیدہ حلقے سے مراد غالباً جماعت اسلامی کے ''متقین'' ہی ہیں۔ اخبار پرنٹنگ، پیش کش اور خبریت کے حوالے سے سالہا سال سے ایک جگہ پر رُک چکا ہے۔ جبکہ روزنامہ کسی نہ کسی طرح تھکی ہوئی ویب سائٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

روزنامہ آج، پشاور

کہنے کو تو یہ روزنامہ پشاور، ایبٹ آباد، اسلام آباد اور کراچی سے شائع ہوتا ہے لیکن بالعموم یہ خیبر پختونخواہ میں ہی زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ روزنامہ 'آج' 1989ء سے شائع ہو رہا ہے اور اس کے ایڈیٹر عبدالواحد یوسفی ہیں۔ اخبار کے پینل پر اپنے کالم نگار بھی ہیں جبکہ مہمان کالم نگار بھی چھپتے ہیں۔ روزنامہ 'آج' ویب سائٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

ڈیلی سٹی 42، لاہور

پاکستان کا پہلا میٹروپولیٹن اخبار ہے۔ قبل ازیں یہی میڈیا گروپ لاہور سے ہی ''سٹی 42'' میٹروپولیٹن ٹی وی کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہ روزنامہ 28 اگست 2011 سے اشاعت پذیر ہے۔ شہر کی خبروں کے حوالے سے یہ ایک بھرپور اخبار ہے۔ لاہور کی تاریخ، تقریبات کی رپورٹنگ اور تصاویر، قومی و بین الاقوامی خبریں بھی اخبار کا مستقل حصہ ہیں۔ سپورٹس اور شوبز کی سرگرمیوں کو بھی نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ اخبار کے مالک اور چیف ایڈیٹر محسن نقوی ہیں۔ گروپ کا سٹاف ٹی وی اور اخبار دونوں کے لیے کام کرتا ہے۔

(نوٹ: انگریزی اخبارات میں لکھنے والوں کے حوالے سے یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ وہ مستقلاً کس اخبار میں لکھتے ہیں۔ چونکہ اکثر اخبارات حوالہ دیئے بغیر، دوسرے اخبارات کا مواد بھی شائع کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کالم نگار بھی اپنی مرضی سے اخبارات بدلتے رہتے ہیں۔ یہی صورتحال اخبارات کے کارکن ایڈیٹرز کے حوالے سے ہے۔)

○

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پاکستانی زبانیں، صوبے اور پرنٹ میڈیا

اپنی زبان، ثقافت، تہذیب وتمدن اور دھرتی سے محبت واُنسیت انسانی جبلّت کا خاصہ ہے، جس سے مفر ممکن نہیں۔ انسانی تہذیب کے مطالعے اور مشاہدے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مذہب اور ثقافت ہمیشہ ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ انسانی تہذیب کے ارتقائی سفر میں ایسے ہی ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ یہ عمل معاشروں کو خوبصورت بنانے کے کام آیا ہے۔ رمضان میں سحری کے لیے ڈھولچی کا گلی محلوں میں ڈھول بجانا اس حوالے سے موزوں ترین مثال ہے۔ ڈھول ثقافتی علامت جبکہ سحری خالصتاً ایک مذہبی معاملہ ہے۔ لیکن یہاں ثقافت اور مذہب نہایت خوبصورتی سے یکجا ہیں اور کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ سحری جیسے نیک مقصد کے لیے ڈھول بجانا غلط ہے۔ اسی طرح مساجد میں ایک زمانے میں نوبت بھی بجائی جاتی تھی۔ ایک اور خوبصورت مثال عیدالاضحیٰ پر بچوں کا قربانی کے جانور کو مختلف رنگوں، غباروں اور دیگر چیزوں سے سجانا ہے۔ قربانی مذہبی فریضہ جبکہ قربانی کے جانوروں کی آرائش اور رنگنا خالصتاً ثقافتی عمل ہے۔

مذہب اور ثقافت کو خالص بنانے کی تحاریک وقت اور تاریخ کا پہیہ واپس گھمانے میں ناکام رہتی ہیں۔ البتہ ایسا کرنے سے خون خرابے اور نفرت کا سامان ضرور پیدا ہوتا ہے۔ ویسے بھی مذہب کو محض مذہبی رسومات کی ادائیگی تک محدود کر دینا بذاتِ خود مذہب دشمن رویّہ ہے۔

ایک دوسرے کے جذبات واحساسات، عقائد، زبان، شناخت اور تہذیب وتمدن

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے احترام کا رویہ ہی انسانی معاشرت کے ارتقاء کا لازمہ ہے۔ لوگوں پر زبردستی مخصوص نظریات، زبان یا عقائد مسلط کرنے کا نتیجہ کبھی بھی مثبت برآمد نہیں ہوا بلکہ ایسے روّیوں میں فقط تباہی مضمر ہوتی ہے۔

جب ملکی سطح پر عوام کی زبان وثقافت، خواہشات واحساسات اور شناخت کے لیے گنجائش پیدا نہیں کی جاتی تو عام شہری سمجھتا ہے کہ اُسے عزت نہیں دی جا رہی۔ لامحالہ وہ مزاحمت، بغاوت، نفرت اور علیحدگی کے احساسات میں پناہ لینے پر مائل ہوسکتا ہے اور جب لوگوں کے جذبہِ اظہار کو مزید دبایا جاتا ہے یا اُن کے نقطۂ نظر کو سننے اور سمجھنے کا روّیہ اختیار نہیں کیا جاتا اور انھیں غدّار تک کہا جاتا ہے تو اُن میں ردِّعمل کے طور پر سرکشی کا جذبہ مزید فروغ پا سکتا ہے۔ نتیجتاً اُس علاقے کا میڈیا مخصوص احساس وجذبات کا اسیر اور ترجمان بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے اگر وہ عوامی جذبات سے ہٹ کر بات کرے گا تو عام لوگوں کے نزدیک وہ سچ کا ترجمان اور ہمدرد نہیں بلکہ سامراجی روّیوں کا پرچارک اور ساتھی ہوگا۔ ایک لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ہر خطے، ملک اور علاقے کا میڈیا بالعموم مخصوص نقطۂ نظر کا ہی اسیر ہوتا ہے۔ کیونکہ روایتی اپروچ کو چیلنج کرنا اور ہوا کے مخالف رُخ پر چلنا ہر زمانے اور ہر خطے میں ہی مشکل امر رہا ہے۔ لیکن جرأت مند لوگ ہمیشہ وہ ہی بات کہتے آئے ہیں جس کو اُنھوں نے سچ جانا اور سمجھا۔ خواہ انھیں گالیاں ملیں یا طعن وتشنیع، وہ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے، تشدد سہا، جانیں تک قربان کیں اور یوں تاریخ کے ماتھے کا جھومر بنے۔ نقطۂ نظر کی اسیری کے حوالے سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہر اخبار کے مخصوص یا ٹارگٹ قارئین ہوتے ہیں جن کی دل چسپی کو مدِ نظر رکھ کر ہی اشاعتی مواد کو ترتیب دینا پڑتا ہے۔ یہی اصول ریڈیو، ٹی وی یا دیگر میڈیائی ذرائع کو اپنانا پڑتا ہے کیونکہ مارکیٹ میں طلب کے حساب سے ہی چلا جاسکتا ہے۔

سنسکرت، عربی، فارسی یا فرنچ ہر اعتبار سے معتبر اور علمی خزانوں کی حامل زبانیں ہیں لیکن اگر برِ صغیر میں ان زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں ہر اعتبار سے معیاری اخبار چھاپا جائے تو ظاہر ہے عوام کی اس میں دلچسپی نہیں ہوگی۔ اسی طرح پاکستان کا کوئی کامیاب ترین اخبار سویڈن کی اہم ترین خبروں پر مبنی صفحہ چھاپنا شروع کر دے تو ظاہر ہے پاکستانی قارئین کے لیے ان خبروں میں کوئی کشش نہیں ہوگی۔ لہٰذا سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہر خطے کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لوگوں کو اپنا علاقہ، اپنی موسیقی، ثقافت، رسم و رواج اور تہذیب و تمدن اور مادری زبانیں اچھی لگتی ہیں۔ کسی دوسرے دلکش، خوبصورت اور سہولیات سے مزین علاقے میں سیر و تفریح کی خاطر محدود وقت کے لیے تو لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے مگر مستقلاً قیام ہجر و فراق کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ کم از کم ہجرت کرنے والی نسل کے ساتھ یہ المیہ رہتا ہے البتہ اُن کے بچے ویسا محسوس نہیں کرتے جیسا کہ ہجرت کے عمل سے گزرنے والے افراد خود، کیونکہ بچوں کا وطن تو وہی ہوتا ہے جہاں وہ جنم لیتے ہیں یا پلتے بڑھتے ہیں۔ اسی لیے دیارِ غیر میں مستقل آباد تارکینِ وطن کی اپنے دیس کی خبروں اور معاملات میں دلچسپی عین فطری تصور کی جاتی ہے۔

دراصل انسان کی وابستگی ہی اُس کی دل چسپی کا تعین کرتی ہے اور پھر یہی دلچسپی میڈیا منڈی میں طلب و رسد کا پیمانہ قرار پاتی ہے۔ بعینہٖ بہتر پراپیگنڈہ بھی اسی دائرے کا محتاج ہے۔ لہٰذا اسی اصول کے تحت میڈیا گروپ اپنی ترجیحات کا تعین کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے مفادات کا تحفظ یقینی بنا سکیں۔ یقیناً پاکستانی میڈیا بھی اسی کھونٹے سے بندھا ہے لہٰذا عمومی طور پر پاکستانی زبانوں میں صحافت، پاکستان کے بڑے میڈیا گروپس کی ترجیح نہیں وجہ یقینی طور پر مارکیٹ ویلیو ہی ہے۔ چنانچہ جب کبھی بھی مارکیٹ کی صورتحال بدلے گی تو پاکستانی زبانوں میں صحافت کا توازن بھی بدلے گا۔

اردو، انگریزی کے علاوہ دیگر پاکستانی زبانوں میں بے شمار اخبارات و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے انھیں وہ اہمیت حاصل نہیں جس کے وہ حقدار ہیں۔ پاکستانی زبانوں میں صحافت کے فروغ نہ پانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ریاست کا رویّہ ہے، جس کی بنا پر اردو اور انگریزی کے علاوہ دیگر قومی زبانوں کی اہمیت کو کبھی تسلیم کیا گیا ہے اور نہ ہی اُن کی ترقی و ترویج کے لیے خوش دلی سے کسی قسم کے اقدامات کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور اسی طرزِ فکر (Mind Set) کا مظاہرہ بارہا کیا جا چکا ہے۔

ایک اخباری خبر کے مطابق قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے قانون و انصاف نے مسلم لیگ (ن) کی ایم این اے ماروی میمن کا علاقائی زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ دینے کا بل مسترد کر دیا۔ اس کمیٹی کی سربراہی پی ایم ایل (ن) کے ہی گوجرانوالہ سے منتخب ایم این اے بشیر ورک کر رہے تھے۔ بل کے حق میں صرف ڈی جی خان سے پی ایم ایل ن کے ممبر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قومی اسمبلی امجد فاروق کھوسہ نے ووٹ دیا۔ جے یو آئی (ف) پی ٹی آئی کے ممبران نے بل کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ ایم کیو ایم کے ممبرز نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے سندھ سے منتخب ایم این اے ایاز سومرو جنھوں نے پہلے بل کی حمایت کا عندیہ دیا تھا مگر عین موقع پر انھوں نے بل کی مخالفت کی۔

بل کی مخالفت کرتے ہوئے وزارتِ قانون کے سپیشل سیکرٹری جسٹس (ر) رضا خاں کا کہنا تھا: ''کسی قوم کی ایک ہی زبان ہونی چاہیے۔ اردو اور بنگالی دونوں کو قومی زبانوں کا درجہ دینے کا نتیجہ ملک پہلے ہی 1971ء میں مشرقی پاکستان کے المیے کی شکل میں بھگت چکا ہے۔''

(Daily Dawn 17 July 2014 Report by Amir Waseem)

قبل ازیں 2011ء میں بھی ماروی میمن کا ایسا ہی پیش کردہ بل مسترد کر دیا گیا تھا۔ (تب ماروی میمن مسلم لیگ (ق) کی ٹکٹ پر رُکن قومی اسمبلی تھیں)

2011ء میں بننے والی قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی کے رُکن ننکانہ صاحب سے پیپلز پارٹی کے ایم این اے سعید احمد ظفر نے مجوزہ بل کو ''اینٹی پاکستان'' قرار دیا تھا۔ ایک اور ممبر نے یہ کہہ کر مخالفت کی تھی کہ ''قائداعظم نے اردو کو قومی زبان قرار دیا تھا'' جبکہ سندھ سے پیپلز پارٹی کے بانی رُکن اور ایم این اے ظفر علی شاہ نے جواباً کہا تھا کہ ''مذکورہ اعلان پر مشرقی پاکستان میں سخت مزاحمت ہوئی تھی جس کا حتمی نتیجہ بہت بڑے المیے کی صورت میں برآمد ہوا تھا۔''

(Daily DAWN - 18 May 2011)

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جس طرح مشرقی پاکستان کے عوام پر اردو مسلط کرنے کی کوشش کی گئی اور پھر جیسے وہاں ریاست کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ آخر کار ریاست کو عوامی خواہشات کے سامنے سرِ خم تسلیم کرنا پڑا اور بنگلہ کو قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا مگر تب تک پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ یہ قضیہ نفرت کا ایسا بیج بو گیا جس کا نتیجہ ہمیں 1971ء میں بھگتنا پڑا۔ بے شک مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں دیگر عوامل کے ساتھ زبان کے مسئلے کا بھی بہت بڑا کردار تھا۔

بدقسمتی سے بطور قوم ہم نے اس المیے کے بعد بھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔ بھارت میں بھی مادری زبانوں کے حقوق کے لیے لوگوں نے آواز بلند کی اور عوامی سطح پر تحاریک بھی چلیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مگر اُنھوں نے جلد ہی کافی حد تک اس معاملے کو حل کر لیا۔ اب ہندوستان میں ریاستی سطح پر دو دو، تین تین قومی زبانیں ہیں اور ملکی سطح پر پہلی، دوسری اور تیسری زبان کے طور پر مختلف زبانوں کو اپنا کر اُنھوں نے کام سیدھا کر لیا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں اس حوالے سے صورتحال حوصلہ افزا نہیں بلکہ اس ضمن میں بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ جانے ہمارا یہ کنفیوژن کب دور ہوگا کہ ملک میں بولی جانے والی تمام زبانیں قومی ہی ہوتی ہیں۔ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ حقیقت تسلیم کرنے سے ملک کو کسی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ وہ زیادہ مضبوط ہوگا اور ملکی وحدت خطرات سے دوچار ہونے کے بجائے مزید مستحکم ہوگی کیونکہ دھرتی کے تمام باشندوں میں یہ احساس پنپے گا کہ اُن کی شناخت اور حقوق کی ضامن ریاست ہے۔ جب ریاست اپنائیت دے گی تو عوام کے لیے علیحدگی یا بغاوت کے نعرے میں کشش نہیں رہے گی۔ لہٰذا پاکستانی زبانوں کی اہمیت کو تسلیم کرنا مثبت عمل قرار پائے گا اور ایسا کرنے سے اردو زبان کو بھی کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوگا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اردو میڈیا خود کو قومی میڈیا قرار دیتا ہے، یقیناً اس کا کاروباری مفاد اسی نعرے میں پنہاں ہے۔ اگر آج پاکستان کے تمام لوگوں کو اُن کی مادری زبانوں میں تعلیم کا حق دے دیا جائے تو پندرہ بیس سالوں کے بعد بڑے میڈیا گروپس ان زبانوں میں ہی اخبارات اور چینل شروع کر دیں گے۔ کیونکہ تب انھیں منڈی میں پراڈکٹ خریدنے کے لیے گاہک میسر ہوگا۔ اس حوالے سے پاکستانی میڈیا سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایکسپریس گروپ نے اپنا اردو اخبار مختلف شہروں سے بیک وقت چھاپنا شروع کیا۔ مگر سالہا سال کے تجربے کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ سندھ میں ''ایکسپریس'' کو وہ رسپانس نہیں ملا جو ملک کے دیگر حصوں سے ملا تھا، لہٰذا گروپ نے ''سندھ ایکسپریس'' کے نام سے سندھی زبان میں اشاعت کا آغاز کر دیا۔

قبل ازیں روزنامہ ''خبریں'' بھی اسی طرح کے تجربے سے گزرا۔ نتیجتاً خبریں گروپ نے کئی سال پہلے سندھی روزنامہ ''خبرون'' شائع کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ روزنامہ سندھی کے بڑے روزناموں میں شمار ہوتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے ''ڈان'' ٹی وی بہت بڑی مثال ہے۔ ڈان پاکستان کا بہت بڑا میڈیا گروپ ہے جس کی ڈیلی ''ڈان'' سمیت انگریزی زبان میں کئی کامیاب پبلیکیشنز ہیں۔ اسی کامیاب پسِ منظر کے ہوتے ہوئے گروپ نے پاکستان کا پہلا انگریزی چینل ''ڈان نیوز'' شروع کیا۔ بظاہر یہ ٹی وی بہت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کامیاب چل رہا تھا مگر کاروباری اعتبار سے انتظامیہ نے جب یہ سمجھا کہ یہ کامیاب نہیں تو اُنھوں نے کئی ملازمین کو فی الفور فارغ کیا اور اپنی نشریات کو اردو زبان دے دی۔

پاکستانی زبانوں میں صحافت کا مختصر جائزہ کچھ یوں ہے۔

سندھی اخبارات:

پاکستان میں اردو، انگریزی کے بعد سندھی اخبارات سب سے بڑی تعداد میں چھپتے ہیں۔ ویسے بھی مجموعی طور پر پاکستانی صحافت کے تقابلی جائزے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ملکِ عزیز میں سندھی میڈیا کی صورتِ حال کافی حد تک حوصلہ افزاء ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صوبہ سندھ میں ذریعہ تعلیم سندھی ہے اور بطور لازمی مضمون نصاب کا حصہ ہے۔

سندھی لکھنا پڑھنا چونکہ اکثر سندھیوں کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے نتیجتاً سندھی اخبارات کی سرکولیشن حوصلہ افزاء اور حلقہ قارئین وسیع ہے۔ روزگار کے سلسلے میں سندھ سے باہر پاکستان کے دیگر حصوں میں مقیم سندھی بذریعہ ڈاک سندھی اخبار منگواتے رہے ہیں۔ اب انٹرنیٹ پر اخبارات کی دستیابی نے قارئین کو مزید سہولت دے دی ہے۔

سندھ کے دور دراز گوٹھوں تک بھی سندھی اخبارات کی رسائی ہے۔ سندھ میں کم پڑھے لکھے لوگوں کے ہاں بھی اخبار اور کتاب پڑھنے کا رجحان ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھیوں کا سیاسی شعور بھی عام پاکستانیوں کی نسبت بلند ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ بدقسمتی سے یہ شعور سندھی عوام کی مفلوک الحالی کو ختم نہیں کر سکا۔ اہلِ سندھ کی اپنے ادب، زبان، کلچر اور شناخت سے محبت اور وابستگی قابلِ رشک ہے۔ اپنی مادری زبان کو یہ مقام دلوانے کے لیے سندھی عوام اور دانشوروں نے بہت کوشش کی اور کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اے پی این ایس کی ویب سائٹ کے مطابق کم وبیش 26 سندھی روزنامے اس کے ممبر ہیں۔ سندھی صحافت کا عمومی مزاج کسی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ قوم پرستانہ ہے۔ اپنا یہ کردار سندھی پریس 1948ء سے ہی نبھا رہا ہے۔ مذکورہ سال اپریل کے مہینے میں جب کراچی کو صوبہ سندھ سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو سندھی اخبار ''الوحید'' نے کُھل کر اس فیصلے کی مخالفت میں لکھا۔ اسی طرح جب 1954ء میں ون یونٹ سکیم متعارف کروائی گئی تو سندھی روزناموں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''الوحید''، ''کاروان'' اور ''نئی سندھ'' نے اس فارمولے کی سخت مزاحمت کی۔ نتیجتاً اس وقت سندھی کے سب سے بڑے روزنامے ''الوحید'' کو نہ صرف زبردستی بند کر دیا، بلکہ اخبار کے پرنٹنگ پریس کو بھی نیلام کر دیا گیا۔ اسی طرح ''نئی سندھ'' کو بھی بند کر دیا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ون یونٹ، کوٹہ سسٹم، سندھی زبان کے حقوق، سندھیوں کے ساتھ مبینہ ناانصافیوں، زمین کی الاٹمنٹس جیسے ایشوز کو سندھی پریس اُٹھاتا رہا نتیجتاً 1958ء سے 1970ء تک سندھی پریس ریاستی جبر کا شکار رہا۔

1977ء کے مارشل لاء کے بعد صرف پانچ سندھی روزنامے، ''ہلالِ پاکستان''، ''عبرت''، ''سندھ نیوز''، ''مہران'' اور ''آفتاب'' اشاعت جاری رکھ سکے۔ سخت سنسرشپ کے باوجود اس دور میں ایم آر ڈی کی تحریک اور سندھیوں کے حقوق کے لیے سندھی پریس نے نمایاں کردار ادا کیا۔

تصویر کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ ریاستی رویّے کے ردِعمل کے طور پر سندھ میں قوم پرستانہ جذبات میں شدت پیدا ہوئی اور پھر یہی شدت کسی حد تک آگے چل کر سندھ کے شہری علاقوں میں ایم کیو ایم جیسی لسانی جماعت کے جنم کی ایک وجہ بنی تو دوسری طرف سندھ کی تعمیر و ترقی میں حصہ ڈالنے والے پنجابی آبادکار اسی شدت کا نشانہ بنے لیکن مجموعی طور پر سندھی پریس کا کردار قابلِ تحسین ہی ٹھہرے گا۔

''سندھی دانشور اور صحافی یہ سمجھتے ہیں کہ سندھ کے حوالے سے سندھی میڈیا اُن ایشوز کا بھی احاطہ کرتا ہے جن کو اردو میڈیا نظر انداز کر دیتا ہے۔ اُن کے خیال میں سندھی میڈیا صوفی روح کا حامل ہے اور یہ انتہا پسندانہ سوچ کے خلاف بہادری سے لڑا ہے۔ اسی طرح محروم طبقات کے حق میں بھی سندھی میڈیا نے ہمیشہ آواز اُٹھائی ہے۔''

(Daily DAWN- April 8, 2014)

سندھی میڈیا کی خامیوں پر نگاہ ڈالی جائے تو وہ کم و بیش وہی ہیں جو مجموعی طور پر پاکستانی میڈیا کی کمزوریاں ہیں۔ مثلاً کم تنخواہ، ذاتی آراء اور خواہشات کو خبر کی شکل دینا، مبنی برتعصب رپورٹنگ، لوگوں کی ذاتی زندگی میں مداخلت وغیرہ۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روزنامہ سندھ، ہلچل، مہران، تعمیر سندھ، ہلالِ پاکستان، عبرت، کاوش، خبرون اور سندھ ایکسپریس سندھی میں شائع ہونے والے نمایاں اخبارات ہیں۔

بلوچستان میں صحافت:

ارشاد مستوئی اپنے ایک تجزیاتی مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''بلوچستان کے صوبائی دارالحکومت کوئٹہ میں دو طرح کے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ پہلے درجے میں وہ ہیں جو کثیر الاشاعت قومی اخبارات کے ضمیمے کی صورت میں بلوچستان سے شائع ہوتے ہیں۔ ان اخبارات کا محض کاروباری نقطۂ نظر ہوتا ہے جس کے لیے وہ سرکاری اشتہارات کے حصول کی دوڑ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ان قومی اخبارات کے ادارتی صفحات پر بلوچستان کے لوگوں کو درپیش مسائل سے متعلق کوئی تحریر نہیں ہوتی۔ لاتعلقی کی دنیا میں رہنے والے ان اخبارات کے ادارتی صفحات اسلام آباد، کراچی یا لاہور سے تیار ہو کر آتے ہیں۔ ان اخبارات کی حتی الوسع کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسا کوئی مواد شائع نہ کیا جائے جس سے کاروبار متاثر ہونے کا اندیشہ اور خدشہ ہو۔ دوسرے درجے پر وہ اخبارات ہیں جن کی ادارت مقامی صحافی کرتے ہیں اور ان کے ادارتی صفحات میں بلوچستان کے ایشوز اور مسائل کو زیادہ نمایاں طور پر کوریج دی جاتی ہے۔ ایسے اخبارات کو دباؤ کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جو بلوچستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مجموعی جائزہ لیا جائے تو بلوچستان میں صحافت آج بھی گھٹنوں کے بل چل رہی ہے۔''

''بلوچستان میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک سو سے زائد روزنامے کوئٹہ سے شائع ہوتے ہیں لیکن مارکیٹ میں پہنچنے والے ایک درجن ہی ہونگے باقی محض تعلقاتِ عامہ کے دفتر میں سرکاری ریکارڈ کا حصہ بنتے ہیں ان میں بلوچی و براہوی زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد انتہائی کم ہے۔''

''بلوچستان میں صحافتی سفر جمود کا شکار نظر آتا ہے۔ بلوچی اور براہوی زبان میں اخبارات و رسائل کے فقدان کی ایک وجہ وسائل کی عدم دستیابی ہے لیکن یہاں اردو میں شائع ہونے والے اخبارات بھی محض خانہ پُری ہیں۔ ''روزنامہ جنگ'' کوئٹہ ''روزنامہ ایکسپریس'' کے علاوہ شاید ایک آدھ کوئی روزنامہ ہوگا جس کا ادارتی صفحہ مقامی سطح پر تیار ہوتا ہو جبکہ اس میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بھی بلوچستان کی نمائندگی انتہائی کم ہوتی ہے۔ بلوچستان سے متعلق لکھنے والے ایسے لوگ ہیں جنھوں نے کوئٹہ کے علاوہ شاید ہی کسی شہر کا نظارہ کیا ہو۔"

"باقی اخبارات کراچی، لاہور، اسلام آباد اور پشاور سے شائع ہونے والے اخبارات کے ادارتی صفحات اور ایڈیشن پر اکتفا کرتے ہیں۔ اب تو انٹرنیٹ نے ان اخبارات کی مشکلات آسان کر دی ہیں۔ نہیں تو ابھی کچھ دیر پہلے تک کی بات ہے جب باہر کے اخبارات جہاز کے ذریعے کوئٹہ پہنچتے تھے اگر ایک دن فلائٹ موسم کی خرابی کے باعث نہ آئے تو پرانا ادارتی صفحہ ہی چھاپ دیا جاتا تھا۔ یہاں میڈیا تین حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک قومی میڈیا کہلاتا ہے جس میں "جنگ"، "ایکسپریس" اور "خبر رساں" ادارے ہیں جو ملکی سطح پر ہیں، دوسرا میڈیا بلوچ نقطۂ نظر سے تعلق رکھتا ہے اور تیسرا پشتون نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے لیکن تین حصوں میں تقسیم میڈیا میں خبر کا ذریعہ "خبر رساں" ادارے کی جانب سے بھیجی جانے والی خبریں ہی ہیں جو شہ سُرخیوں میں شائع کی جاتی ہیں۔"

ماضی میں "کوئٹہ سے ملکی سطح کے اخبارات میں صرف جنگ اور مشرق کے ایڈیشن چھپتے تھے، جن میں نوّے فیصد سے زیادہ خبریں ملکی سطح کی ہوتی تھیں، بلوچستان کی واقعاتی خبریں بمشکل دو کالمی جگہ پاتی تھیں۔ مقامی لکھاریوں کا ان اخبارات میں داخلہ شجرِ ممنوعہ تھا۔ ادارے میں بلوچستان کا ذکر ناپید تھا۔"

بلوچستان کی صحافتی تاریخ میں روزنامہ "آساپ" کی بہت اہمیت ہے۔ اکتوبر 1992ء میں تربت سے اس کا اجراء بطور ماہنامہ ہوا۔ مذکورہ جریدے کا کثیر حصہ بلوچی جبکہ کچھ مواد اُردو پر مبنی ہوتا۔ زیادہ تر مضامین ادبی نوعیت کے ہوتے تھے جبکہ کچھ حصہ سیاسی مضامین پر مشتمل تھا۔ اس کے پہلے مدیر ممتاز یوسف اور عبید شاد تھے۔ بعد ازاں رسالے کا زیادہ حصہ سیاسی مواد میں چھپنے لگا اور ادبی موضوعات کم ہو گئے لیکن اُردو کا حصہ بڑھا دیا گیا۔ چنانچہ اُردو اور بلوچی کا تناسب تقریباً برابر ہو گیا۔ چند سالوں میں ہی "آساپ" نے مکران سمیت بلوچستان کے دیگر حصوں میں بھی قارئین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کر لیا۔ 17 اگست 2001ء کو یہ روزنامہ کوئٹہ اور کراچی سے بھی چھپنا شروع ہو گیا۔ آساپ 17 اگست 2009ء تک اشاعت پذیر رہا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آساپ نے نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کی اور اُن کے لیے نرسری کا کردار ادا کیا۔ سات سال مسلسل اشاعت کے بعد یہ روزنامہ ناگہانی موت کا شکار ہو گیا۔ مگر بلوچستان کی صحافتی تاریخ ''آساپ'' کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکے گی۔

''مجموعی طور پر بلوچستان کی صحافت میچور نہیں ہو سکی۔ گو کہ پاکستان، بالخصوص بلوچستان میں صحافت خطرناک ترین شعبہ قرار دے دیا گیا ہے جہاں حقائق منظر عام پر نہ لانے کیلئے صحافیوں کو سیکورٹی اداروں، مسلح گروہوں اور مختلف سیاسی سماجی و مذہبی تنظیموں کی جانب سے دباؤ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پیشہ ورانہ امور کی انجام دہی کے دوران بلوچستان کے مختلف اضلاع میں گزشتہ چند سال کے دوران 30 کے قریب صحافی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ صحافیوں کے لیے مہلک ترین علاقوں کی فہرست میں بلوچستان پہلے نمبر پر ہے۔ عسکریت پسندوں، سیکورٹی اداروں، سیاسی و مذہبی قوتوں کی جانب سے دھمکیوں، اغواء اور قتل کے خطرات کا صحافیوں کو ہمہ وقت سامنا ہے۔''

''اُردو کی طرح بلوچی اور براہوی صحافت میں بھی آراء پر مبنی خبروں کی اشاعت کا مسئلہ اس لیے نہیں کہ یہاں خبریں، خبر رساں اداروں سے لی جاتی ہیں اور انھیں ترجمہ کرتے وقت ڈنڈی مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بلوچ فکر سے تعلق رکھنے والے اخبارات کے ادارتی یا بلوچی و براہوی صفحات میں اکثر اوقات آراء پر مبنی تحریریں شائع کی جاتی ہیں جو تعصبی ذہنیت اور غیر ذمہ دارانہ ہوتی ہیں، اور انھیں ممکنہ اثرات کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر شائع کیا جاتا ہے۔''

''بلوچی زبان میں واحد روزنامہ ''نوائے وطن'' ہے لیکن وہ بھی مارکیٹ میں انتہائی کم دستیاب ہوتا ہے اور کوئی بلوچی کا اخبار نہ ہونے کے باعث اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے لیکن آج کل اپنی پتلی حالت کے پیشِ نظر اس روزنامے کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ ویسے تو مجموعی طور پر ہی بلوچی اور براہوی صحافت انتہائی غیر مؤثر دکھائی دیتی ہے۔''

''براہوی میں شائع ہونے والا روزنامہ ''تلار'' ہے جس نے تجرباتی طور پر نئے رُجحانات متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ براہوی کے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے اور براہوی زبان و ادب کی ترقی و ترویج پر بھی توجہ دی جاتی ہے لیکن خبر کا ذریعہ یہاں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بھی خبر رساں ادارے ہی ہیں یا پھر مانیٹرنگ ڈیسک کا استعمال کرتے ہوئے الیکٹرانک میڈیا کی چٹ پٹی خبروں کو تراشا جاتا ہے۔"

انگریزی اخبارات "ڈان" اور "دی نیوز" بھی چھپتے ہیں، اسی طرح "بلوچستان ٹائمز" بھی بلوچستان کا ایک جانا پہچانا انگریزی اخبار سمجھا جاتا ہے۔ مرحوم فصیح اقبال طویل عرصہ اس کے ایڈیٹر رہے۔ تمام انگریزی اخبارات میں مشترک چیز ان کی محدود اشاعت اور مخصوص حلقۂ قارئین تک رسائی ہے۔

بلوچستان میں اشاعت کے اعتبار سے تمام بڑے اخبارات اردو ہیں۔ "جنگ" کوئٹہ، خضدار، اور کچلاک تک پڑھا جاتا ہے۔ جبکہ "مشرق" بھی بلوچستان میں کافی مقبول ہے اور یہ کوئٹہ، ڈیرہ مراد جمالی، سبی جھل مگسی کے علاقوں میں زیادہ مقبول ہے، جبکہ "انتخاب" اور "آزادی" بھی بڑے اخبار سمجھے جاتے ہیں اور یہ تقریباً پورے بلوچستان میں پڑھے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ بلوچ نقطۂ نظر کو نسبتاً زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ "عوام" اور "باخبر" بالعموم پشتون نقطۂ نگاہ کو پیش کرتے ہیں اور یہ بلوچستان کے پشتون علاقوں میں ہی مقبول ہیں۔ لہٰذا یہ تربت اور گوادر وغیرہ میں نہیں جاتے۔

روزنامہ "قدرت" پشتو میں شائع ہوتا ہے۔ یقیناً یہ پشتون علاقوں میں افغانستان تک حلقۂ قارئین کا حامل ہے اور مخصوص پشتون فکر کا پرچارک ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ ہو چکا ہے کہ بلوچستان میں صحافت کرنا ایک کٹھن عمل ہے۔ مختلف قبائل اور سرداری نظام کے پیش نظر ہر کسی کو راضی رکھنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا وہاں خبروں سے زیادہ بیانات ہی چھپتے ہیں۔ عورت کی خودکشی یا قتل کی خبر عموماً شائع نہیں ہوتی کیونکہ ایسی خبر کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ذرائع آمدورفت کی مخدوش صورتحال کے پیش نظر دور دراز کے بعض علاقوں میں اخبار پچھلے پہر یا بعض صورتوں میں اگلے روز پہنچتا ہے۔

سیکورٹی ایجنسیز کے علاوہ بی ایل اے اور لشکر جھنگوی وغیرہ وہاں بہت بڑے پریشر گروپس ہیں۔ لہٰذا مگشدہ افراد یا پنجابی سیٹلرز کے قتل کی خبروں کو بھی گول مول انداز میں شائع کیا جاتا ہے۔ مثلاً "سریاب روڈ پر ایک شخص کو گولیاں مار کر قتل کر دیا گیا۔" "فلاں جگہ سے ایک شخص کی مسخ شدہ لاش ملی ہے۔" یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کسی بلوچ شدت پسند کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قتل کے بعد کسی بلوچ پارٹی یا مقتول کے لواحقین کا بیان یوں چھپے گا۔

''فلاں بلوچ کی لاش ملنا بربریت کی بدترین مثال ہے۔'' جبکہ کسی پنجابی مقتول کے لواحقین کا ایسا بیان بھی چھپنا محال ہے۔ بلوچستان کی علاقائی صحافت میں شوبز اور کامرس کے شعبے نہ ہونے کے برابر ہیں، لہٰذا اس حوالے سے خبریں بھی کم ہی نظر آتی ہیں۔

پشتو صحافت:

پشتو پاکستان کی اہم ترین زبانوں میں سے ایک ہے جس کے بولنے اور سمجھنے والے نہ صرف پاکستان کے طول وعرض میں موجود ہیں بلکہ افغانستان کی بہت بڑی آبادی کی بھی یہی زبان ہے۔ پشتو صحافت کی مجموعی حالت بھی پتلی ہی ہے۔

پشتو زبان کا سب سے بڑا روزنامہ ''وحدت'' ہے۔ جو قبل ازیں 1933ء سے 1985ء تک ہفت روزہ کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ 1985ء میں ہی یہ جریدہ پیر سفید شاہ ہمدرد کے پاس چلا گیا۔ اُنھوں نے اس ہفت روزہ کا نام ''الوحدت'' سے ''وحدت'' میں تبدیل کر دیا اور پشاور سے اس کی اشاعت بطور روزنامہ شروع کر دی۔

چونکہ اس زمانے میں افغان مہاجرین بھی بہت بڑی تعداد میں پاکستان میں موجود تھے لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے ''وحدت'' نے اپنے ہزاروں قارئین پیدا کر لیے۔ چار صفحات پر مشتمل یہ اخبار افغانیوں کی زندگیوں کا معمول بن گیا۔ تمام جہادی گروپوں کے قائدین اور نمائندوں نے مہاجرین نے بھی اپنے اثر رسوخ کو بڑھانے کے لیے ''وحدت'' کو استعمال کرنا شروع کیا۔

روزنامہ ''وحدت'' نے قوم پرستوں کے نقطۂ نظر کو جگہ دینے کے ساتھ ساتھ مقامی شاعروں اور دانشوروں کو نہ صرف اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا بلکہ پشتو کے احیاء اور تحفظ میں بھی کردار ادا کیا۔ اب یہ اخبار قارئین کی ایک مناسب تعداد کو خدمات فراہم کر رہا ہے۔ باقاعدہ 6 صفحات کا یہ پشتو روزنامہ پاکستان اور افغانستان میں پیش آنے والے واقعات کو مساوی اہمیت دیتا ہے۔

روزنامہ ''خبرونہ'' چار صفحات پر مشتمل ایک مکمل پشتو اخبار ہے جس کی اشاعت کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آغاز 9/11 کے سانحے کے بعد ہوا۔ ''وحدت'' کی نسبت ''خبرونہ'' کا نقطۂ نظر جمہوری اور ترقی پسندانہ ہے۔ فروری 2008ء کے عام انتخابات کے فوراً بعد ''پشتون پوسٹ'' نے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس روزنامہ کی اشاعت باقاعدہ لیکن مقبولیت چند سرکاری محکموں تک محدود ہے۔

روزنامہ ''جرگہ'' نے 2010ء کے اواخر میں اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ اور جلد ہی ایک معیاری اخبار کے طور پر جانا جانے لگا۔ پشاور میں مقیم سینئر صحافی رحیم اللہ یوسف زئی سے جب یہ سوال کیا کہ ''پشتو صحافت کا سیاسی Impact کیا ہے؟ تو اُنھوں نے تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ پشتو کی اہمیت افغانستان کے معاملے سے جڑی ہوئی ہے۔ 80ء کی دہائی میں جب افغانستان کا مسئلہ شروع ہوا تو یہ خطہ عالمی طاقتوں کی توجہ کا مرکز بنا۔ پشتو ہی افغانستان کی غالب اکثریت کی زبان ہے اور اس کی سرکاری زبان کی بھی حیثیت ہے۔ لہٰذا جب افغان جنگ شروع ہوئی تو کئی عالمی نشریاتی اداروں نے پشتو میں اپنی نشریات شروع کیں۔ یہاں تک کہ ریڈیو ٹوکیو نے بھی پشتو سروس کا آغاز کر دیا۔ افغان مہاجرین کی پاکستان آمد سے قبل چھپنے والے اِکا دُکا پشتو اخبار یا رسالوں کی حالت بہت پتلی تھی لیکن مہاجرین کے آنے سے صورتحال بدل گئی اور پشتو اخبارات کی مانگ بڑھ گئی۔ نتیجتاً پشتو صحافت کو بہت فروغ ملا۔ اسی طرح جب افغان مہاجرین کی اکثریت واپس چلی گئی تو پشتو اخبارات کی فروخت میں نمایاں کمی دیکھنے میں آئی۔ مقامی پختون اپنی زبان اور کلچر سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن پشتو ذریعہ تعلیم نہ ہونے کے سبب پڑھ نہیں سکتے لہٰذا اُن کی زیادہ دلچسپی پشتو اخبارات میں نہیں ہے۔ اس وقت پشاور سے شائع ہونے والے پشتو اخبارات کا زیادہ تر عملہ افغان مہاجرین پر مشتمل ہے جبکہ مقامی صحافی سمجھتے ہیں کہ یہ اخبارات اچھے پے ماسٹرز نہیں ہیں۔ پشتو اخبارات میں زیادہ تر خبریں بھی افغانستان کے متعلق ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مقامی سیاست یا سماج پر پشتو پریس کا زیادہ Impact نہیں ہے۔ گو کہ سرکاری اشتہارات ان اخبارات کو خوب ملتے ہیں۔

سینئر صحافی شمیم شاہد کا خیال ہے کہ ''دیگر علاقائی پریس کی طرح، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا دونوں حالاتِ حاضرہ کے واقعات کو زیادہ کوریج دے رہے ہیں۔ جبکہ ان کا نقطۂ نظر مکمل طور پر جارحانہ اور منفی ہے کیونکہ یہ تشدد، جارحیت اور متنازعہ واقعات کو نمایاں طور پر پیش کرتے ہیں۔ پشتو کے کچھ اخبارات ادب کو مناسب جگہ دے رہے ہیں۔ لیکن زیادہ تر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ادب تاریخ یا ماضی کے واقعات پر مبنی ہے۔ اخبارات میں اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے۔ البتہ اخبارات کے قارئین اور سرکولیشن میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔"

پنجابی پریس:

پاکستانی زبانوں میں سب سے زیادہ بے اعتنائی کا شکار پنجابی ہے۔ پنجاب کے حکمرانوں نے ہمیشہ پنجابی زبان سے سوتیلے پن کا سلوک کیا ہے۔ انھیں ہمیشہ محض ایک ہی "قومی زبان" کا بخار چڑھا رہتا ہے اور دوسری طرف پنجابی عوام بھی اس ٹھیکیداری میں پیش پیش ہیں۔ دوسرے صوبوں میں ایک طبقہ پنجابیوں کے اس رویے کو چالاکی گردانتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے مفادات کی خاطر اپنی زبان اور کلچر کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے حالانکہ پنجابی نام نہاد "حُب الوطنی" اور "قومی وحدت" کی خاطر خلوصِ نیت سے اپنی زبان کے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔ جبکہ اُن کی اس "حُب الوطنی" کو "پنجابی سامراج" نام دیا جاتا ہے۔

دراصل اس نظریے کا پس منظر یہ ہے کہ پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ پنجاب کا بالادست طبقہ قومی زبان اور قومی وحدت کے نام پر ہمارے بنیادی حقوق سلب کرتا ہے۔ جن میں "مادری زبان" میں تعلیم کا حق سرِفہرست ہے۔ اسی طرح وسائل کی منصفانہ تقسیم کا معاملہ ہے (گو کہ اٹھارویں آئینی ترمیم کے بعد اس حوالے سے چھوٹے صوبوں کی دلجوئی کا کافی سامان ہوا ہے) بہرحال بنیادی سوال وہیں کھڑے ہیں۔

پنجاب کی سرکار کا پنجابی زبان سے روّیہ ویسا ہی ہے جیسے کسی برہمن کا شودر سے ہو سکتا ہے۔ پنجابی زبان اور کلچر اگر زندہ ہیں تو اپنے قابلِ فخر ورثے کی وجہ سے ورنہ، نہ تو سرکار نے اسے درگور کرنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے اور نہ ہی اہلِ پنجاب کے اپنے روّیے نے۔ عمومی طور پر پنجاب کو پاکستانی ریاست کا "چہرہ مہرہ" خیال کیا جاتا ہے لہٰذا جس طرح پاکستانی ریاست نے قومی زبانوں کو "لفٹ" نہیں کرائی بعینہٖ پنجاب کی سرکار نے کبھی پنجابی زبان کو بھی منہ نہیں لگایا۔ البتہ حنیف رائے مرحوم اور چودھری پرویز الٰہی کے وزارتِ اعلیٰ کے ادوار میں تھوڑا بہت کام مستثنیات ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پنجاب میں پنجابی جرنلزم مفلوک الحالی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ پاکستان بننے کے بعد کئی دہائیوں تک کسی پنجابی روزنامے کا سامنے نہ آنا بالکل بھی حیران کُن امر نہیں تھا۔ ان ابتدائی دہائیوں میں پنجاب میں پنجابی زبان اور ثقافت کی بات کرنا تقریباً معیوب ہی سمجھا جاتا تھا کیونکہ اُس زمانے میں پنجابی مسلمان ذہنی طور پر ایک ایسی ثقافت کا امین اور پاسبان بن چکا تھا جس کا وجود مصنوعی اور جڑیں زمین میں ہونے کے بجائے ذہنوں میں تھیں۔

قبل ازیں ہندوستان کے مسلمان اپنے لیے ایک ایسی علیحدہ مملکت کا مطالبہ کر رہے تھے جہاں وہ اپنی زندگیاں اپنی مرضی سے آزادانہ طور پر گزار سکیں۔ لہٰذا یہ نعرہ بھی مقبول تھا کہ بطور شناخت سب سے پہلے ہم مسلمان ہیں اور اس کے بعد بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی یا پٹھان ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد ریاست نے بھی یہی نعرہ اپنایا۔ یقیناً اس میں حرج بھی کوئی نہیں تھا۔ لیکن جب بنگالیوں یا سندھیوں نے اپنی زبان کے حق کی بات کی تو ریاست کو یہ مطالبہ ناگوار گزرا جبکہ پنجاب کی اربن مڈل کلاس اور ان کے رہنما اس نعرے کے سب سے بڑے علمبردار سمجھے جاتے تھے۔ یہ وہی انداز فکر تھا جو آگے چل کر نفرتوں کا باعث بنا۔ اس نفرت کا سب سے بڑا نشانہ پنجاب تھا حالانکہ پاکستانی ریاست یا پنجابی اربن مڈل کلاس اپنی طرف سے پورے خلوصِ نیت سے قومی یک جہتی کی خاطر اس فلسفے کی آبیاری میں مصروف تھی۔ لیکن بنگالی بالخصوص یہ سوال اُٹھاتے تھے کہ ہم اپنی زبان یا ثقافتی پہچان کس ضابطے کے تحت ترک کر دیں؟ کیا اپنی زبان، ثقافتی شناخت اور وسائل میں حصے کا تقاضا کرنے سے ہماری پاکستانیت یا مسلمانیت کم تر درجے کی رہ جائے گی؟

یہ وہ صورتحال تھی جس میں پنجاب کا ایک مخصوص طبقہ قومی یک جہتی کا ٹھیکیدار بنا ہوا تھا۔ حالانکہ اپنی اپنی زبان اور ثقافتی پہچان کے ساتھ بھی ہر شہری بہترین اور محب وطن پاکستانی رہ سکتا تھا۔ یہ فضا بڑی حد تک اب بھی موجود ہے اور پنجابیوں کی بڑی تعداد ابھی تک اسی فضا میں سانس لیتی ہے۔ لیکن پنجاب کے عوام میلوں ٹھیلوں، تہواروں اور رسم و رواج کا اپنے روایتی انداز میں ہمیشہ اُسی جوش و خروش سے حصہ رہے ہیں جو ان کا خاصہ سمجھا جاتا رہا ہے۔

اسی مخصوص طرزِ عمل اور اندازِ فکر کا نتیجہ ہے کہ پاکستان بننے کے تقریباً چالیس سال بعد پنجابی کا پہلا روزوار اخبار ''سجن'' فروری 1989ء میں منظر عام پر آیا۔ مگر صرف 21 ماہ کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بعد ہی نومبر 1990ء میں کسمپرسی کے عالم میں وفات پا گیا۔

پنجابی محقق، اقبال قیصر، 'سجن' سے مختلف حیثیتوں میں وابستہ رہے انھوں نے ''سجن'' کے حوالے سے یاداشتوں پر مبنی کتاب ''راتاں ہوئیاں وڈیاں'' بھی تحریر کی۔ اقبال قیصر بتاتے ہیں کہ ''سجن'' ترقی پسند خیالات کے حامل انگریزی رسالے ''ویو پوائنٹ'' سے وابستہ تین سینئر صحافیوں حسین نقی، ظفریاب احمد اور شفقت تنویر مرزا کی مشترکہ کاوش تھا۔ حسین نقی صاحب نے ایک گفتگو میں بتایا کہ یہ اخبار چندہ کر کے تجرباتی طور پر تھوڑے عرصے کے لیے نکالا تھا لیکن وسائل کی کمیابی کے باوجود یہ روزنامہ کئی ماہ چلتا رہا۔ اکرم وڑائچ اور نجم حسین سید نے بھی اس روزنامے کی کامیابی کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔ جب کہ حکومتِ پنجاب کے ساتھ ساتھ پنجابی صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کا رویہ مایوس کن تھا۔ اخبار کے لیے پنجابی زبان وثقافت سے پیار کرنے والوں نے پیسے اکٹھے کیے یہاں تک کہ دو خواتین زویا ساجد اور ہما صفدر نے اپنا زیور بیچ کر ''سجن'' کو دان کر دیا۔

حسین نقی ''سجن'' کے مینجنگ ایڈیٹر اور ظفریاب احمد ایڈیٹر تھے۔ ابتدائی 25، 30 دن یہ اخبار 5 تا 7 ہزار کے قریب چھپتا تھا اور کوئی کاپی نہیں بچتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی اشاعت کم ہوگئی جس کی وجہ مالی مشکلات اور پنجاب سرکار کی عدم دلچسپی تھی۔ پرائیویٹ اشتہارات تھوڑے بہت ملتے تھے جبکہ پنجاب سرکار نے ''سجن'' کی پوری ''حیاتی'' میں معمولی قیمت کا صرف ایک اشتہار دان کیا۔ اس کے برعکس سندھ گورنمنٹ مادری زبانوں سے دوستی کے رویّے کے سبب ''سجن'' کو اشتہار دیتی رہی۔ وفاقی حکومت کی طرف سے وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے ''سجن'' کو 5 لاکھ روپے کی گرانٹ دی۔

''سجن'' اور پنجابی زبان سے بے اعتنائی کے رویے پر اخبار کے صحافیوں اور پنجابی پیاروں نے پہلی سالگرہ پر 3 فروری 1990ء کو لاہور میں گنگا رام ہسپتال سے (جہاں قریب ہی ''سجن'' کا دفتر تھا) پنجاب اسمبلی تک احتجاجی ریلی نکالی۔ مگر پنجاب سرکار کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخری دنوں میں حالات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ اخبار بروقت چھپنے سے بھی قاصر تھا نتیجتاً مارکیٹ میں دستیابی بھی ممکن نہیں تھی۔ اخبار کو چونکہ بے شمار خطوط موصول ہوتے تھے لہٰذا آدھے صفحے پر انھی کو چھاپا جاتا تھا۔ جب یہ روزنامہ قریب المرگ تھا تو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بہت سے قارئین نے جذباتی ہو کر یہاں تک لکھا کہ اگر ''سجن'' بچ سکتا ہے تو وہ اپنے گردے بیچنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ یہ اخبار 4 صفحات پر مشتمل تھا، کچھ سپیشل رنگین ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔

بعض نقاد حضرات کی نظر میں پنجابی کے پہلے اخبار کو پذیرائی نہ ملنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اِس نے روزمرّہ کی زبان استعمال کرنے کے بجائے متروک الفاظ اور غیر موزوں اصطلاحات کو رواج دینے کی کوشش کی جس سے عام قاری شناسا نہیں تھا۔ لیکن دوسری طرف دیہاتی علاقوں اور جنوبی پنجاب میں اِسی زبان کو پسند کیا جاتا تھا۔ عمومی طور پر اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ پنجاب سرکار اور پنجاب کے کاروباری طبقے کے عدم تعاون کی روش ہی ''سجن'' کی موت کا باعث بنی۔

1997ء میں پنجابی کے دوسرے روزوار ''بھلیکا'' نے اشاعت کا آغاز کیا۔ اشاعت سے پہلے پوسٹرز اور دیگر ذرائع سے اس کی آمد کی کافی تشہیر کی گئی۔ عام لوگوں نے ایک پنجابی اخبار کی اشاعت شروع ہونے پر خوشگوار حیرت کا اظہار کیا۔ یہ روزنامہ ''سجن'' جیسے انجام سے تو بچا ہوا ہے اور کسی نہ کسی طرح اپنی اشاعت جاری رکھے ہوئے ہے۔ مگر عوامی اور سرکاری سطح پر اس کی پذیرائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مدثر اقبال بٹ روزوار ''بھلیکا'' کے ایڈیٹر ہیں۔

''خبریں'' گروپ نے فروری 2004ء میں پنجابی کا تیسرا روزوار اخبار ''خبراں'' کے نام سے چھاپنا شروع کیا۔ خبریں چونکہ اس سے قبل پنجابی صفحے کا آغاز کر چکا تھا جس کے ایڈیٹر نامور پنجابی کہانی کار اور شاعر حسین شاد تھے۔ لہٰذا ''خبراں'' کے پہلے ایڈیٹر بھی وہی مقرر ہوئے۔ جبکہ ضیا شاہد چیف ایڈیٹر تھے۔ اس روزنامے کی اشاعت 7 سو سے 7 ہزار تک پہنچ چکی تھی مگر بعد ازاں یہ اخبار بھی بظاہر مالی معاملات میں خود کفیل نہ ہونے کے سبب بند ہو گیا۔ مواد اور خبروں کی ''خبراں'' کو کوئی کمی نہیں تھی۔ کیونکہ اِسے ایک بڑے اخبار کی معاونت حاصل تھی۔ ''خبراں'' ابھی بھی اے پی این ایس کا ممبر ہے۔ غالباً یہ ڈمی چھپتا ہے اور اسے سرکاری اشتہار بھی ملتے ہونگے۔ لیکن وہ مارکیٹ یا ویب سائٹ کہیں بھی دستیاب نہیں۔

پنجابی کا تیسرا روزوار اخبار ''لوکائی'' یکم جنوری 2011ء سے اشاعت پذیر ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پنجابی زبان وادب اور کلچر سے بے پناہ محبت کرنے والے پروفیسر ڈاکٹر جمیل پال اس کے بانی ایڈیٹر ہیں۔ قبل ازیں وہ پنجابی رسالوں ''رویل'' اور ''سویر'' کے بھی ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ مہینہ وار 'سویر' اب بھی اُن کی زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔

لوکائی ''اے بی سی'' سرٹیفائیڈ ہے جبکہ 'لوکائی' کو بھی پنجاب سرکار کی روایتی بے اعتنائی کا سامنا ہے۔ اشتہار نا کافی اور مالی معاملات انتہائی دِگرگوں ہیں نتیجتاً ڈاکٹر پال کو اپنی جیب سے ہر مہینہ تقریباً ایک لاکھ روپیہ ''لوکائی'' پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے شہروں مثلاً شکر گڑھ ساہیوال وغیرہ سے اخبار کی تھوڑی بہت مانگ ہے مگر وسائل کی کم یابی کے سبب رسائی ممکن نہیں۔ تمام تر کٹھنائیوں کے باوجود جمیل پال کا عزم جوان ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اخبار کو چلا رہے ہیں۔ جہاں تک پنجابی کے دیگر جریدوں کا تعلق ہے تو اُن میں سویر، رویل، پنجابی، لہراں اور ترنجن شامل ہیں۔ لیکن ان میں بعض کی اشاعت مہینہ وار بھی نہیں بلکہ معمول کی اشاعت میں بھی بعض اوقات تعطل آ جاتا ہے۔ مواد کے اعتبار سے ان کا زیادہ حصہ ادب پر مشتمل ہوتا ہے۔

90ء کی دہائی میں الیاس گھمن اور جمیل پال کی زیرِ ادارت چھپنے والا مہینہ وار ''رویل'' پنجابی لکھنے پڑھنے والے حلقوں میں کافی مقبول تھا۔ اس رسالے نے کئی نئے لکھنے والوں کو بھی متعارف کروایا۔ ''رویل'' میں سیاسی اور سماجی موضوعات پر بھی اداریے اور مضامین شامل ہوتے تھے۔ انگریزی اخبار ''ڈان'' پنجابی زبان وادب، ثقافت اور پنجاب کے حقوق کے حوالے سے برس ہا برس سے کالم چھاپ رہا ہے۔ اس کالم میں پنجاب اور پنجابی سے جڑے ہوئے مختلف موضوعات پر بات کی جاتی ہے لیکن عمومی طور پر ادب وثقافت کو ہی زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ پہلے یہ کالم شفقت تنویر مرزا Punjabi Themes کے عنوان سے لکھتے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد یہ کالم مشتاق صوفی ''پنجاب نوٹس'' (Punjab Notes) کے نام سے لکھ رہے ہیں۔

پنجاب میں پنجابی لکھنے پڑھنے والے محدود حلقے کی حد تک تو پنجابی اخبار اور رسالوں نے پنجاب اور پنجابی زبان کے حقوق کے حوالے سے آگہی میں تحریک پیدا کی ہے لیکن مجموعی طور پر پنجاب کی سیاسی وسماجی حرکیات پر پنجابی پریس کے کوئی قابل ذکر اثرات نظر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نہیں آتے۔

جبکہ بھارتی پنجاب میں مقابلتاً پنجابی پریس بہت مضبوط اور گہرے سماجی و سیاسی اثرات کا حامل ہے۔ وہاں درجن سے زائد پنجابی روزنامے چھپ رہے ہیں۔ بڑے اخبارات میں ''اجیت'' روزانہ سوا لاکھ کے قریب چھپتا ہے۔ اتوار کو اس کی اشاعت ڈھائی لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ جبکہ ''پنجابی ٹریبیون'' اور ''نواں زمانہ'' کی روزوار اشاعت کم و بیش 75 ہزار ہوتی ہے۔

سرائیکی پریس:

عمومی طور پر وسطی پنجاب کے پنجابی دانشور، سرائیکی کو علیحدہ زبان نہیں بلکہ پنجابی کا ایک لہجہ قرار دیتے ہیں، نصف صدی قبل تک جس کا نام ''ملتانی'' تھا۔ لیکن سرائیکی دانشوروں کا اصرار ہے کہ سرائیکی نہ صرف علیحدہ زبان ہے بلکہ پنجابی سے بھی بڑی زبان ہے اور یہ سندھی کے بہت قریب ہے۔ یہاں اس حقیقت کا ذکر بھی مناسب ہے کہ پنجابی اور سندھی کے ہزاروں الفاظ مشترک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زبانیں دریاؤں کے رُخ پر جنم لیتی ہیں۔ پنجابی اور سندھی دونوں ہڑپائی تہذیب کی وارث زبانیں ہیں اور سرائیکی ان دو زبانوں کا سنگم ہے۔

مناسب یہی ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کرتے ہوئے زمینی حقائق کو تسلیم کیا جائے۔ جنوبی پنجاب چونکہ مرکز سے دور ہے اور وہاں کے باسیوں کو چھوٹے موٹے کاموں کے لیے بھی لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ ذرائع آمد و رفت، علاج معالجے کی بہتر سہولیات کی عدم دستیابی کے ساتھ ساتھ سماجی ناہمواری اور جاگیرداری کے جبر سمیت دیگر بہت سے ایسے مسائل ہیں جو لوگوں میں احساسِ محرومی کو جنم دیتے ہیں۔ جنوبی پنجاب کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کے ہاں اس احساس کی شدت اور ہجر و فراق کے مختلف صورتوں کا علامتی بیان بھی بہت واضح ہے۔ لہٰذا ادبی رسائل و جرائد میں مذکورہ مضامین کا اظہار نمایاں نظر آتا ہے۔ سرائیکی دانشور اپنی تخلیقات میں سرائیکی زبان کے مسئلے کو سیاسی حوالوں سے بھی جوڑتے ہیں۔

سرائیکی میں مختلف رسائل و جرائد تو شائع ہوتے رہے مگر اُن کی نوعیت ادبی تھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسی طرح اردو کے اخبارات، امروز، جنگ، پاکستان، اوصاف، ایکسپریس اور خبریں بھی سرائیکی ادب اور ثقافت کے حوالے سے صفحات شاملِ اشاعت کرتے رہے ہیں۔ جبکہ روزنامہ خبریں نے جنوبی پنجاب کے عوامی مزاج کے مطابق پالیسی اپنائی، مسائل کو اُجاگر کرنے میں واضح کردار ادا کیا۔ اس لیے اب بھی اُس علاقے میں خبریں سرکولیشن کے اعتبار سے پہلے نمبر پر ہے۔

روزنامہ ''جھوک'' نے 11 جون 1990ء کو خان پور ضلع رحیم یار خاں سے پہلے سرائیکی روزنامے کے طور پر اشاعت کا آغاز کیا۔ بعد ازاں یہ اخبار ملتان اور ڈیرہ اسماعیل خاں سے چھپنا شروع ہو گیا۔ ''جھوک'' کے ایڈیٹر ظہور احمد دھریجہ کے خیال میں ''سرائیکی صحافت کے زیادہ ترقی نہ کرنے کی ایک وجہ اخبار، رسالہ اور میگزین خرید کر نہ پڑھنے کی عادت بھی ہے۔'' اس کے علاوہ ''لوگوں کا مزاج ابھی تک سرائیکی ذائقے والا نہیں بن سکا۔''

روزنامہ ''جھوک'' کے مسائل بھی وہی ہیں جو بلوچی، براہوی یا پنجابی پریس کو درپیش ہیں۔ یعنی وسائل کی عدم دستیابی، عوام کی ناخواندگی، اشتہارات کی کم یابی اور سرکار کا سوتیلا پن۔ ظہور احمد دھریجہ اپنی ذات میں ایک پوری تحریک ہیں۔ اُن کا اردو کالم بھی روزنامہ ''خبریں'' میں بہت عرصہ شائع ہوتا رہا ہے۔ وہ ''جھوک پبلشرز'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی چلا رہے ہیں۔

گلگت بلتستان میں صحافت:

گلگت بلتستان قدرتی حسن اور نعمتوں سے مالا مال ایسا خطہ ارضی ہے جسے تا حال وہ اہمیت نہیں مل سکی جس کا وہ مستحق ہے۔ شمالی علاقہ جات کے نام سے معروف تقریباً 28000 ہزار مربع میل پر مشتمل اس بے مثال خطے کو 7 ستمبر 2009ء کو پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت نے قانون سازی کے ذریعے صوبائی حیثیت دی اور ''گلگت بلتستان'' کا نام دیا۔

بلند ترین پہاڑی چوٹیوں، گلیشیئرز، خوبصورت وادیوں اور منفرد جغرافیائی حیثیت کا حامل یہ علاقہ دنیا کے پانچ ممالک پاکستان، ہندوستان، تاجکستان، چین اور افغانستان کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سرحدوں کا سنگم بھی ہے۔

بنیادی طور پر یہاں کی ڈیڑھ ملین کے قریب آبادی امن پسند اور معتدل مزاج ہے گو کہ 80ء کی دہائی کے دوران ملکی و بین الاقوامی حالات کے زیر اثر یہاں بھی مسلکی و نسلی امتیازات نے سر اٹھایا مگر گزشتہ دو سالوں سے حالات بہتری کی طرف گامزن ہیں۔ خطے کی صحافتی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو وہ بہت پرانی نہیں۔ بابائے صحافت کے نام سے معروف سینئر صحافی اور دانشور شیر باز علی خاں برچہ نے اپنی کتاب ''عکس گلگت بلتستان'' میں صحافتی منظر کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ڈوگرہ عہد کے خاتمے تک بہت سے مقامی افراد متحدہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں سے اخذِ فیض کر کے عملی زندگی کا آغاز کر چکے تھے، جن میں سے کئی ایک حضرات خارزارِ صحافت میں داخل ہوئے۔ سینئر صحافی سید بہادر علی سالک کے بقول سید محرم علی شاہ صاحب ''اصلاح'' سرینگر سے منسلک تھے اور آزادی کے ابتدائی ایام میں ''جمہور'' اور ''ترجمان'' کے عنوان سے قلمی پرچے لکھ کر خواندہ حلقوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ دونوں پرچے مسلم لیگ کے ترجمان تھے۔ ذرا اور پیچھے جھانکیں تو سید حسن اور ذکاوت علی شگری بھی اس میدان میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ دونوں حضرات شملہ اور دہلی سے نکلنے والے انگریزی پرچوں کے لیے لکھا کرتے تھے۔ 48-1947ء کے پرآشوب دور میں بلتستان کے بعض جہاندیدہ و خواندہ حضرات نے ''جرس'' کے نام سے ایک قلمی پرچہ جاری کیا، جس میں جنگ آزادی کی سرگرمیوں کا احاطہ ہوتا تھا۔ عین اسی زمانے میں گلگت میں نیپال کے حکمران خاندان بروشا کے ایک قابل سپوت گشپور نجم مرحوم جو آزادی کے ابتدائی چند سالوں کے دوران جیلر کے عہدے پر فائز تھے، ملازمت سے فراغت کے بعد گارجین جیسے مشہور زمانہ انگریزی اخبار کے لیے لکھا کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ بہت معیاری اور رفتہ و شستہ انگریزی لکھا کرتے تھے۔ آپ کی تند و تیز اور مزاحمتی تحریروں نے اس وقت کی انتظامیہ کے ناک میں دم کئے رکھا۔ نجم صاحب کی وفات کے بعد گلگت میں صحافتی حوالے سے طویل

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عرصہ تک سکوت رہا۔ 1950ء کی دہائی کے بعد ایف ایم خان مرحوم اپنی بے پناہ کاروباری مصروفیات سے وقت نکال کر سیاسی وسماجی موضوعات پر انگریزی اور اردو پرچوں کے لیے لکھا کرتے تھے۔ آپ کا تعلق بار گوگلگت سے تھا۔ ایک زمانے میں آپ لاہور چیمبر آف کامرس کے نائب صدر بھی رہے۔"

"1970ء کے بعد جناب فدا محمد شاد (پاکستان ٹائمز)، جناب شمیم بلتستانی (جنگ)، جناب بہادر علی سالک (نوائے وقت) سے منسلک ہوئے۔ یوں علاقے میں ایک زیرک اور سنجیدہ گروہ سامنے آیا۔ انہی ایام میں گلگت میں جناب محمد امین ضیاء بطور رابطہ کار (Stringer) ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹائمز کے ساتھ جڑ گئے۔ ظفر حیات پال اول اول فری لانسر کے حیثیت سے لکھتے رہے۔"

"علاقے کے سیاسی وسماجی مسائل پر موقع محل کے مطابق لکھنے والوں کا ایک گمنام حلقہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔ ان میں ریٹائرڈ و حاضر ملازم اعلیٰ سول وملٹری بیوروکریٹ حضرات اور فری لانس قلم کار بھی شامل ہیں۔ ان میں اکثر قلمی نام سے لکھتے ہیں تاکہ سرکار کی پکڑ میں نہ آ سکیں۔

1985ء کے بعد کا زمانہ علاقائی صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس عرصے میں بہت سے باصلاحیت نوجوان اس حساس پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ شیر محمد حیدری، سعادت علی مجاہد، قاسم نسیم، بہادر علی سالک، اقبال عاصی، عبدالسلام، خوشی محمد طارق، سعید حسن، محمد خورشید، دردانہ شیر متاخرین کے پیش امام ہیں۔ آج صورتحال یہ ہے کہ گلگت بلتستان کے سینکڑوں افراد پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے منسلک ہیں۔ بعض صحافی غیر ملکی نشریاتی اداروں کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ متاخرین میں سے کئی ایک ابلاغیات کی سند بھی رکھتے ہیں جو ایک اضافی خصوصیت ہے۔"

"گزشتہ چھ دہائیوں کے عرصہ میں مطبوعہ صحافت کے حوالے سے مختلف دورانئے کا موقتی وغیر موقتی مواد سامنے آیا اور معدوم ہوا۔ آج بھی یہی صورتحال ہے۔ تاہم دلچسپی کی بات

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہ ہے کہ برصغیر کے دیگر علاقوں کی طرح گلگت بلتستان میں بھی اول اول مجلّاتی صحافت سے سفر کا آغاز ہوا۔ کئی معروف ہفت روزے آج روزناموں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔"

مزیدار بات یہ ہے کہ بروشسکی، شینا، وخی، کھوار اور بلتی یہاں کی بڑی زبانیں ہیں مگر رسائل و جرائد اور روزنامے اردو اور انگریزی میں چھپتے ہیں۔ البتہ ریڈیو پاکستان گلگت اور سکردو سے اپنے چینلز پر ان زبانوں میں خبریں اور پروگرام نشر کرتا ہے۔ جبکہ پی ٹی وی بھی بلتی اور شینا میں مختصر دورانیے کی خبریں نشر کرتا ہے۔

گلگت بلتستان میں صحافت کی موجودہ صورتحال کے حوالے ریڈیو پاکستان گلگت کے شعبہ نیوز سے وابستہ شیر محمد کا کہنا تھا کہ ہوائی جہازوں کی آمدورفت میں تعطل کی بنا پر پنڈی سے چھپنے والے اخبار 48 گھنٹوں بعد پہنچتے ہیں۔ لہٰذا ان میں مقامی لوگوں کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔ انٹرنیٹ پر کوئی اخبار پڑھ لے تو علیحدہ بات ہے۔ سردیوں میں بالخصوص 20 گھنٹے دورانیہ پر محیط لوڈشیڈنگ ہوتی ہے لہٰذا اس صورت میں عام لوگوں کی انٹرنیٹ تک بھی رسائی مزید مشکل ہو جاتی ہے 90 کی دہائی سے مقامی ہفت روزہ صحافت کا عروج شروع ہوا۔ آگے چل کر کئی ہفت روزے روزناموں میں تبدیل ہو گئے۔

ظفر حیات پال کے روزنامہ "شمال" کو گلگت بلتستان کا اولین روزنامہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے تاہم اب یہ ہفت روزہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔

روزنامہ کے ٹو، اوصاف، بادشمال، بانگ سحر، بیدار، رہبر، سلام گلگت بلتستان، صدائے گلگت، محاسب، نیوز مارٹ اور ہمالیہ یہاں کے روزنامے ہیں جبکہ "وادی" انگریزی روزنامہ ہے۔

روزنامہ "کے ٹو" علاقے کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اخبار سمجھا جاتا ہے جو تقریباً 5 ہزار کے لگ بھگ چھپتا ہے۔

دوسرا بڑا روزنامہ "اوصاف" ہے۔ کچھ اخبارات ڈمی بھی چھپتے ہیں۔ شیر باز علی خاں برچہ سینئر صحافی اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ گلگت بلتستان میں صحافت کی موجودہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صورتحال جاننے کے لیے جب رابطہ کیا تو انہوں نے بہت نپے تلے انداز میں اس موضوع پر روشنی ڈالی۔ ان سے جب پوچھا کہ اس تاثر میں کہاں تک سچائی ہے کہ قومی میڈیا یہاں کے مسائل کو مناسب انداز میں کوریج نہیں دیتا۔ جزوی طور پر انہوں اس تاثر کو درست قرار دیا لیکن ان کا کہنا تھا میں خود کئی سال انگریزی اور روزنامہ ''دی مسلم'' سے وابستہ رہا ہوں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میری بھیجی ہوئی خبر شائع نہ ہوئی ہو اسی طرح یہاں کسی اخبار کا نمائندہ خود ہی درست طریقے سے اپنے فرائض انجام نہیں دیتا تو اس کا قصوروار اخبار یا حکومت کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی لکھاری معیاری تحریر قومی اخبارات کو بھیجے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ جگہ نہ پائے اور اگر گھسے پٹے موضوعات پر پھس پھسی تحریریں بھیجی جائیں تو یقیناً وہ شائع نہیں ہونگیں۔

انہوں نے بتایا کہ جب ہوائی جہازوں کی آمدورفت باقاعدہ تھی تو تمام بڑے اخبارات جیسے جنگ، نوائے وقت اور ڈان وغیرہ یہاں بڑھی تعداد میں پڑھے جاتے تھے لیکن جب پروازوں میں تعطل آیا۔

اور پنڈی اسلام آباد سے چھپنے والے اخبارات بذریعہ سڑک تین تین روز بعد پہنچنے لگے تو یہاں کے چند مقامی صحافیوں نے جو اخبارات اور میڈیا سے مختلف حیثیتوں میں وابستہ تھے انہوں نے قراقرم پبلشنگ نیٹ ورک (KPN) کے نام سے ادارہ قائم کر لیا جس کے تحت مقامی طور پر اخبار شائع ہو رہے ہیں۔ جبکہ روزنامہ اوصاف بھی یہاں سے اپنا ایڈیشن چھاپتا ہے۔

روزنامہ اوصاف کے بارے میں ایک وسیع حلقہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ دائیں بازو کا ترجمان اور مخصوص نظریات کا داعی ہے۔ مثلاً یہ تاثر ہے کہ ''اوصاف'' دہشت گردوں کے موقف اور کارروائیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور دہشت گردانہ کارروائیوں کی مذمت نہیں کرتا۔ لیکن مقامی مسائل کو مناسب کوریج دینے اور مقامی خبروں کو نمایاں طور پر شائع کرنے کی وجہ سے اس کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

ہارون الرشید، حسن نثار اور پرویز ہود بھائی کی تحریروں کو لوگ بہت پسند کرتے ہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لہٰذا مقامی اخبارات بھی ان کے کالموں کو گاہے بگاہے چھاپتے رہتے ہیں۔

وفاقی حکومت کی طرف سے 2009ء میں دیئے گئے خصوصی پیکج کے بعد گلگت بلتستان کی سیاسی وانتظامی ہیئت میں وتبدیلی آئی اس سے بھی مقامی صحافت پھلی پھولی۔

2009ء کے الیکشن کے بعد گو کہ وزیر اعلیٰ اور گورنر علامتی تھے لیکن مقامی صحافت بیوروکریسی کے تسلط سے نکلی اور قدرے آزادی کی کھڑکی کھلی۔ پہلے مقامی طور صحافت سے وابستہ کوئی چونگی محرر تھا، پانچویں پاس تھا یا کوئی ذاتی کاروبار چلا رہا تھا جبکہ اب یہاں کے لوگ نہ صرف مقامی تعلیمی اداروں سے بلکہ بیرون ملک تعلیم مکمل کر کے میڈیا میں کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کی صحافت کا مستقبل امید افزاء ہے۔ قومی سطح پر غیر مقامی لکھنے والے عمومی طور پر گلگت بلتستان کے حوالے سے پرانے بیانئے کو دہراتے رہتے ہیں جبکہ نئی نسل نے اصل مسائل پر انگلی رکھ لی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نسلی یا مذہبی تفرقہ بازی محض وقت ضیاع اور ترقی میں رکاوٹ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے مقامی سیاسی اشرافیہ کو لوگوں کے مسائل کی کوئی پرواہ نہیں۔

قراقرم پبلشنگ نیٹ ورک کے چیف ایگزیکٹو سعادت علی مجاہد نے ادارے کے وجود میں آنے کا پس منظر واضح کرتے ہوئے بتایا کہ چونکہ یہاں مقامی انڈسٹری کا تو وجود نہیں اور اخبارات سرکاری اشتہارات پر ہی بنیادی طور پر گزارہ کرتے ہیں۔ پچھلی دہائی کے اوائل میں مقامی اخبارات کی حالت کافی پتلی تھی چنانچہ ہم چند دوستوں نے مل کر اس ادارے کی بنیاد رکھی۔

میں اردو ہفت روزہ ''وادی'' راجہ حسین خاں مقپون (مرحوم) ''کے ٹو'' جبکہ سید مہدی ''نقارہ'' شائع کرتے تھے۔

سید مہدی بڑے اردو اخبارات میں بھی کام کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ وہ ملک ریاض کے ''روزنامہ جناح'' پنڈی کے بھی ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ہم تینوں نے مل کر یہ ادارہ 2003ء میں رجسٹرڈ کروایا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے۔ٹو چونکہ پی آئی ڈی کی میڈیا لسٹ میں بھی تھا اور اس کے اشتہارات کے ریٹ بھی زیادہ تھے لہٰذا اس ادارے نے بطور اردو روزنامہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے۔ٹو، گلگت بلتستان کے علاوہ اسلام آباد اور کراچی سے بھی شائع ہوتا ہے۔ یہ اخبار انٹرنیٹ پر بھی پڑھا جاسکتا۔

ہفت روزہ وادی کو قریباً ایک سال پہلے انگریزی روزنامے میں تبدیل کر دیا گیا اور اسے علاقے کا پہلا انگریزی روزنامے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ مالی اعتبار سے یہ تجربہ بہت کامیاب نہیں رہا لیکن یونیورسٹی کے طالب علموں، سرکاری اہلکاروں میں یہ بہت مقبول ہے۔

بہت جلد یہ ادارہ ''نقارہ'' کو شام کے روزنامے کے طور پر جاری کرنے والا ہے یوں یہ علاقے کا پہلا اردو ایوننگر بن جائے گا۔ کے پی این گلگت اور سکردو میں ایف ایم 99 بھی کامیابی سے چلا رہا ہے۔ پرنٹنگ کے اعتبار سے کے پی این نے بہترین مشینری لگا رکھی ہے جہاں ادارے کے اخبارات کے علاوہ بھی دیگر سات روزنامے اور ہفت روزہ چھپتے ہیں۔

مقامی صحافت چونکہ روز افزوں ترقی کی طرف گامزن ہے چنانچہ نیوز پیپرز سوسائٹی کا قیام عمل میں آچکا ہے جس کے چیف پیٹرن بھی سعادت علی مجاہد ہیں۔

سوسائٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ جو اخبار یہاں سے اشتہار لے گا وہ یہاں اپنا پرنٹنگ پریس بھی لگائے گا۔ چنانچہ اس حوالے سے بھی معاملہ حوصلہ افزاء ہے گو کہ کے پی این کے قیام سے قبل پرنٹنگ کے حوالے سے بھی مسائل تھے۔

گلگت بلتستان میں صحافت کے مستقبل کے حوالے سے سعادت علی ثاقب کا کہنا تھا کہ چائنا پاکستان اکنامک کوریڈور (CPEC) کی تعمیر سے نئے امکانات کا دروازہ کھلے گا چنانچہ میڈیا کا مستقبل بھی امید افزاء ہے۔ روزنامہ اوصاف نے گلگت بلتستان سے یکم نومبر 2010ء کو اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ اخبار کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ایمان شاہ صاحب سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے اخبار کا دائیں بازو کی طرف جھکاؤ کیوں خیال کیا جاتا ہے تو انہوں نے بتایا کہ یہاں عمومی طور پر شعیہ، سنی اور اسماعیلی مکاتب فکر کے پیروکار آباد ہیں۔ اوصاف

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے پہلے ایک خاص مکتبہ فکر کو مقامی اخبارات پر حاوی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اوصاف نے تمام مکاتب فکر کے موقف کو جگہ دینی شروع کی تو کچھ لوگوں کے نزدیک انہیں اخبار کا جھکاؤ دائیں بازو کی طرف محسوس ہوا حالانکہ اپنی طرف سے اخبار کی پالیسی متوازن ہے۔ اور وہ بلاتفریق تمام طبقات کو نمائندگی دینے کی کوشش کرتا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ 2009ء سے 2014ء تک یہاں سیاسی حکومت رہی ہے جس کی بنا پر مقامی میڈیا نے کافی ترقی کی ہے۔ حالانکہ گلگت بلتستان کو صوبائی سٹیٹس دیا گیا نہ کہ صوبہ بنایا گیا۔

آزاد کشمیر میں پنڈی سے چھپنے والے تمام اخبار پڑھے جاتے ہیں کیونکہ پنڈی، اسلام آباد سے آزاد کشمیر تک ترسیل کا کوئی مسئلہ نہیں جبکہ مقامی طور پر 7 سے زائد اخبار شائع ہوتے ہیں جن میں ''محاسب'' اور ''سیاست'' نمایاں ہیں۔

وادیٔ چترال میں مشکل رسائی کی بنا پر قومی اخبار اشاعت کے اگلے روز ملتے ہیں جبکہ مقامی طور پر ''چترال ٹائمز'' بہت مقبول ہے۔ یہ اخبار انٹرنیٹ پر بہت پڑھا جاتا ہے۔

○

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کتابیات

پہلا پڑاؤ (نوائے وقت)

1- قومی ڈائجسٹ۔ جولائی 2008، ایڈیٹر: مجیب الرحمان شامی، 41 جیل روڈ لاہور، ص 37

2- رازداں صحافی، مظفر محمد علی، رائٹ وژن P-184 جوہر ٹاؤن لاہور، ص 498

3- (i) حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، عبداللہ پبلیکیشنز، لاہور، ص 85

(ii) پاکستان کی سیاسی تاریخ (جلد ۵)، مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقائ، زاہد چوہدری، ادارہ مطالعہ تاریخ، میاں چیمبرز-3 ٹمپل روڈ لاہور، ص 370

4- محاصرے کا روزنامچہ، وجاہت مسعود، سانجھ پبلشرز، صفانوالہ چوک، مزنگ، لاہور، ص 199

5- انٹرویو: ڈاکٹر مہدی حسن، اکمل شہزاد گھمن

6- حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، عبداللہ پبلیکیشنز لاہور، دارالتذکیر رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور، ص 85-86

7- پاکستان کی سیاسی تاریخ (جلد 5)، زاہد چوہدری، ادارہ مطالعہ تاریخ میاں چیمبرز

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-3 ٹمپل روڈ لاہور، ص373,372،
مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء
8- حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، عبداللہ پبلیکشنز لاہور، دارالتذکیر رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ ا، اردو بازار، لاہور، ص88,87
9- (i) حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، ص39-41، عبداللہ پبلیکشنز لاہور
(ii) پاکستان کی سیاسی تاریخ (جلد ۵)، زاہد چوہدری، ص370، ادارہ مطالعہ تاریخ: میاں چیمبرز -3 ٹمپل روڈ لاہور
مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء
10- حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، عبداللہ پبلیکشنز لاہور ص73،
11- پاکستان کی سیاسی تاریخ (جلد ۵)، زاہد چوہدری، ادارہ مطالعہ تاریخ: میاں چیمبرز -3 ٹمپل روڈ لاہور، ص371-369
مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقائ
12- قومی ڈائجسٹ، نومبر 2009، انٹرویو عارف نظامی، ایڈیٹر: مجیب الرحمان شامی، ص17، مجیب الرحمان شامی۔41 جیل روڈ لاہور
13- حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، عبداللہ پبلیکشنز لاہور، ص79
14- حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، عبداللہ پبلیکشنز لاہور، ص267
15- مہینہ وار "پنجابی" 2006، ایڈیٹر: محمد جنید اکرم، بزم فقیر 125/3-B-2 ٹاؤن شپ لاہور، ص7
16- حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، عبداللہ پبلیکشنز، لاہور، ص228-307
17- حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، عبداللہ پبلیکشنز لاہور، ص193-190-191
18- پنجابی انٹرنیشنل، ایڈیٹر: محمد جنید اکرم، بزم فقیر 125/3-B-2، ٹاؤن شپ لاہور، ص6
19- پنجابی انٹرنیشنل، ایڈیٹر: محمد جنید اکرم، بزم فقیر 125/3-B-2، ٹاؤن شپ لاہور، ص7
20- سنڈے میگزین، 25 دسمبر 2011 نوائے وقت، ایڈیٹر: مجید نظامی، -23 شارع فاطمہ جناح لاہور، ص3

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

21- قومی ڈائجسٹ، نومبر 2009، ایڈیٹر: مجیب الرحمان شامی، 41 جیل روڈ لاہور، ص20,17,16

22- رازداں صحافی، مظفر محمد علی، رائٹ وژن P-184۔ جوہر ٹاؤن لاہور، ص131

نوٹ: مہینہ وار ''پنجابی'' پچاس کی دہائی میں بھی چھپنا شروع ہوا۔ اس کے جریدے کے ایڈیٹر بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر تھے۔ یہ معروف ادیب، شاعر جنید اکرم اور نامور ایکٹر سہیل احمد (عزیزی) کے نانا تھے۔ حمید نظامی کے تین پنجابی مضمون بالترتیب نومبر 1951 جنوری 1952 اور اگست 1952 کو مہینہ وار ''پنجابی'' میں چھپے۔

پاکستان میں پاکستان

1- اکابرِ صحافت، شاہد ندیم احمد، پبلشر شخصیت نامہ، 29 فرسٹ فلور، القرطبہ کمپلیکس، 8 جیل روڈ لاہور، ص54

2- انٹرویو ڈاکٹر مہدی حسن از اکمل شہزاد گھمن

3- رازداں صحافی، مظفر محمد علی، پبلشر رائٹ وژن، P-184۔ جوہر ٹاؤن لاہور، ص152-151

4- میڈیا منڈی (الیکٹرونک میڈیا) حصہ دوم (انٹرویو حامد میر)

5- روزنامہ پاکستان اسلام آباد پیٹریاٹ بلڈنگ، G-8/4، بالمقابل پوسٹل کالونی، اسلام آباد

6- انٹرویو چوہدری نذیر، صدر اخبار فروش یونین، لاہور

7- ٹائیکون انٹرنیشنل، ایڈیٹر صابر شاہ، دی ٹائیکون انٹرنیشنل، لاہور۔ جولائی 2004

نوٹ: سردار خان نیازی صاحب نے متعلقہ دستاویز کو گیلپ سروے رپورٹ قرار دیا، مگر یہ حوالہ درست نہیں۔ یہ رپورٹ ٹائیکون انٹرنیشنل کے ایڈیٹر صابر شاہ نے مرتب کی۔

ایکسپریس کی بات

1- (i) Lakson.com.pk.

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(ii) The Tycoon International (July, 2004)، ایڈیٹر صابر شاہ

2- قومی ڈائجسٹ۔ نومبر 2009، انٹرویو: عارف نظامی، ص 26، قومی ڈائجسٹ، 41 جیل روڈ لاہور

3- قومی ڈائجسٹ۔ جولائی 2008، انٹرویو: عباس اطہر، ص 17 تا 44، قومی ڈائجسٹ، 41 جیل روڈ لاہور

4- (i) روزنامہ ایکسپریس، 28 مارچ 2011

(ii) روزنامہ ایکسپریس، 23 مارچ 2011

(iii) روزنامہ ایکسپریس، 16 مارچ 2011

(iv) روزنامہ ایکسپریس، 19 اپریل 2011

کالم نگار اور کالم نگاری

1- انٹرویو: ڈاکٹر مہدی حسن، از اکمل شہزاد

2- خونِ جگر ہونے تک، احمد بشیر، آواز اشاعت گھر، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور، ص 185

3- (i) ماہنامہ ارژنگ، نومبر 2010، انٹرویو، ص 12,8، ماہنامہ ارژنگ لاہور

(ii) گفتگو، عامر بن علی، ابرار ندیم، ص 227، 228، 235 نستعلیق مطبوعات F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

4- روزنامہ جنگ 11.10.2012، عطاالحق قاسمی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

5- ماہنامہ ارژنگ، نومبر 2010، انٹرویو، ص 16، ماہنامہ ارژنگ لاہور گلی نمبر 102 غازی پارک نیو شاد باغ لاہور

6- نوائے وقت 8 اگست 1983، عطاالحق قاسمی، روزنامہ نوائے وقت لاہور

7- نوائے وقت 14 جنوری 1980، عطاالحق قاسمی، ادبی صفحہ، روزنامہ نوائے وقت لاہور

8- جنگ 4 مارچ 2011، عطاالحق قاسمی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-9 جنگ 11 اگست 2011، عطاالحق قاسمی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-10 جنگ 27 اکتوبر 2011، عطاالحق قاسمی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-11 جنگ 26 نومبر 2011، عطاالحق قاسمی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-12 جنگ 18 نومبر 2011، عطاالحق قاسمی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-13 جنگ 5 اپریل 2012، عطاالحق قاسمی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-14 تاریخ کیا سکھاتی ہے، ول ڈیورانٹ، ص 12، تخلیقات۔6 بیگم روڈ لاہور

-15 جنگ 24 اگست 2011، عرفان صدیقی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-16 جنگ 26,27 اگست 2012، عرفان صدیقی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-17 جنگ 8 فروری 2012، عرفان صدیقی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-18 ایکسپریس 24,21 دسمبر 2011، اوریا مقبول جان، ادارتی صفحہ، روزنامہ ایکسپریس لاہور

-19 ایکسپریس 7 جنوری، اوریا مقبول جان، ادارتی صفحہ، روزنامہ ایکسپریس لاہور

-20 ایکسپریس 21 دسمبر 2011، اوریا مقبول جان، ادارتی صفحہ، روزنامہ ایکسپریس لاہور

-21 گئے دنوں کے سورج، جاوید چوہدری، ص 27,28، علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، 40 اردو بازار لاہور

-22 ایکسپریس، اکتوبر، نومبر 2012، جاوید چوہدری، ادارتی صفحہ، روزنامہ ایکسپریس لاہور

-23 (i) ایکسپریس 7 اگست 2011، جاوید چوہدری، ادارتی صفحات، روزنامہ ایکسپریس لاہور

(ii) 19.06.2012

-24 (i) جنگ 18 اپریل 2011، عطاالحق قاسمی، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

(ii) ایکسپریس 21 جون 2011، جاوید چوہدری

-25 خونِ جگر ہونے تک، احمد بشیر، ص 193-195، آواز اشاعت گھر، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

-26 جنگ 15,14 فروری 2011، پرویز رشید، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-27 جنگ 17,16 جولائی 2011، سینٹر مشاہداللہ، ادارتی صفحہ، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-28 جنگ 17 جولائی 2011، ہارون الرشید، ادارتی صفحات، روزنامہ جنگ ڈیوس روڈ لاہور

-29 (i) کالم نگاروں کی قلابازیاں، ڈاکٹر محمد فاروق، ص 125 تا 130، آگہی پبلشرز 31 چیمبر لین روڈ چوک گوالمنڈی لاہور

(ii) جنگ۔ یکم مارچ 2013، الطاف حسن قریشی، روزنامہ جنگ، ڈیوس روڈ لاہور

-30 زندہ انسان کا المیہ، حسن نثار، ص 15، تخلیقات۔ صفانوالہ چوک لاہور

اردو اور انگریزی صحافت کے امتیازی پہلو

-1 محاصرے کا روزنامچہ، وجاہت مسعود، ص 38، سانجھ پبلیکیشنز، صفانوالہ چوک ٹیمپل روڈ، لاہور۔

-2 رازداں صحافی، مظفر محمد علی، ص 131,130، رائٹ وژن 184P۔ جوہر ٹاؤن لاہور

-3 رازداں صحافی، مظفر محمد علی، ص 358، رائٹ وژن 184P۔ جوہر ٹاؤن لاہور

-4 قومی ڈائجسٹ نومبر 2009، انٹرویو: عارف نظامی، ص 26، قومی ڈائجسٹ 41۔ جیل روڈ لاہور۔

-5 رازداں صحافی، مظفر محمد علی، ص 173، رائٹ وژن 184P۔ جوہر ٹاؤن لاہور.

-6 قائداعظم: میری نظر میں، باب: طلوع ہونے دو، مرزا ابوالحسن اصفہانی، ص 4 تا 114، جمیل الدین احمد 135۔ ڈی بلاک نمبر 2، پی ای سی ایچ ایس کراچی 1965ء

(نوٹ-I) ڈان کے حوالے سے ڈاکٹر مہدی حسن کی گفتگو 'www.dawngroup.com' اور wikipedia سے استفادہ کیا گیا۔

(نوٹ-II) جنگ گروپ اور دی نیوز کی ویب سائٹ کے علاوہ حسین نقی صاحب اور مختلف اوقات میں دی نیوز سے وابستہ صحافیوں سے استفادہ کیا گیا۔

قصہ پاکستان ٹائمز کا

تحریر ہذا کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب اور ذرائع سے مدد لی گئی۔

-1 www.khalidhasan.net

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-2 پرانی محفلیں یاد آ رہی ہیں۔عبداللہ ملک

-3 شاہد سعید، فرائیڈے ٹائمز 18 تا 24 فروری 2011

-4 انٹرویو فیض احمد فیض، فرائیڈے ٹائمز 5 تا 11۔اکتوبر 2012

(دراصل یہ انٹرویو اپنے عہد کے بڑے دانشور اور لکھاریوں، حمید اختر، صوفی تبسم، اعجاز تبسم، اعجاز بٹالوی، قیوم نظر اور سجاد باقر رضوی نے مشترکہ طور پر ریڈیو پاکستان کے لئے 1974ء میں ریکارڈ کروایا۔ جسے بعد ازاں فرائیڈے ٹائمز نے 21 ستمبر 2012ء سے قسط وار شائع کیا)

-5 شہاب نامہ، قدرت اللہ شہاب، ص 799 تا 836، سنگِ میل پبلی کیشنز۔

-6 دولتانہ داستان، وکیل انجم، ص 116، جنگ پبلشرز

-7 اصولِ صحافت، بی اے، یونٹ 1-18، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ص 89

-8 انٹرویو/گفتگو۔ڈاکٹر مہدی حسن از اکمل شہزاد گھمن

-9 روزنامہ ڈان۔8 دسمبر 2012

-10 قومی ڈائجسٹ مئی 2008ئ، ص 22، انٹرویو آئی آر رحمان، ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، 41 جیل روڈ لاہور۔

نوٹ: پاکستان ٹائمز کی نیلامی اور بعد از نیلامی کے حوالے سے معلومات کے ذرائع کو بوجوہ ظاہر نہیں کیا جا رہا۔

جنگ نامہ

-1 قومی ڈائجسٹ نومبر 2009ئ، انٹرویو عارف نظامی، ص 26، قومی ڈائجسٹ 41۔جیل روڈ لاہور۔

-2 قومی ڈائجسٹ نومبر 2009ئ، انٹرویو عارف نظامی، ص 26، قومی ڈائجسٹ 41۔جیل روڈ لاہور۔

-3 حمید نظامی بحیثیت صحافی، ڈاکٹر فوزیہ اسحاق، ص 144، عبداللہ پبلیکیشنز۔ اردو بازار لاہور۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

4- لیجنڈ آف جرنلزم، خالد یزدانی، ص 33، خالد بک ڈپو، 1 صنم آرکیڈ، اردو بازار، لاہور۔
(نوٹ I-(wikipedia، www.jung.com)، اور محمد اسلم لودھی کی کتاب ''قومی ہیروز'' سے بھی استفادہ کیا گیا۔
(نوٹ-II) جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن کا انٹرویو لینے کی غرض سے جنگ کے کراچی آفس میں ان کے کوارڈینیٹر سے متعدد بار رابطہ کیا گیا لیکن مثبت جواب نہ ملا۔

پاکستانی زبانیں، صوبے اور پرنٹ میڈیا

تحریر ہذا کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب اور ذرائع سے مدد لی گئی۔

1- سندھی پرنٹ میڈیا پر تجزیاتی تحریر کے لئے انڈیجویل لینڈ (Individual Land) کے مرتب کردہ کتابچے (Sindhi Print Media Analysis from a Consumer's Perspective) سے استفادہ کیا اور بعض اقتباسات کو بھی شاملِ تحریر کیا گیا۔ اس کتابچے کو مدد علی سندھی جیسے سینئر صحافیوں نے ترتیب دیا۔

2- پشتون، سرائیکی پریس اور بلوچستان میں صحافت کے تجزیے کے لیے ''انڈیجوئل لینڈ کے مرتب کردہ کتابچے ''علاقائی صحافت: صارف کا نقطۂ نظر'' سے مدد لی گئی۔ مزید برآں بلوچستان میں صحافت کے حوالے سے جناب عابد میر اور تنویر ملک نے بھی خاطر خواہ معلومات فراہم کیں۔

3- انڈیجوئل لینڈ کا اشاعتی مواد ادارے کی ویب سائٹ www.individualland.com پر مطالعے کے لیے دستیاب ہے۔

4- گلگت بلتستان میں صحافت کے حوالے سے ''بابائے صحافت'' شیر باز علی خاں برچہ کی کتاب ''عکسِ گلگت بلتستان'' سے استفادہ کیا گیا۔ جبکہ ان کے علاوہ جناب شیر محمد، جناب سعادت علی مجاہد (چیف ایگزیکٹو کے پی این، نمائندہ جنگ جیو، گلگت) اور ایمان شاہ صاحب (ریذیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ اوصاف، گلگت) سے گفتگو بھی بہت مفید رہی۔

○○○

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

urdukutabkhanapk.blogspot.com